محبوبِ علم وادب

حبیب جونپوری

(فن وشخصیت)



ترتیب وتدوین:

ڈاکٹر اختر ہاشمی

محبوبِ علم و ادب

حبیبؔ جونپوری

(فن و شخصیت)

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر اختر ہاشمی

ظفر اکیڈمی

نگرانِ اشاعت

شیرازی شاعر

0345-2610434

کتاب : محبوب علم وادب حبیبؔ جونپوری (فن وشخصیت)

ترتیب وتدوین: ڈاکٹر اختر ہاشمی

اشاعت : جولائی/2013ء

کمپوزنگ : ظفر اکیڈمی، کراچی

ناشر : ظفر اکیڈمی، کراچی

ای میل : rangeadab@Yahoo.com

تعداد : 500

صفحات : 560

قیمت : -/800روپے

انتسابِ اوّل

میر دُرویش علی

میر حسین بخش

مولوی سید مردان علی

مولوی سید مہدی علی

مولوی سید انتظام علی

مولوی سید محمود علی

مولوی سید شبیر حسن (صفاالہ آبادی)

سید وحید الحسن ہاشمی

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (شہیدؒ)

صدیقہ بی بی

مشہدی بانو

مشتاق فاطمہ

کنیز معصومہ

شمیم فاطمہ

کنیز فاطمہ

انتسابِ دوم

پروفیسر ذوالفقار حسنین ہاشمی

مولانا ڈاکٹر سید محمد باقر زیدیٔ

سید معصوم الحسن ہاشمی

سید منصور حیدر ہاشمی

ثمانہ ہاشمی (ہما)

سید فضلِ حسن عرفی ہاشمی

سید قمر حسنین نقوی

رخسانہ بانو

سید اوصاف حیدر ہاشمی

سید الطاف حیدر ہاشمی

سید عرفان حیدر ہاشمی

سیدہ نور العین ہاشمی

فہرست

سوانح (سیرت و کردار)

قطعہ

مقالات

☆☆☆☆☆

مولانا محبوب الحسن صاحب اور میں

سید حمید حسین جون پوری

میں ۱۹۳۵ء میں بہ غرض تعلیمِ دینی سلطان المدارس لکھنؤ بھیج دیا گیا، میرا قیام دارالاقامہ میں تھا جہاں طلباء مختلف گروپ میں رہا کرتے تھے۔ چناں چہ ایک گروپ جون پور کا بھی تھا جس کی قیادت مولانا محبوب الحسن صاحب مرحوم کرتے تھے میں اگرچہ سب سے چھوٹا ممبر تھا لیکن ہمارا ساتھ بڑوں سے بھی تھا۔ ۱۹۳۹ء میں مدرسہ میں اسٹرائک ہوئی اور اس کی قیادت بھی مولانا محبوب صاحب کرتے تھے ان کے ہم نوا مولانا محبّ الحسن صاحب مرحوم (ننّھے میاں) ان کا تعلق بھی جون پور سے تھا۔ بہترین عربی کے مقرر بھی تھے۔ میرے ماموں مولانا سید صغیر الحسن صاحب مرحوم کی معیت میں میرا قیام جو علاوہ مدرس کے ناظمِ دارالاقامہ ہونے کی وجہ سے تمام حالات سے ہر وقت واقف تھے لہٰذا چھوٹا ممبر ہونے کی وجہ سے اور اپنے ماموں سے قربت کی وجہ میرا انتخاب مولانا محبوب الحسن صاحب نے بہ حیثیت مخبر کر دیا اس وجہ سے مجھے قبلہ موصوف سے قربت حاصل ہوئی اور خفیہ طریقہ سے میرا میل ملاپ بڑھا۔

میں اس قربت کی وجہ سے مولانا سے زیادہ ملتا جلتا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ قبلہ واقعی ایک کھلے ہوئے ذہن کے مالک تھے اور اپنے اصول کے پابند تھے وہ ایک خوش گلو شاعر اور نہایت سلجھے دماغ کے عالم باعمل تھے بہر حال اب وہ ہم میں نہیں لیکن ان کی یاد دلوں میں ہمیشہ باقی رہے گی۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبوب علم و ادب حبیبؔ جونپوری

علامہ سید کمال حیدر رضوی

(یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ابجد کی ترتیب کے لحاظ سے ہے)

ابجد

مفادات سے ماورا، لبوں میں شفا، (الف)

روحانی طبیب، محبوب الحسن حبیبؔ، (ب)

حوصلوں پہ ولائے علیؑ کا راج، کہنگی سے پاک مزاج (ج)

میر مرداںؔ کے خصائل سے بہرہ مند، شبیر حسین صفاؔ الہٰ آبادی کے فرزند، (د)

ہوز

علم آل محمدؐ (علیہم السلام) سے مملو کشادہ سینہ، اوراد وظائف کا خزینہ، (ہ)

قلب باریاب آرزوؔ، ذہن کو فیض رسانی کی جستجو، (و)

سند اجتہاد سے سرفراز، مولد ہند کا شیراز، علماء میں شامل مگر اظہار سے بے نیاز، فریضہ منصبی امامت نماز، (ز)

حطی

خیالات آمادہ صلاح، ہمراہ دعاؤں کا سلاح، (ح)

اودھ کی اداؤں سی احتیاط، لاہور کی فضاؤں سا ارتباط، (ط)

غزل کی جوانی، قصیدے کی روانی، منقبت کی جولانی، جگر میں نوحہ خوانی، آنکھوں میں مرثیہ خوانی، (ی)

کلمن

نگاہوں سے جھلکتا ہوا ادراک، سرشت کینے سے پاک۔ (ک)

خالص عقیدے سے بنا ہوا دل، انسانیت کی قدر افزائی پہ مائل (ل)

رخ پہ حکمت کا تبسم، لہجے میں مدح علیؑ کا ترنم، (م)

بر میں دولت یقیں، تہذیب ہاشمیہ کا آئیں، (ن)

سعفص

خلق خدا کے درد سے گندھا ہوا احساس، بجز تقویٰ نہ خوف نہ ہراس (س)

بصیرت کا مرقع، صانع تخلیق کی بیت مرصع، (ع)

دیانتوں کے حلیف، خیانتوں کے حریف، (ف)

ملنساری میں خلوص، تابع نصوص، (ص)

قرشت

جسے پڑھادیا سبق، سہل ہوگیا اس پہ سب ادق،(ق)

فقہ واصول پہ دسترس مگر مولویت سے دور، نہ عبا وقبا کی آن بان نہ جبہ ودستار کا غرور، ضعیفی میں بھی۔

قدم استقامت سے ہمکنار، شانوں پہ ملت کے مسائل کا بوجھ مگر کمر عزم تازہ سے استوار،(ر)

درویش کی ردا بر دوش، حب دنیا کی اتارے ہوئے پاپوش،(ش)

دست بہ شفقت، کلام میں محبت،(ت)

ثخذ

شعر وسخن خاندانی میراث، مدح علیؑ زاد عاقبت اور زیست کا اثاث،(ث)

انکساری کے کاخ، جیسے جھکی ہوئی بار آور شاخ،(خ)

طرز حیات سیرت اہلبیتؑ سے ماخوذ، نسلوں پہ کردار کا نفوذ،(ذ)

ضظغ

کلیات ذات میں جوہر نہ کہ عرض، ولی خدا کے غیر سے غایت نہ غرض،(ض)

روش روش میں نزاکتوں کا لحاظ، لطیف گفتگو شائستہ الفاظ،(ظ)

ادب کی قدامتوں اور جدتوں کے ریشوں سے بُنا ہوا دماغ، طبیعت جیسے کھلا ہوا باغ،(غ)

جی ہاں یہ ذکر ہے آیۃ اللہ محبوب الحسن زیدی الہاشمی اعلیٰ اللہ مقامہ المتخلص حبیبؔ جونپوری کا۔

جن کی کہی ہوئی باتیں تو میری اس وقت کی کمسنی کے سبب حافظے سے محو ہیں مگر لہجے کی شیرینی سماعت میں ۲۵،۳۰ برس بعد بھی رس گھولتی ہوئی،اور سراپا آنکھوں میں جھلملاتا ہوا۔

حسینیہ سجادیہ سے میرے بچپن کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں جنکے بیان کا یہ محل نہیں۔مگر سب سے قوی یاد جناب محبوب الحسن حبیبؔ کی ہے۔

میرے تخیلات کی روش اور محبوب الحسن حبیبؔ کی چہل قدمی:

آج ان کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو ایسا محسوس ہورہا کہ ابھی منبر پہ کھڑے ہوکر عید کا خطبہ دے رہے ہیں اور میں پہلی صف میں بیٹھا سن رہاہوں۔جی ہاں پہلی نماز جوانکے پیچھے پڑھی وہ عید کی تھی،پانچ سال کے بچے کو عیدی تو شاید یاد رہ جائے مگر نماز یادنہیں رہتی مجھے وہ پہلی نماز عید یاد ہے، مسجد کے نقش یاد ہیں،منبر یاد ہے،ماحول کی خوشگواریت یاد ہے،اس سے پہلے بھی پڑھی تھی مگر یاد اس لئے نہیں کہ پڑھانے والے کی شخصیت کا تاثر اتنا گہرا ہوتا توانسٹ ہوتا۔

ساڑھے چار سال کی عمر میں،میں قرآن پڑھ کے ختم کرچکا تھااور یہ کارنامہ میرے جد بزرگوار حجۃ الاسلام سید وزارت حسین رضوی اعلیٰ اللہ مقامہ (فارغ التحصیل سلطان المدارس،لکھنؤ) کا تھا، جنھوں نے ۶ ماہ کی مختصر مدت میں مجھے آموختہ سمیت قرآن پڑھا کرمکمل کردیا تھا، اور روزانہ میری تلاوت کی نگرانی بھی کیا کرتے تھے،میری ابتدائی تربیت میرے دادا ہی کی محنت کا ثمر ہے،اس لئے پانچ سال کے اس بچے کے ذہن کا سادہ ورق خالص مذہبی ریشوں سے بنا تھا، اور اس سادے ورق پر زندگی میں

سب سے پہلے جس شیعہ عالم کی تصویر نقش ہوئی وہ آیۃ اللہ محبوب الحسن ہاشمی نوّر اللہ مرقدہ تھے۔اس کے بعد تو بڑے بڑے جید علماء اعلام کی صحبتیں ملیں مگر وہ نقش اولیں۔

جب جوانی میں بڑھیں محرومیاں

میرا بچپن مجھ کو یاد آیا بہت

حبیبؔ جونپوری

صاحب ''مطلع الانوار'' اور صاحب ''خورشید خاور'' سے گلہ ہے کہ انہوں نے اپنے تذکرہ ہائے علمائے برصغیر میں ایسے عالم کا بھی ذکر کیا جو حدود تشیع میں نووارد تھے اور ایسے کا بھی ذکر کیا جو حدود تشیع سے نکل گئے تو پلٹے بھی نہیں۔مگر نہ کیا تو اس خاندان کے علماء کا جو پشتینی وراثت علم لئے آگے بڑھتے رہے،اور جن کا حق تھا کہ ان کا ذکر کیا جاتا۔

مرے دادا مرحوم نے مجھے مدح اہلبیتؑ کی تربیت یوں دی کہ منقبت، سلام، اور قصائد (جس کی اس وقت محفلوں میں خوب پذیرائی تھی جواب معیار سماعت کے گرنے سے مفقود ہے) کے اشعار مجھے لکھ کر دیئے،اور اپنے ساتھ مجالس و محافل میں لے جا کر پڑھوائے،جس پر بزرگوں کی داد و تحسین نے بچپن سے ہی حوصلوں میں بے باک کردیا اور دادا مرحوم کی ہمراہی کا فائدہ یہ پہنچا کہ کمسنی میں ہمسنوں کے بجائے اہل علم و ادب میں بیٹھنے کے مواقع میسر آئے۔بچپن میں محفلوں اور مجلسوں میں آگے بیٹھ کر قریب سے شعراء اور ذاکرین کو سننے کا حظ کبھی نہیں جاتا۔بہت کچھ سنا۔منظر یاد ہیں۔سب شعر اور جلسے یاد نہیں مگر ایسے میں پہلی آواز جس سے پہلے کوئی آواز نہیں،جو کبھی محو نہیں ہوسکتی۔وہ محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری کی تھی۔

لہو سے سارے زمانے کو لالہ زار کریں

حسینؑ آئیں تو اسلام استوار کریں

تھپیڑے کھائے گی کشتی تو کون روکے گا
نبیؐ سے کہدو نواسے کا انتظار کریں

حبیبؔ جونپوری

فیضِ حبیبؔ:

علم اور ادب۔ یہ دو ایسی دنیائیں ہیں جنکی حقیقت سے اگر عوام واقف نہ بھی ہوں تب بھی انکے ماحول سے ناواقف نہیں ہوتے مگر روحانیت (بزبان عوام عملیات) ایک ایسی دنیا ہے جسکی حقیقت سے بھی عوام بے خبر ہیں اور اس کے ماحول کا بھی درک نہیں رکھتے، بس صرف فیض اٹھاتے ہیں، عوام کی روحانیت شناسی صرف جنتری کے مطالعے تک محدود ہے، اور اسی جنتری پر اپنی قوت استنباط صرف کر لینے ہی کو روحانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ علم الاعداد، علم جفر، علم رمل اور علم نجوم کے ملغوبہ علم۔ علم الجنتری کے تولّد کی صورت میں نکلتا ہے۔

ایک وقت تھا جب لوگ تحفۃ العوام کی بنیاد پر زندگی گزارتے تھے۔ اب روحانیت اور شریعت دونوں جنتری تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

روحانیت ریاضت کی طرف متوجہ ضرور کرتی ہے مگر ریاضت کے پیروں پر استادہ نہیں ہوتی، بلکہ توفیق الٰہی اور تائید اہلبیتؑ کے سبب اپنی روح کو روح مطلقہ کے حوالے کردینے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ روح جتنا علیین کی طرف صعود کرے گی اتنا ہی قوت یافتہ ہوگی اور مادہ (یعنی اجسام) میں تصرف کی صلاحیت حاصل کرلے گی۔ ایسے ہی ایک صاحب تصرف کا نام محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری ہے۔

گویا روحانیت۔ محبت اور ولایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔

روحانیت کی یہ تعریف آپ کو خود انکے مکتوبات اور خطوط میں بھی نظر آئے گی وہ لکھتے ہیں "محبت" کے بارے میں کہ "یہ جذبہ سرچشمہ روحانیت ہے۔جس کی ہر ساعت عبادت اور ہر لمحہ ریاضت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔" عجیب بات یہ ہے کہ میں مضمون مکمل کر چکا تھا جب انکے مکتوب میری نظر سے گزرے۔اور یہ فقرے میں نے بعد میں بڑھائے مگر میں حیران ہوں کہ جو بات میں اوپر لکھ چکا وہ بعینہ انکے خط میں درج تھی۔

عوام کے بڑھتے ہوئے لاتعداد مسائل اور علم اہلبیتؑ میں موجودان مسائل کے حل سے ناواقفیت انہیں بلا تصدیق مذہب ہر ایسے آستانے کی طرف متوجہ کردیتی ہے جہاں بھیڑ لگی ہو، چاہے وہ ٹی وی چینلز پہ مذہبیت اور عملیات کی نمائش ہی کیوں نہ ہو،اور ایسے میں امام معصومؑ کی اس فرمان کو بھلا دیا جاتا ہے کہ

"لا خیر فی غیرنا"

ہمارے غیر میں کوئی خیر نہیں ہے۔

میرے مشرب میں محبت کی نمائش ہے حرام

بزم اغیار سے شکوہ ہے تو جاتے کیوں ہو

....

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں چلو رہنے دو جاؤ بھی

کوئی مشکل نہ تھا غیروں کو پہلو سے اٹھا دینا

حبیبؔ جونپوری

اس قول کی بنیاد پر نتیجہ صاف ہے کہ روحانیت کی حقیقت فقط صحت عقیدہ پر منحصر ہے۔مضبوط عقیدہ ہی مضبوط روحانی تصرف کاواحدوسیلہ ہے۔

تصرفِ حبیبؔ:

جی ہاں محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری کا روحانی تصرف انکے شاہ ولایتؒ پر مضبوط عقیدے کی بھی دلیل ہے۔

مشکل کی ہر اک شکل پہ ہے میرا تصرف
مجھ کو یہ سند شاہ ولایت سے ملی ہے

حبیبؔ جونپوری

یہاں شکل کی رعایت کسقدر معنی خیز ہے یہ ایک ایسا شخص ہی سمجھ سکتا ہے جو شاعری کی نزاکتوں کے ساتھ عملیات کی ریاضتوں سے بھی واقف ہو۔

فقہ و اصول اور روحانیت خشک علوم گردانے گئے ہیں اور شاعری تر علوم میں شمار ہوتی ہے نقشہ خشکی پہ بنتا ہے اور موج ترائی میں ہوتی ہے۔

وہ نقشہ ہوں مٹونگا میں نہ دنیا کے مٹانے سے
وہ قطرہ ہوں فنا ہو کر بنوں گا موج دریا کی

حبیبؔ جونپوری

یہاں بھی حبیبؔ جونپوری منفرد نظر آتے ہیں۔

استنباطِ حبیبؔ:

خشک اور تر علوم کے میل پہ حیرت کیا کہ علم تفسیر وحدیث ایک مستقل وقت طلب علوم ہیں اور روحانیت کے ذریعے خلق خدا کو فیض پہنچانا ایک الگ فرصت طلب کام۔اور دونوں دماغ تفصیل کے متقاضی ہیں۔

کہ گزشتہ صدی کے سب سے بڑے نوحہ نگار علامہ نجم آفندی کو کہنا پڑا۔

شاعر ہوں مجھے دماغ تفصیل کہاں

درد دل کہہ نہیں سکتا تو غزل کہتا ہوں

غزل کو تفسیر و حدیث و فقہ واصول و روحانیت کی ثقالت کا تحمل نہیں اور ان علوم کو شاعری کا یارا نہیں۔ مگر کمال ہے حبیبؔ جونپوری کا جنھیں نہ شمشیر سخن کا زنگ گوارا تھا نہ علوم دینیہ کی روشنائی کا سوکھنا۔

تفسیر و حدیث و روحانیت کی گنجائش وسعت مرثیہ میں تو ہوتی ہے تنگنائے غزل میں نہیں۔

اور اس پہ طرہ یہ کہ سب سہل ممتنع ہے۔

ملاحظہ کیجئے۔ تفسیر

(۱)

سوال عشق پہ جن و ملک رہے خاموش

ہمیں چنے گئے یہ بار غم اٹھانے کو

ملاحظہ ہو قرآن کی آیت۔

ان عرضنا الامانۃ علیٰ السموات والارض والجبال......

اشعار میں مضامین کا متحد ہونا ہمیشہ توارد ہی کی دلیل نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی درجات فکر کے مختلف ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

میرؔ نے کہا تھا

سب پہ جس بار نے گرانی کی

اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

مگر میرؔ کے یہاں اس "بار" کی وضاحت نہیں، کہ کونسا ہے۔ اس لئے میرؔ کے شعر پہ تفسیر اور فقاہت کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ لیکن حبیبؔ جونپوری کے یہاں خالص تفسیر ہے مگر نہ شعر روکھا ہے نہ پھیکا ہے نہ سوکھا ہے۔ بلکہ بلا کی شعریت لئے ہوئے ہے۔

(۲)

وہ تو میرے دل کے اندر تھا مکیں
طور پر میں جا کے پچھتایا بہت

ملاحظہ ہو قرآن کی آیت۔

نحن اقرب الیہ من حبل الورید

حدیث

کلیم طور کی حالت بدل گئی جس سے
وہ اک نظر کی کرامت تھی انقلاب نہ تھا

....

دیکھ کر مجھ کو وہ گھبرایا بہت
ایک آنسو میرے کام آیا بہت

ملاحظہ ہو۔

وتضحکون ولا تبکون (القرآن)

ترجمہ۔ تم ہنستے ہو روتے نہیں

روحانیت

مجھے تو آپ کے ہر فیصلے پہ چلنا ہے
جو حکم دیں تو بدل دوں ابھی زمانے کو

میرے مشرب میں محبت کی نمائش ہے حرام
بزم اغیار سے شکوہ ہے تو جاتے کیوں ہو

فقہ واصول

عمل خیر ہے اللہ کے بندوں پہ گراں
فکر انساں میں سبک جرم و خطا ی یئم

جس خودی نے اقبال کو حکیم الامت بنا دیا اس خودی کی حقیقت درک کیجئے۔

سارے جہاں کو قطع محبت کی دھمکیاں
تنہا رہو گے پال کے دل میں خودی کی آگ

اور وہ ان سب مرحلوں سے اتنی سہولت سے یوں گزر گئے کہ ان کے نزدیک شاعر کی تعریف اوروں سے مختلف ہے۔

خاک کے ذروں کو تنویر نظر دیتا ہے وہ
پھول کی پتی کو لوہے کا جگر دیتا ہے وہ

فقہ واصول میں سارا کمال دقت نظر کا ہے۔فقیہ کی تعریف بھی زبان امام معصومؑ پہ یہی ہوئی ہے کہ

انتم افقه الناس ماعرفتم معنى كلامنا

تم میں سب سے زیادہ فقیہ وہ ہے جو ہمارے کلام کے معنی جانتا ہو۔

سید الشہداء علیہ السلام کا حبیبؓ ابن مظاہر کو رجل فقیہ کہنا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

کتاب حبیب

اسی فقاہت کے پیرائے انکے مکتوبات اور خطوط میں نظر آتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں اپنے ایک خط میں

"میری صاف گوئی سے بعض اوقات مجھے بہت نقصان پہنچا ہے اور میں آج تک اس لئے موجودہ ترقی سے ہمکنار نہیں ہوسکا۔۔۔۔۔لیکن اپنی حقیقت پسندی سے مجبور ہوں۔"

مولائے کائنات علیہ السلام نے فرمایا

قل الحق ولو علیک

حق کہو چاہے تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

باریک بیں نگاہیں دیکھ سکتیں ہیں کہ انہوں نے کس طرح حق پسندی کے تفاخر کو حقیقت پسندی کے انکسار سے برتا ہے۔اور دامن بندگی پہ شائبہ غرور نہیں آنے دیا۔

ان کے مکتوبات میں پیرایۂ ادب کا اور بات مذہب کی ہے، اور یہاں آکے کھلتا ہے کہ وہ نہج البلاغہ کو منشورحیات سمجھتے، مانتے اور بطور "دستور" اسے عملی زندگی میں برتتے تھے۔

خط لکھنا بےکار ہوتا ہے اگر اس کے مقاصد متعین نہ کئے جائیں۔ورنہ مظاہرۂ فن تو ہر فنکار کرہی لیتا ہے۔

منیر شکوہ آبادی نے کہا تھا

تصویر کہنہ سے بھی رہیں بد گمانیاں
خط انکے جس کے پاس گئے بے ٹکٹ گئے

حبیبؔ جونپوری کے خطوط نہ معنوی طور پر بے ٹکٹ ہیں نہ بیرنگ۔اس لئے کہ انکے یہاں خطوط نگاری فن نہیں فرض ہے۔اور وہ اس لئے کہ وہ ایسے رہنماؤں پر ایمان رکھتے تھے۔جن میں کے اول کے خطوط سے دانشوران عالم خصوصا فصحائے عرب نے مکتوب نگاری سیکھی اور آخر کو لکھا جانے والا خط "عریضہ" کی صورت میں ہر عہد میں زندہ مذہب کی زندہ علامت ہے۔اور حبیبؔ و محبوب حقیقی کے درمیان دائمی، ابدی اور مستحکم رابطہ۔

دل مداح آیا ہے عریضہ لے کے تا ساحل
تمہیں سوچو تمہیں لازم ہے کیا اس کا صلہ دینا

حبیبؔ جونپوری

شاعر مگر فقیہہ:

ہم اس نکتہ پہ ٹھہرے تھے کہ کلام معصومؑ کے معنی کا جاننا فقاہت ہے، اب یہ کہ اس جاننے کے عمل کو کونسا پیرائیہ اظہار دیا جارہا ہے۔ اس پر امام معصوم نے کسی خاص صورت کا پابند نہیں کیا۔ اگر اس اظہار کے لئے شاعری کا پیرائیہ اختیار کیا جائے تو اس پہ کیا اعتراض ہوسکتا ہے، فرزدقؔ، کمیتؔ، حمیریؔ، دعبلؔ، ابونواسؔ وغیرھم کی فقاہت پر صرف اس لئے بات نہ کی جائے کہ یہ شاعر تھے، مرتبہ فقہ واصول کے طالب علم نہیں، تو یہ ظلم ہے، شاعر تھے مگر امام معصوم کے کلام کے معنی جاننے والے تھے، افسوس کہ تاریخ تو تاریخ، شیعیان اہلبیت نے بھی ان ہستیوں کی حیات کے اس پہلو کا درک نہیں کیا، یہ عنوان خود اک تفصیل طلب مضمون کا متقاضی ہے جس پر ہم ایک مفصل مضمون کا ارداہ رکھتے ہیں انشاء اللہ۔ مگر اس وقت مقصود سخن فرزدقؔ وکمیتؔ وحمیریؔ و دعبلؔ وابونواسؔ نہیں حبیبؔ جونپوری ہیں۔

غزل میں عقیدہ کا اظہار نہ چھوڑنے والے حبیبؔ جونپوری جب قصیدہ لکھتے ہیں تو ان کی فصاحت ان کے لفظوں میں اُمڈتی نظر آتی ہے۔

موسیٰ کا ید بیضا، جاں بخش دم عیسیٰ
کعبہ میں ہوا پیدا خود دیکھ لیں عیسائی
یوسف نے جسے دیکھا برہان کی صورت میں
صدقے میں ملی جس کے یعقوب کو بینائی

....

موسیٰ کو سکھاتا تھا انداز تکلم کا
عیسیٰ کو بتاتا تھا جو طرز مسیحائی

....

وتقلبک فی الساجدین. (القرآن۔سورہ شعرا)

اے حبیب تمہارے نور نے سجدہ گزار پیشانیوں میں کروٹیں لی ہیں۔

کبھی پیشانی آدم میں یہ چمکا بصد عزت
یہی وہ امر رب تھا جو بنا تھا روح پیکر کی

....

انہی کے نور نے عزت بڑھائی خاک کی ورنہ
بہت دشوار تھا آدم کا قبلہ گاہ بن جانا

ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ. (القرآن۔سورہ والضحیٰ)

"اے حبیب عنقریب تمہارا پروردگار تمہیں ایسا عطا کرے گا کہ تم اپنے پروردگار سے راضی ہو جاؤ گے"

مطمئن کردیا غطیک فترضیٰ کہہ کر

یونہی روٹھے کو مناتے ہیں منانے والے

حدیث۔ حور و ملائک حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نور سے خلق کیئے گئے۔

مجھے لکھنا جو تھی مدحت حسنؑ کے روئے زیبا کی

سیاہی اپنی اپنی آنکھ کی حوروں نے یکجا کی

....

برائے خدمت سبط پیمبر گھر میں زہراؑ کے

سواری آچکی ہے مریم و حوا و سارا کی

....

اگر پوشاک اک معصوم کے کہنے سے آئی ہے

تو ہے یوسفؑ کا دامن اور احمدؐ کا گریباں ہے

....

حدیث۔ انا نقطة تحت البآ

مولا علی علیہ السلام نے فرمایا" بسم اللہ کی بآ کے نیچے کا نقطہ میں ہوں"

کبھی قرآن کو نقطے کی صورت میں دکھا دینا

کبھی تفسیر بسم اللہ کو دریا بنا دینا

....

حدیث۔ فی کتفه علامة النبیؐ

امام مہدی علیہ السلام کے شانوں پہ مہر نبوت کی طرح مہر ہے۔

امام وقت ہونے میں اگر کرتا ہے شک کوئی

تو جاء الحق کا کتبہ اپنی بازو پرد کھا دینا

....

حدیث۔ اولنا محمدؐ واوسطنا محمدؐ وآخرنا محمدؐ وکلنا محمدؐ

اول کے محمدؐ کو نبوت دے دی

اوسط کے محمدؐ کو امامت دے دی

آخر کے محمدؐ کو خدا کیا دیتا

کچھ دن کو سہی اپنی سی غیبت دے دی

اور جب فقاہت روحانیت کے گلے میں بانہیں ڈال کے وجد کرتی ہے،

تو بے ساختہ گنگناتی ہے۔

آخرش زینت اصلاب رہے گا کب تک

چھپ کے بگڑے ہوئے کاموں کو بنانے والے

آئی آواز کہاں پہلا قدم میں رکھوں

بڑھ کے کعبے نے کہا آ یہاں آنے والے

ترقی پسند نستعلیق:

قدیم علوم پہ دسترس عموماً اپنے صاحب کو جدیدیت کے قبول میں مانع ہوتی ہے مگر یہاں ایسا بھی نہیں ہوا، اور قدامت کے دروازے پر ترقی پسند ادب کی دستک دینے والوں کی اگلی صف میں حبیبؔ جونپوری بھی نظر آئے اور صرف زمانے کی روا روی میں

نہیں بلکہ قدم جمائے ہوئے۔

یہاں بھی وہی فقاہت عود کے آئی۔

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا فرمان ہے

دو چیزوں کے فراق پر اگر اتنا رویا جائے کہ آنکھیں کور ہو جائیں تب بھی حق ادا نہیں ہوتا ایک دوست کا بچھڑ جانا اور ایک جوانی کا جانا۔

یاد جس کی خون کے آنسو رلائے گی حبیبؔ
وہ حکایت یاد ہے اور وہ فسانہ یاد ہے

حدیث ہے کاد الفقر ان یکون الکفر،

حوصلے کی چھوڑے تن میں جان بھی رکھتی نہیں
مفلسی انسان کو انسان بھی رکھتی نہیں

وقائع ہند کا آئینہ اور ۱۴۰۰ سو سالہ مسلمان تاریخ کا عکس۔

کتنی قدیم واردات کتنا جدید لہجہ۔

تم نے لوٹا ہے اسلام کا بانکپن
مقبروں کی ضیاء میتوں کا کفن
سیدوں کا حشم عظمت برہمن
جوہر آدمی اعتزاز وطن

اور وہی فقاہت۔

اپنی فتح دو روزہ پہ پھولے ہو کیوں
خبث باطن کا انجام بھولے ہو کیوں

ملاحظہ کیجئے آیہ قرآن۔ والذی خبث لایخرج الانکدا

ترجمہ۔ بد باطن کی ذات سے کسی کو فیض نہیں پہنچتا۔

بنیاد پرست مگر انسانیت نواز:

کسی مصرعہ میں نہ اپنی بنیاد سے کٹے نظر آتے ہیں نہ اپنی تاریخ سے بیگانہ۔ انکے یہاں جدیدیت کے سینے کا ہر زخم، زخم نہیں استعارہ ہے تاریخ کے زخموں کے اظہار کا،

مگر اسکے باجود انکی نیت کا اخلاص اور درد دل اسقدر نمایاں ہے کہ ان پر زخموں کی نمائش کا الزام نہیں آتا۔

یہ دکھائیں گی منزلوں کا نشاں
جن کو کہتے ہیں بے بصر لاشیں

ترقی پسند ادب کی پر کیف آواز کیفی اعظمی نے کہا تھا۔

یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلا دیں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا

مگر ترقی پسند ادب کو یہ لہجہ یگانہ کے کلاسیکل ادب سے ملا ہے اور کیفی کے یہاں یگانہ کے تتبع کے آثار بالکل جلی ہیں۔

یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہوکر

یگانہ

مگر حبیب جونپوری کے یہاں نہ یگانہ کا اثر ہے نہ کیفی کا اتباع بلکہ وہ اپنی فکر

میں بھی طبع زاد ہیں متضمن نہیں۔ مجتہد ہیں مقلد نہیں۔ فقیہہ ہیں تابعی نہیں۔

دنیا کو پھونک دے گی یہی خامشی کی آگ
دیکھی کہاں کسی نے ابھی زندگی کی آگ

کیفی اور یگانہ کے ہاں آتش زنی خود سوزی کا نتیجہ ہے جبکہ حبیب جونپوری کے ہاں ایسا نہیں۔

آگ کہہ کر انہوں نے اس احتمال کو ختم کر دیا۔

ترقی پسندی نے جب کمیونزم کی چادر اوڑھی تو لوگ سمجھے کہ اپنی بنیاد سے لا تعلق اور اپنے عقائد سے منحرف ہو جانے کا نام ترقی پسندی ہے۔ لہذا الحاد کو ترقی پسندی سمجھا جانے لگا۔

اس رویے کا اثر ادب پر بھی مرتب ہوا، جس کی مثالوں کی چنداں ضرورت نہیں۔

علامہ رشید ترابی اعلیٰ اللہ مقامہ نے اسی الحاد کے خلاف آواز اٹھائی۔

کوئی تو سہارا بنے بت ہو خدا ہو
کیا ان کا بھرم دیر و حرم جن کے نہیں ہیں

"نا معلوم حسرت" نامی نظم میں اسی الحاد کے خلاف حبیب جونپوری کا غیر محسوس جہاد دیکھئے۔

الفت کی شکایت ترا شکوہ نہیں پیارے
میں جانتا ہوں ظلم کسی کا نہیں پیارے
پوری ہو تمنا تو تمنا نہیں پیارے
بس اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہے

وہ اپنے سامع اور قاری کو پستی کی مثالوں سے بلندی کی اس حقیقت تک لے جاتے ہیں جہاں تک وہ کسی "رفیع الفکر" کا ہاتھ تھامے بغیر جا ہی نہیں سکتا۔

آج اہل نظر نے پھر دیکھا
عرش پہ خون فرش پہ لاشیں

فرد کا استعارہ ملت کا بیان

بدل رہا ہے زمانہ بری طرح کروٹ
نہ جانے رشتہ دل استوار ہے کہ نہیں

چاہ الفاظ سے آب رسانی

ماضی کا زخم اور حال کا کرب مستقبل کے درماں سے غافل نہیں ہونے دیتا۔

"آ" زندگی کے واسطے تجھ پہ مروں گا میں
نقش قدم پہ آخری سجدہ کروں گا میں

جوش نے کہا تھا

الفاظ کے سر پہ نہیں اڑتے معنی
الفاظ کے سینے میں اتر کر دیکھو

لفظ کا سینہ چاک کیجئے اور حبیبؔ جونپوری کی قدآوری کا اندازہ لگائیے۔

"آ" غالبؔ کے ہاں بھی ہے
آ کہ مری جان کو قرار نہیں

مگر غالبؔ کے یہاں "آ" کے ساتھ تذبذب ہے۔ لیکن حبیبؔ جونپوری کے

یہاں قطعیت۔

تسیم نے کہا

آ کہیں وعدہ فراموش کہ فرصت کم ہے

تسیم کے یہاں طنز ہے، حبیب کے یہاں اعتماد ہے۔

میر نے کہا

مردی گر ہے تو بزم بت سے نوش میں آ

میر کے یہاں غصہ ہے، حبیب کے یہاں محبت ہے۔

عہد ساز مگر بے نیاز

اے موت ٹھہر تعجیل نہ کر دم بھر میں وہ آئے جاتے ہیں

اردو شاعری کی تاریخ میں ایک مصرع میں مسلمات اور کلیات کہنے والے شاعر کم کم ہی پیدا ہوئے ہیں ایک آدھ مصرع تو کئی شعراء کے دیوان میں مل جائے گا مگر ایک سے زیادہ ہوں اور ایک حیثیت کے ہوں۔اور سننے والا دوسرے مصرع کی جستجو نہ کرے۔

جیسے ثاقب

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

یا امیر

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

یا مصحفی

کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

اور حبیبؔ جونپوری اپنی منزلت سے ناواقف بھی نہیں۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام)

دل میں ہو اگر حب الٰہی کا جمال
اشعار نکلتے ہیں حدیثوں کی طرح

لیجئے احادیث ادب سے لطف اجتہاد حاصل کیجئے

اللہ بنائے تو ولی بنتا ہے
ایک آنسو میرے کام آیا بہت

وہ اتنا ہی روٹھے جاتے ہیں ہم جتنا منائے جاتے ہیں
جس کے دل پر شعر خود ہوتا تھا نازل وہ انیسؔ

دیکھی کہاں کسی نے ابھی زندگی کی آگ
دستار تو لاکھوں ہیں مگر سر نہیں ملتا

گلشن کو مہک پھول کی صحبت سے ملی ہے
نقش بہتے ہوئے پانی پہ بناتے کیوں ہو

ہم کہاں سے زندگی لاتے کہ دنیا دیکھتے
مٹ گیا میں تو مرے عشق کے آثار ملے

نہ جلتی شمع محفل میں نہ مرتا اس پہ پروانہ
حاسد اچھا شعر نہیں کہہ سکتا

کوزے میں سمندر کی گہرائی:

اردو اصناف شاعری میں، گہری بات اور تنگ پیرائے کی یکجائی کی ضرورت عموماً قطعہ اور خصوصاً رباعی کے جنم کا سبب ہے۔ ۴ مصرعے اور سخن تمام۔ سمجھنے میں رباعی آسان اور کہنے میں قطعہ۔ کہنے میں بالعکس۔

رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جس پہ تصرف یقیناً شاعر کی قادر کلامی پہ دلالت کرتا ہے، صد حیف کہ اب یہ فن بھی ماہرین فن کے معدوم ہونے کے سبب دم توڑ رہا ہے۔

رباعی ہو یا قطعہ اسکا سارا کمال بے ساختگی میں ہے۔ مصرعہ بدقت وجود میں آئے تو رباعی، رباعی نہیں رہتی اور قطعہ، قطع ہو جاتا ہے۔

حبیب جونپوری کے یہاں یہ بے ساختگی بے پناہ پائی جاتی ہے۔

جس دل کو بڑھایا تھا اسے توڑ رہے ہو
دوست دشمن سب عیادت کر چکے
وہ نہ آئے جن کو آنا چاہیے

....

بے ساختگی اور ندرت فکر

وہ مل رہے ہیں گلے، جان زار رخصت ہے
کہ تا بہ حشر مری عید عید رہ جائے

....

چھپا چھپا کے خطائیں، بچا بچا کے نظر
ترے کرم نے بنایا گناہ گار مجھے

....

شاعر ہے تو کر ژرف نگاہی پیدا
جب ابر نہیں ہوگا تو بارش کیسی

تفصیلات میں جانے کے باوجود یہ مضمون اپنی معنویت میں ناتمام ہے ڈر ہے کہ کہیں ایک اور کتاب نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ شخصیت ہمہ گیر ہے اور بیان مختصر۔

سب سے آخر میں آیۃ اللہ حبیب جونپوری قدس سرہ کے فرزند ڈاکٹر اختر ہاشمی صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے محبت فرمائی اور مجھے یوں قرض محبت ادا کرنے کا موقع ملا۔ اور طبع کتاب میں تاخیر بھی انہوں نے میری خاطر سے برداشت کی۔ ورنہ اب تک یہ کتاب مشاطہ طباعت کے ہاتھوں سے گزر کر شہود کی سیج تک پہنچ چکی ہوتی۔

والسلام

سوانح (سیرت و کردار)

حبیبؔ جونپوری کے مولد (جونپور) کا تعارف

سید محبوب الحسن ۱۸ / مارچ ۱۹۱۸ء میں شیرازِ ہند جونپور میں پیدا ہوئے۔ ان کا تخلص حبیبؔ تھا اور جونپور کی نسبت سے حبیبؔ جونپوری کہلائے۔

جونپور ہندوستان کے صوبہ اُتر پردیش (شمالی ہندوستان) میں دریائے گومتی کے کنارے ایک شہر ہے جو ۲۵ درجہ ۴۸ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۸۲ درجہ ۴۲ درجہ دقیقہ طول بلد مشرق میں واقع ہے۔

کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ جونپور مشرق و مغرب کو علیحدہ کرنے والا شہر ہے۔ جیسا کہ مائل ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"جونپور ہندوستان کے مشرق و مغرب کو الگ کرنے والا شہر تھا۔ ساتھ ہی جب شاہان شرقی نے جونپور کو مشرق و مغرب کے درمیان ایک حکومت کی راجدھانی بنادیا تھا، اس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔"

اُردو انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

"جونپور جنوبی ہند کا تاریخی شہر ہے۔"

جونپور کو جنوبی ہند کا شہر لکھنا ایک غلط فہمی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ برصغیر کے

نقشے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

ویسے بھی جنوبی ہند میں دکن، دولت آباد، احمد نگر، بیجاپور، گلبرگہ، گوا وغیرہ موجود ہیں اور جونپور اودھ کا حصہ تھا جو کہ شمالی ہند میں موجود ہے جیسا کہ پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

''جس علاقے پر آج کل اودھ کا اطلاق ہوتا ہے، دورِ اکبری میں یہ علاقہ دو صوبوں اودھ و الہ آباد پر مشتمل تھا۔

آئینِ اکبری کے مطابق صوبہ اودھ میں پانچ سرکاریں تھیں۔

(۱) اودھ

(۲) بہرائچ

(۳) خیر آباد

(۴) گورکھ پور

(۵) لکھنو

جب کہ صوبہ الہ آباد میں نو سرکاریں تھیں۔

(۱) الہ آباد

(۲) بنارس

(۳) جونپور

(۴) جناوہ

(۵) غازی پور

(۶) کڑا

(۷) کوڑہ

(۸) کالنجر

(۹) مانکپور

اسی طرح علامہ سید عبدالقدوس ہاشمی صاحب لکھتے ہیں۔

''اودھ جس سرزمین کا نام ہے وہ آج کل صوبہ اتر پردیش کا حصہ ہے...... اتر پردیش کا یہ صوبہ دارالحکومت سے بالکل ملحقہ صوبہ ہے جو دہلی سے مشرق وجنوب میں واقع ہے۔ اس کا نام اتر پردیش یعنی شمال کا دور افتادہ ملک رکھنا محض دھاندلی اور لفظ کا غلط استعمال ہے۔''

ہندوستان کی تاریخ میں جونپور شہر کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی بنیاد ۷۶۰ ہجری /۱۳۵۹ء میں فیروز شاہ تغلق نے ظفرآباد کے قریب رکھی تھی۔ جونپور کی بناء کے متعلق مختلف مورخین نے جو آراء دی ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

بقول مولانا خیر الدین محمد صاحب:

''۷۷۲ھ مطابق ۱۳۶۰ء میں فیروز شاہ تغلق نے موجودہ شہر جونپور کی بنیاد ڈالی۔''

بقول علی ضامن ترمذی:

''جونپور شہر کی بناء کی تاریخ ۷۶۰ھ ہے اور تکمیل کی تاریخ ۷۷۲ھ ہے۔''

اسی طرح ''جامع تاریخ ہند'' میں لکھا ہے:

''۷۶۰ھ/۱۳۵۹ء میں فیروز شاہ نے خان جہان کو ایک بار پھر نائب مقرر کیا۔ اودھ اور قنوج کے راستہ سے کوچ کرتے ہوئے فیروز نے ''جونپور'' کے شہر کی تعمیر میں چھ ماہ صرف کیے۔ اپنے عم زاد بھائی سلطان محمد جو کسی زمانہ میں ملک جونا کے خطاب کا حامل

تھا، کے نام پر اُس نے یہ نام رکھا۔"

اسی طرح جونپور کے نام کے متعلق آگے لکھا ہے:

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جونپور کا نام ایک ہندو رشی کے نام پر تھا۔"

"جونپور نامہ" میں لکھا ہے:

"مشہور فی زمانہ ہے کہ موضع فیروز شاہ پور جس کو عوام پروی پور دفتر سرکار انگریز یہ فروشہ پور یہ اسی فیروز شاہ پور کی خرابی ہے۔ ہنگام آبادی شہر جونپور کو بطور ایک محلہ قائم کیا تھا اور قلعہ کی جانب اُتر کر ایک کوس کے فاصلہ پر واقع پہلے پہل وہیں پر تخت قائم کیا۔ اب یہ ایک موضع ہے، اپنا خطاب اتا یک اعظم رکھا اور خطبہ و سکہ اپنا جاری کیا۔ جاننا چاہیے کہ اسی ۸۰۱ھ عہد بادشاہ سے تخت و سلطنت جونپور قائم ہے۔"

آگے لکھا ہے:

"خواجہ جہاں سرور سلطان الشرق نے جونپور کو پایہ تخت دے کر ۸۰۱ھ میں ایک خودمختار اور آزاد حکومت کی بنیاد رکھی۔"

بقول امیر علی جونپوری:

"جونپور کی تاریخ بنیاد ۷۶۰ھ ہے۔"

سید وحید الحسن ہاشمی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"جونپور کو فیروز تغلق نے بسایا، یہ شہر ۷۷۲ھ میں بسایا گیا۔ شہر جونپور سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔"

تمام تاریخوں سے حالات کا جائزہ لینے کے بعد راقم بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جونپور کی بنیاد رکھنے کا اصل سن ۷۶۰ھ ہے اور ۷۷۲ھ اس کی تکمیل کا سال ہے۔

جونپور کسی زمانے میں "شیرازِ ہند" کے نام سے مشہور تھا۔ اسی لیے مختلف

مورخین نے اس بات کی تصدیق کی ہے، جیسا کہ مائل ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"جونپوری کسی زمانے میں "شیرازِ ہند" مشہور تھا۔"

اسی طرح پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

"جونپور اپنی تاسیس کے زمانے سے لے کر شیرشاہ کے عہد تک اپنے علم وفضل کی وجہ سے "شیرازِ ہند" کہلاتا تھا۔"

اسی لیے وحید الحسن ہاشمی نے حبیب جونپوری کی جائے ولادت جونپور کو "شیرازِ ہند جونپور" لکھا ہے۔"

پروفیسر عبدالکریم خالد لکھتے ہیں:

"فیروز شاہ تغلق کے بسائے ہوئے شہر جونپور کی علمی و ادبی، مذہبی اور تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ تاریخ نے اسے "شیرازِ ہند" کے نام سے سرفراز کیا ہے۔"

علمی، ادبی اور تہذیبی سطح پر یہ شہر بہار و بنگال سے بھی فیض حاصل کرتا رہا اور لکھنؤ، دہلی، افغانستان و ایران کے اثر سے بھی فیض یاب ہوتا رہا۔ مختلف تاریخوں میں جونپور کے معرکوں کا ذکر بکھرا ہوا ہے۔ مشرق و مغرب کے حکمران ہمیشہ جونپور پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے یہ شہر برابر شکست و ریخت سے دوچار رہا ہے۔

ناصر الدین محمود تغلق کے دورِ حکومت میں جب ملک پُر آشوب حالات سے دوچار تھا تو مشرقی اضلاع کے ہندوؤں نے سلطنتِ دہلی کی اطاعت کرنے سے انکار کردیا۔ ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں خواجہ سرا ملک سرور خواجہ جہاں نے محمود کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے اُسے بھیجے۔ چناں چہ خواجہ جہاں نے کویل (علی گڑھ) اٹاوہ اور قنوج کو مطیع کر لینے کے بعد جونپور پر قبضہ کرلیا اور وہاں وہ اودھ کی

سلطنت کا خودمختار حاکم بن بیٹھا۔

۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء میں دہلی کے سلطان بہلول لودھی نے آخری شرقی سلطان حسین کو شکست دی اور اپنے لڑکے باربک کو جونپور کا حکمران بنایا۔ نیز اسے شاہی لقب اور سکہ جاری کرنے کی اجازت بھی دی۔ ۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء میں سکندر لودھی جب دہلی کا سلطان بنا تو جونپور پر چڑھائی کی اور قبضہ کیا۔

ہمایوں کی دہلی سے طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد مشرقی صوبوں پر سے اس کا قبضہ ختم ہوگیا تو ۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں شیرشاہ کی فتح عظیم کے بعد اسے اور اس کے بیٹے عادل خان کو جونپور کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔

جب چنار نے ترقی کی تو جونپور کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔ علی قلی خان نے جو ۹۶۵ھ/ ۱۵۵۸ء میں وہاں کا گورنر تھا، بغاوت (۹۷۰ھ/ ۱۵۶۳ء) کی۔ پہلے اُسے اہمیت حاصل نہ ہوئی، جب ۹۷۴ھ/۱۵۶۷ء میں علی قلی خان نے شکست کھائی تو اکبر نے عارضی طور پر وہاں سکونت اختیار کرلی اور خانِ خاناں محمد منعم خان کو وہاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔

الہ آباد کی تاسیس کے بعد جونپور کی ساری اہمیت ختم ہو کر رہ گئی اور بارھویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں جونپور نوابینِ اودھ کے اور ۱۷۷۵ء میں انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔

جونپور کے بعض حکمران روایتی انداز کے عالم و فاضل سے بڑھ کر شائستہ، نکتہ سنج اور صاحب ذوق تھے۔ خصوصاً سلاطینِ شرقیہ کی معارف پروری و علم دوستی کی وجہ سے یہ شہر علماء و فضلاء کا مرکز بن گیا اور قاضی شہاب الدین جیسے اکابر علماء یہاں سکونت پذیر ہوئے اور اس علاقے میں مسلمانوں کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوگئیں اور

جونپور کے بہت سے قریات و قصبات مثلاً بلگرام، چریا کوٹ، گوپا مئو، کاکوری، سندیلہ، موہان، جائس اور امیٹھی وغیر علماء و مشائخ کی سکونت کی وجہ سے علم و فضل کے مرکز قرار پائے۔ جونپور کی مساجد، تعلیم گاہیں، امام بارگاہیں، مزار، قلعے اور اہلِ علم اس شہر کی تاریخی اہمیت کا ثبوت ہیں۔ یہاں کی مشہور جامع مسجد ہیکل کے مشابہہ ہے۔ اس مسجد کا سب سے بڑا دروازہ ۲۲٫۹ میٹر اونچا ہے۔ ہر بابِ مسجد کے اندر ایک وسیع محراب دار حجرہ ہے جس میں روایتی طور پر بنی ہوئی نیزوں کی انیوں جیسی جھالریں ہیں۔ اس مسجد میں مینار نہیں ہیں۔ ایک مسجد خالص مخلص جو ابراہیم کے دو والیوں نے تعمیر کی تھی، اسی عہد کی ہے۔ اس مسجد کے صرف مرکزی بابِ مسجد ہیرج اور مغربی لیوان باقی رہ گئے ہیں جو تمام دیوہیکل اور بغیر کسی تزئین کے ہیں۔

اسی عہد کی ایک اور مسجد جھنجھری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے وسطی دروازے میں صرف اس کی منقش دیوار باقی بچی ہے جو جونپور کی سنگ تراشی کے نہایت نفیس کام سے بھری پڑی ہے۔ مسجد لال دروازہ جو شہر کے شمال جنوب میں واقع ہے جونپور کی سب سے چھوٹی مسجد ہے۔ یہ ۸۵۱ھ/۱۴۴۷ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ جونپور کی قابلِ دید عمارات میں اٹالا مسجد بھی ہے جس کی بنیادیں فیروز شاہ تغلق نے ہندوؤں کے مندر اٹالا دیوی کی جگہ رکھی تھی۔ اسے ابراہیم شرقی نے ۸۱۰ھ/۱۴۰۸ء میں تعمیر کرایا۔ یہ مسجد سب سے بڑی (۸۰۷مربع میٹر) اور سب سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہے اور اُسے صحن کی طرف سے ایک بلند مخروطی پھاٹک نے ڈھانپ رکھا ہے۔

اسی طرح مسجد چاچک پور، مسجد ملکہ راجے بی بی، مسجد نواب محسن خان، مسجد شاہ کبیر، مسجد مستجاب الدعوات، مسجد عیدگاہ، مسجد مرزا میرک، مسجد شاہ شیخو، جامع مسجد ظفر آباد، مسجد حکیم محمد وغیرہ مشہور مساجد رہی ہیں۔ جونپور کی یادگار عمارات میں سے ایک فیروز شاہ کا قلعہ ہے۔ جو دریائے گومتی کے شمالی کنارے پر واقع ہے۔ اس کی دیواریں

پتھر کی ہیں جو کافی بلند ہیں۔اس کی حفاظت کے لیے مخروطی اور کروی برج تعمیر کیے گیے ہیں۔ ان برجوں کو ۱۸۵۹ء میں انگریزوں نے مسمار کردیا تھا۔ انہی مسمار شدہ عمارات میں فیروز شاہ کے گورنر کا تعمیر کرایا ہوا محل چہل ستون بھی تھا۔ اسی گورنر کی تعمیر کرائی ہوئی مسجد ابھی تک موجود ہے جو اس نے اپنے قلعے میں تعمیر کرائی تھی۔ مسجد کے صحن سے متصل ایک مینار ہے جو تقریباً بارہ میٹر اونچا ہے۔

شاہان شرقی کی علم پروری کی وجہ سے بڑے بڑے دانش ور یہاں آکر آباد ہوئے۔ شیخ ابوالفتح سن برسا، شہاب الدین دولت آبادی، مولانا الہدیٰ، ملا افضل، استاد الملک، ملا محمود جونپوری صاحب، شمس بازغہ، دیوان، ملا عبدالرشید، مفتی عبدالباقی، مولانا نور الدین، شیخ اعظم، شاہ پیر محمد جونپوری، ملا غلام نقشبندی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

ملا محمود کی کتاب ''شمس بازغہ'' علم، فلسفہ اور منطق کی بہت زبردست کتاب ہے۔ یہ عربی زبان میں ہے۔ یہاں تک کہ ابراہیم ذوق نے بھی اپنے ایک قصیدے میں اُس کا ذکر کیا ہے کچھ یوں ہے:

ہوا ہے مدرسہ، یہ بزمِ گاہِ عیش و نشاط
کہ ''شمس بازغہ'' کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر

سید دلدار حسین صاحب قبلہ جائسی جن کے علم و کمال کا چرچا ایران و عراق تک پھیلا ہوا تھا، انہوں نے بھی جونپور میں رہ کر علامہ سید عسکری صاحب مفتی محلوی سے درسی کتابیں اور معقولات پڑھی تھیں۔ مفتی عبدالباقی پسر شیخ الاسلام صاحب ''آداب باقیہ'' ملا محمود کے شاگرد تھے۔ شیخ اعظم لکھنوی زمانہ سرشاہی شرقیہ میں جونپور آکر تعلیم حاصل کر گیے تھے اور شیخ معروف کے مرید تھے۔ اپنے عہد میں شیخ معروف یہاں کے نام ور درویش اور عالم و فاضل بزرگ تھے، جن کا ذکر ''تجلی نور'' ''تذکرۂ مشاہیر'' حصہ اوّل میں موجود ہے۔

بھکاری داس عزیز کو خواجہ میر دردؔ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ان کا وطن بھی جونپور ہی تھا۔عزیز صاحب بعض شاہی امور پر دہلی میں معمور تھے۔ ''گزلار ابراہیمی'' میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

خان بہادر میر ناصر علی ذوالقدر جونپوری سا مآن مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے۔ میر ناصر علی کا شمار کاملینِ جونپور میں ہوتا ہے۔

نواب مرزا منعم خانِ خاناں کا نام جونپور کے شاہی پل کے ساتھ زندہ اور باقی رہے گا۔ سید غلام مہدی صاحب خان بہادر، سید محمد محسن ذوالقدر، محسنؔ جونپوری، سید ابو محمد جعفری، جلیسؔ جونپوری، شاگردانِ انیس سید محمد احسن صاحب احسن، کاہشؔ جونپوری، سید علی مصطفیٰ صاحب مصطفیٰ، شاہ تیم الحسن صاحب غبارؔ، سید محمد سعید خاں صاحب بابرؔ، سید ذوالفقار حسین صاحب صدقؔ، مولوی مولانا محمد مہدی صاحب نگارؔ، شفیقؔ جونپوری، سید عباس حیدر مضطرؔ، سید محمد علی موثرؔ، سید وحید الحسن ہاشمی، سید علی حامد، حکیم امیر حسن وفاؔ، سید علی جونپوری، واثقؔ جونپوری وغیرہ دبستانِ جونپور کے نام ور شعراء ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد نام رہ گئے ہیں۔صرف شعرائے جونپور کے لیے ایک الگ کتاب چاہیے۔ جونپور کے نام سے ایک تلمیح بھی مشہور ہے۔وہ یہ ہے:

''جونپور کا قاضی''

اسی لیے شیخ محمد اکرم لکھتے ہیں:

''سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت میں علم و ادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا......علم وفضل میں یہ زمانہ عہدِ علائی سے کم نہ تھا۔''

آگے لکھتے ہیں:

''جس طرح اٹھاویں صدی میں دہلی کے شعراء کی جائے پناہ لکھنو تھا۔اسی

طرح چودھویں صدی میں جو لوگ تیمور کی تباہ کاریوں سے بچنا چاہتے تھے، ان کے لیے ملجا و ماویٰ جونپور تھا۔

سید امجد علی لکھتے ہیں:

''تیمور کے ۱۳۹۸ء کے حملے سے سب معاشرہ تہ و بالا ہوگیا تھا اور جونپور کی فیاضانہ سرپرستی سے اہلِ فن اور ہنرمند افراد یہاں آکر جمع ہوگئے تھے۔''

یہ تو تھا کچھ مختصر سا تعارف حبیبؔ جونپوری کے مولد جونپور کا۔ اب ہم حبیبؔ جونپوری کے عہد کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی پس منظر اور پیش منظر کا جائزہ لیتے ہیں۔

سیاسی و معاشرتی پس منظر

سید محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری ۱۹۱۶ء کو جونپور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۷ء میں ان کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ سید محبوب الحسن کا عہد کئی اعتبار سے نشیب و فراز کا شکار رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سال کو برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں جو اہمیت حاصل ہے وہ جنوبی ایشیاء کی تاریخ کے ہر طالب علم پر روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ اگرچہ برصغیر کے مسلمانوں کا ۱۸۵۷ء کے واقعات سے بہت گہرا تعلق ہے لیکن ان واقعات کے نتائج اور عواقب بہت وسیع اور ہمہ گیر تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ صدی میں برصغیر پاک و ہند میں جو اہم اور غیر اہم واقعات ہوئے، جنہیں کسی بھی درجے میں تاریخ کے مواد میں شمار کیا جاسکے کسی نہ کسی طرح ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے گہرے اور دوررس اثرات سے مربوط ہیں کیوں کہ یہ ایک ایسا زلزلہ تھا جس کے نتیجے میں یہاں کی سیاست، معاشرت، ثقافت اور ادب غرض کہ مجموعی طور پر زندگی کے تمام شعبے لرز اٹھے اور یہ لرزش تقریباً دو دہائیوں تک باقی رہی۔

انیسویں پارے سورۃ النمل میں ارشادِ باری ہوتا ہے:

"ان الملوک اذا دخلو قریۃ افسدوھا وجعلو اعزۃ اھلھا اذلۃ"

ترجمہ:

"بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں (بزورِ شمشیر) داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کردیتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل و رسوا کردیتے ہیں۔"

اس آیتِ مقدسہ کی بعینہٖ تفسیر ہمیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں دکھائی دیتی ہے جس میں مسلمان مفتوح تھے اور انگریز فاتح، فاتح نے مفتوح سے گن گن کر بدلے لیے۔ قتلِ عام کیا، لوٹ مار کی، موت اور کالے پانی کی سزائیں دیں، نئے نئے طریقوں سے اذیتیں دیں، جیسے پھانسی کے لیے درختوں پر لٹکانا، سولی پر چڑھانا، جلتی سلاخوں سے داغ کر مارنا، زندہ جلادینا، ایک دوسرے کو بدفعلی پر مجبور کرنا، سور کی کھال میں سی کر جلادینا۔

بقول خورشید رضوی:

"توپ سے باندھ کر اُڑا دینا، بھوکا رکھ کر یا دم گھونٹ کر مارنا، بستیوں کو جلا دینا وغیرہ انگریزوں کے ظلم کے عام طریقے تھے۔"

مسلمانوں کے لیے ترقی کے تمام راستے مسدود کردیئے گئے تھے۔ حالاں کہ جنگِ آزادی میں ہندو بھی برابر کے شریک تھے لیکن ساری ذمے داری مسلمانوں پر ڈال دی گئی اور ان کو ایک قوم کی حیثیت سے تقریباً مٹادیا گیا۔ اسی لیے سرسید احمد خان نے کہا تھا:

"غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے، وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہوگئے مگر مسلمان اور مسلمانوں کے خاندان

تباہ ہو گئے۔"

۱۸۵۷ء کے بعد کئی برس تک انگریزوں کی حکمتِ عملی اسی اصول پر مبنی رہتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کم زور، ناکارہ اور محتاج بنا دیا جائے۔

بقول ہاشمی فرید آبادی

"مسلمانوں کے حوصلے ایسے پست کر دیئے جائیں کہ وہ پھر کبھی انگریزی حکومت کے خلاف نبرد آزما ہونے کا خیال تک دل میں نہ لاسکیں۔"

ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "Our Indian Muslims" میں مسلمانوں کو اُن کے جذبۂ جہاد کے باعث باغی ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ اس خوف ناک صورتِ حال میں مسلمانوں پر معاش کے سب دروازے بند کر دیئے گئے۔

بقول ڈاکٹر شمس الدین صدیقی

"انگریزوں نے مسلمانانِ پاکستان و ہند...... پر نہ صرف ذرائع معاش بند کر دیئے اور عزت کی زندگی بسر کرنے کے وسائل سے عاری کر دیا بلکہ اُن کی فکری صلاحیتوں کو تعلیم سے محروم کر کے برباد کر دیا اور اُن کی دینی اور ثقافتی سرگرمیوں کو بھی کچل کر رکھ دیا۔"

۱۸۷۱ء میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا:

"مسلمان اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد قومیت کے متعلق اپنے پرانے شدید جذبے اور سپاہیانہ مہم کی صلاحیت و قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر دوسرے تمام اعتبارات سے وہ ایک ایسی قوم ہیں جو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ ہو چکی ہے۔"

غدر کی ناکامی کا سب سے زیادہ برا اثر یہ تھا کہ ہندوستان جو اب تک "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے سیاسی تماشوں کا میدان بنا ہوا تھا، اب براہِ راست ملکہ

وکٹوریہ کی قلم رو میں شامل ہو گیا تھا۔ چناں چہ ۱۸۸۸ء میں ملکہ کی طرف جو فرمان جاری کیا گیا، اس کی پہلی شق ہی یہ تھی کہ آج سے ہندوستان دولتِ برطانیہ کا ایک حصہ ہوگا۔ حکومتِ برطانیہ کے تسلط سے سب سے بڑا نقصان ہماری صنعت و حرفت کو پہنچا۔ انگریزوں کے پاس تیز رفتار مشینیں تھیں، ہمارے پاس سست رفتار صنعت کار، جنھیں بھوک، افلاس، احساسِ غلامی، قرضوں اور جہالت نے کچھ اور بھی سست رفتار اور زندگی سے بے زار بنا رکھا تھا۔ انگریزوں کے پاس نقل و حرکت کے جدید ترین ذرائع تھے۔ ہمارے پاس محض چوپائے، ایسے چوپائے جن کی حالتِ زار پر سودا کی ہجویات نثار۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زمانے میں ہندوستان کی مصنوعات لوگ منہ مانگے دام دے کر خریدا کرتے تھے۔ وہ اب ''جنسِ کس مخر'' بن گئیں۔ انگریزوں نے اپنی تجارت کے فروغ کے لیے یہاں کی مصنوعات کا گلا گھونٹنے کی ایک اور ترکیب سوچی اور یہ کہ اُن پر بے تحاشا محصول بڑھا دیا۔ مجبور ہو کر ہندوستانی اپنے پرانے دقیانوسی ہل بیل لے کر سوکھے اور بنجر کھیتوں کی طرف چلے۔ گویا ہندوستان ایک بار پھر اپنی قدیم تاریخ دہرانے جا رہا تھا۔ ہم ترقی کی شاہراہ پر دنیا کے دوسرے ملکوں کے شانہ بہ شانہ چلنے سے محروم کر دیے گئے۔ اُن کی زندگی پر ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا جس کے کنارے پر کوئی سنہری لکیر دکھائی نہیں دیتی تھی۔

تاریخ میں ہندوؤں کی بہت سی مخبریوں کا ریکارڈ موجود ہے، جن کے نتیجے میں مسلمانوں کو پھانسیاں ملیں۔ اُن کی جائیدادیں ضبط ہوئیں، اُن کی اولادوں نے بھکاریوں کی طرح در بہ در کی ٹھوکریں کھائیں اور مخبروں کو ضبط شدہ جائیدادوں سے حصہ ملا اور تجارتی سہولتیں اور نئی نوکریاں بھی ملیں۔ زوال و انحطاط کے اس آخری قصرِ مذلت میں بھی انگریزوں کو مسلمانوں سے خطرے کی بو آتی تھی۔

جیسا کہ ہنٹر لکھتا ہے:

''ہند کے مسلمان اب بھی اور سال ہا سال سے بھی، برطانوی اقتدار کے لیے مستقل خطرہ ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے نظام سے علیحدہ اور دور رہے ہیں۔ جن تبدیلیوں کے سامنے موقع شناس ہندوؤں نے خوش دلی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ مسلمان اُن تبدیلیوں کو شدید ظلم تصور کرتے ہیں۔''

ہنٹر نے خود بھی تسلیم کیا کہ اگرچہ:

''مسلمان بڑی شان دار روایات کی مالک قوم ہے، لیکن معاش کے سارے راستے اُن پر مسدود ہیں۔''

اس دور کے اُن حالات کو دیکھتے ہوئے مختلف ادباء اور شعراء نے اپنے اپنے طور پر بہت کچھ لکھا۔ علامہ اقبالؔ، مولانا ظفر علی خاں، شاعرِ انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کے ساتھ ساتھ محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری نے بھی ایک شان دار نظم ''فرنگی'' کہی تھی۔

تم نے لوٹا ہے اسلام کا بانکپن
آرزوؤں کے گل، زندگی کا چمن

رونقِ نازنیاں، گلوں کی پھبن
حسنِ پنجاب تہذیبِ گنگ و جمن

مقبروں کی ضیا، میتوں کا کفن
سیدوں کا حشم، عظمتِ برہمن

تم نے دفنا دیا اہلِ مشرق کا فن
جوہر آدمی اعتزازِ وطن

سطوت مرد سرمایۂ حسنِ زن
شہسواروں کے دل سورماؤں کے تن

قلب بے باک بازوئے شمشیر زن
ساری دنیا میں ممتاز رنگِ سخن

اپنی فتحِ دو روزہ پہ پھولے ہو کیوں
خبثِ باطن کا انجام بھولے ہو کیوں

مایوسی کی یہ فضا کسی "مردِ آہن" کی منتظر تھی جو آگے بڑھ کر ہندوستانیوں کے تھکے ہوئے دماغوں کو تازگی اور بجھے ہوئے دلوں کو نئی روشنی دے سکے۔ اس وقت سرسید احمد خاں کی ذات سامنے آئی۔ انہوں نے مسلمانوں کی اجتماعی بقا کے لیے اس بات کو ضروری محسوس کیا۔ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان پیدا ہونے والی مغائرت اور غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی پُر زور تحریروں کو ذریعہ بنایا۔ رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھا تاکہ مسلمانوں کو انگریزوں کے عتاب سے مزید بچایا جا سکے۔ دوسرے مقاصد میں مسلمانوں کی تہذیبی بقاء، سیاسی ترقی اور معاشرتی سر بلندی سرسید کے پیشِ نظر تھی کیونکہ انگریز "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔ سرسید نے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھیں۔ ان کی نظر حال اور مستقبل دونوں

پرتھی۔ اُن کا ذہن حالات کا حقیقی تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس لیے سرسید نے مقاصدِ ملی سے انحراف نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی قومی جنگ جاری رکھی اور کھلی جنگ میں توپ و تفنگ آراستہ کرنے کی بجائے جدوجہد کی بساط کاغذ پر سجائی اور اُسے دلائل سے جیتنے کی کوشش کی۔

اُردو زبان و ادب پر سرسید کا گہرا اثر پڑا۔ ان کے گرد خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور محسن الملک اس طرح جمع ہو گئے تھے جیسے چاند کے گرد ہالہ ہوتا ہے۔ خود سرسید کے مضامین اور تقریریں جو عموماً اُن کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوتی تھیں، نہایت مفید، معلومات افزوں اور سیدھے سادے دلنشیں پیرائے میں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ سرسید کے رفقاء نے بھی اُردو ادب کو نئے اسالیب بیاں بخشے۔ حالیؔ نے مسدسِ مدو جزرِ اسلام، مقدمہ شعر و شاعری، حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب جیسی تصانیف پیش کیں۔ آزادؔ نے آبِ حیات، سخن دانِ فارس، نیرنگِ خیال اور دربارِ اکبری ایسے ادبی شہ پارے تخلیق کیے۔ حالیؔ اور آزادؔ ہی نے مل کر جدید قسم کے مشاعروں کا آغاز کیا۔ جن میں نظم گوئی کو ترقی کا موقع ملا۔ شبلی نے موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ، الفاروق و المامون اور شعر العجم جیسی عظیم الشان کتابیں لکھیں۔ نذیر احمد نے توبتہ النصوح، ابن الوقت اور فسانۂ مبتلا لکھ کر اُردو میں ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ مختصر یہ کہ: بقول شیخ محمد اکرام:

''ادبی نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک کے سارے پھل میٹھے تھے۔''

اُردو کا تعلق علی گڑھ تحریک سے اور سرسید سے اور علی گڑھ تحریک کا رشتہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات سے بہت گہرا تھا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ ۲۵ سے ۳۱ دسمبر تک ۱۸۰۰ء تک پونا میں کانگریس کا عام اجلاس ہوا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں

سیاسی بیداری کے آثار دیکھے تو انہوں نے بھی پینترا بدلا اور نام اور "اصلاحات و مراعات" کا بظاہر ایک بہت ہی امید افزا سلسلہ شروع کیا۔ جس کی طرف علامہ اقبالؔ نے بڑے لطیف انداز میں یوں اشارہ کیا ہے:

ہے وہی سازِ کہن کا جمہوری نظام
جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

آ بتاؤں تجھ کو رازِ آیہ ان الملوک
سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یہ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

۱۹۰۶ء میں ہندوستانیوں نے انگریزوں سے "حکومتِ خود اختیاری" کا مطالبہ کیا۔ جس کے جواب میں ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات پیش کی گئیں۔ لارڈ کرزن کی

تقسیم بنگال نے پہلے ہی لوگوں کو بدظن کر رکھا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں چین کا انقلاب وقوع پذیر ہوا اور ۱۹۰۵ء میں جاپان نے روس کو شکست دے دی۔ ان واقعات سے ایشیا بالعموم اور ہندوستان بالخصوص جاگ اُٹھا۔ اس موقع پر دور اندیش ہندوستانی مدبروں، نکتہ رس شاعروں اور ادیبوں نے لوگوں کو خطرے سے باخبر کیا۔ شاعر کے اسی فریضے کی طرف حبیب جونپوری نے بھی اپنی نظم "شاعر" میں اشارہ کیا ہے:

خاک کے ذرّوں کو تنویرِ نظر دیتا ہے وہ
پھول کی پتی کو لوہے کا جگر دیتا ہے وہ

سازشِ بربادیِ عالم جہاں جب بھی ہوئی
ساری دنیا جاگ جاتی ہے خبر دیتا ہے وہ

جب رگِ جمہوریت کو کاٹنے بڑھتا ہے ظلم
بے گناہی صبر کرتی ہے اثر دیتا ہے وہ

عظمتِ آدم سے کر کے منضبط اپنا سخن
غم زدوں کو جرأتِ ذوقِ سفر دیتا ہے وہ

موت کو تسخیر کر کے قوتِ ادراک سے
مردنی چہروں کو جینے کا ہنر دیتا ہے وہ

۱۹۰۶ء کے اواخر میں نواب آف ڈھاکا نواب سلیم اللہ خاں کی دعوت پر منعقد ہونے والے مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجتماع میں ڈھاکا میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سر آغا خان سوم اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں کانگریس نے مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کے اصول کے خلاف سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا موضوع اس وقت کی سیاسی زندگی کا بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔ اس سے قبل جب ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم عمل میں آئی، جس کے نتیجے میں مشرقی بنگال اور آسام کے نئے صوبے میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہوگئی۔

بقول اشتیاق حسین قریشی:

"اس صورتِ حال کے خلاف بنگالی ہندوؤں نے ایسی شورش برپا کی کہ اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

اس لیے مخلوط انتخاب کے ابتدائی تجربات ثابت کر چکے تھے کہ یہ طریق انتخاب مسلمانوں کے لیے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

بیسویں صدی کے عشرۂ اوّل کے اختتام کے قریب چودھری محمد علی کے الفاظ میں عمومی صورتِ حال یہ تھی:

"معدودے چند ایسے مسلمان لیڈر بھی تھے، بالخصوص محمد علی جناح جو اپنے سیاسی معتقدات کے تحت مخلوط انتخاب کے حامی تھے۔ گوپال کرشن گوکھلے جو کانگریس میں اعتدال پسندوں کا لیڈر تھا، جناح اس کے سرگرم نائب تھے۔ اعتدال پسند حضرات سماجی اصلاحات اور بتدریج آئینی ترقی میں یقین رکھتے تھے اور فرقہ بندی سے بالاتر قوم پرستی کے متمنی تھے۔ کانگریس کے اندر انتہا پسندوں میں جن کا لیڈر بال گنگا دھر تلک تھا اور اعتدال پسندوں میں کشمکش رہتی تھی۔ تلک سوراج کا علم بردار تھا اور اس کے حصول کے لیے برطانوی حکومت کے خلاف مسلسل ایجی ٹیشن ضروری سمجھتا تھا۔ وہ شیواجی کی عظمت کے

گن گاتا تھا، جس نے اورنگ زیب کے خلاف جنگیں لڑی تھیں اور ہندوؤں کو جارحانہ وطنیت پر اُبھارتا تھا۔ انداز ہائے فکر اور حکمتِ عملی میں یہ اختلاف کئی برسوں تک مختلف صورتوں میں جاری رہا۔"

صورتِ حال یہ تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کی جب بھی کوئی لہر اُٹھتی تھی، ہندوؤں کی متعصبانہ روش کی تیز دھار اُسے تلوار کی طرح کاٹ کے رکھ دیتی تھی۔ تقسیمِ بنگال سے مشرقی بنگال اور آسام کے مسلمانوں کو اقتصادی ترقی کے جو مواقع حاصل ہوئے تھے، اُن سے مغربی بنگال کے اُن ہندوؤں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں جو مشرقی بنگال کے مسلمان کاشت کاروں کے خون پسینے کی کمائی پر عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ تقسیمِ بنگال کے فیصلے کی ہر سطح پر مخالفت کی گئی۔ تلک اور اُس جیسے دوسرے کانگرسی لیڈروں نے اس مسئلے کو پورے ملک کا مسئلہ بنا دیا۔ ۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم کو کالعدم قرار دے دیا گیا اور مشرقی بنگال کے مسلمان ایک بار پھر ہندوؤں کے محکوم ہوگئے۔

اس پیش منظر میں مسلمانوں کی قومی زندگی میں دو بے حد اہم آوازوں کا اضافہ ہوچکا تھا جو مسلمانوں کے اجتماعی لاشعور کی ترجمانی کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک آواز علامہ محمد اقبالؔ کی تھی، جن کی شاعری نے ملک گیر شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ بقول عزیز احمد:

"اُن شاعروں میں سب سے اہم اور سب سے مقدس نام اقبالؔ کا ہے۔"

محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری کو بھی علامہ اقبالؔ سے عقیدت تھی۔ اسی لیے انہوں نے نظم "علامہ اقبالؔ" کہی:

باتوں میں تھی دلیل، حوالہ سخن میں تھا
تو تھا تو گفتگو کا مزا انجمن میں تھا

قرآن کی فضا میں پلا تھا ترا شعور
اسلام کا مزاج ترے بانکپن میں تھا

جبلِ خزاں کا دور گلوں سے تھا دور دور
جب تک ترا وجود فضائے چمن میں تھا

لکھی وہ داستانِ غمِ دجلہ و فرات
چکھا وہ ذائقہ بھی جو گنگ و جمن میں تھا

سارا سمٹ کے آگیا تیرے کلام میں
جتنا بھی حسن لالہ و سرو و سمن میں تھا

اب اس سے بڑھ کے بس میں ترے تھا بھی کچھ نہیں
ملت کو دے دیا وہ لہو جو بدن میں تھا

راہِ عمل دکھاتا رہا قوم کو مگر
تو مطمئن تھا دل ترا رنج و محن میں تھا

ہر دم مدینہ و نجف و کربلا کی فکر
تیرا کہاں جواب محبت کے فن میں تھا

دوسری آواز ابوالکلام آزاد کی تھی جن کی خطابت اور خطیبانہ تحریروں نے مسلمانوں کے دلوں کو گرما دیا تھا۔

اس صدی کے دوسرے عشرے میں عالمی جنگ کا آغاز اس صدی کا سب سے بڑا واقعہ ثابت ہوا۔ اس جنگ کے دنوں میں ہندو مسلم اتحاد کے تصور کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ دونوں کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوئے اور ان دونوں جماعتوں میں آئینی اصلاحات کے ایک منصوبے پر اتفاق رائے ہوگیا جو "میثاقِ لکھنو" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سمجھوتے میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ حقِ انتخاب کو تسلیم کرلیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے وزیرِ مملکت برائے ہند نے برصغیر میں خود مختار اداروں کے بتدریج فروغ کا مژدہ سنایا۔ اُدھر عالمی جنگ جاری تھی کہ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روس میں بالشریک انقلاب برپا ہوگیا۔ ۱۹۱۸ء میں بالشریک روس جنگ سے علیحدہ ہو گیا۔ ۱۹۱۷ء میں امریکہ بھی جرمنی کے خلاف جنگ میں شامل ہوگیا۔ جنگ جرمنی اور اس کے اتحادیوں کی شکست پر منتج ہوئی۔ ۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی اور اتحادیوں کے درمیان صلح کے عارضی معاہدے پر دستخط ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں معاہدہ ورسیلز کی رو سے جرمنی کو تقریباً تباہ کردیا گیا۔ ایک معاہدے کی رو سے ترکی کو اپنے افریقی مقبوضات شام، فلسطین اور حجاز سے دست بردار ہوجانا پڑا۔ سمرنا اور ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقے یونان کو دے دیئے گئے۔ آرمینیا کو خودمختار ریاست بنادیا گیا۔ درّہ دانیال اور باسفورس کو بین الاقوامی قرار دے دیا گیا اور عثمانی سلطنت جو کبھی دنیا کی عظیم الشان سلطنتوں میں سے ایک تھی، قسطنطنیہ اور کوستان اناطولیہ تک محدود کردی گئی۔ ترکی پر بھاری جنگی تاوان عائد کردیا گیا اور اس پر غیر ملکی نگرانی مسلط کردی گئی۔"

ان واقعات نے برصغیر کے مسلمانوں میں قدرتی طور پر اضطرابِ عظیم پیدا کردیا۔ اس حوالے سے مسلمانانِ برصغیر نے بہت تگ و دو کی۔ ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس

قائم کی گئی۔ جس کے صدر مولانا محمد علی جوہر کے بھائی مولانا شوکت علی قرار پائے۔ مولانا محمد علی کو اس وفد کی سربراہی سونپی گئی، جسے یورپ جا کر فاتحین اور بالخصوص برطانیہ کو خلافت کے مسئلے پر مسلمانوں کے جذبات اور اُن کے نقطۂ نظر سے آگاہ کرنا تھا لیکن ۱۹۲۰ء میں "معاہدہ سیورے" کے ذریعے ترکی کو تباہ کر دیا گیا۔ اس کے حصے بخرے کر کے یورپی ممالک نے آپس میں بانٹ لیے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگرس نے اپنے سالانہ اجلاس، منعقدہ امرتسر میں مسئلۂ خلافت سے گہری ہم دردی کا اظہار کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں خود اعتمادی اور سیاسی شعور پیدا ہوا۔

بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی:

"تحریکِ خلافت کے بعد برصغیر کے مسلمان سیاست دان ایک مختلف زبان بولنے لگے۔ انہوں نے اس خیال تک کو ترک کر دیا کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں یا برطانیہ کے بھروسے ہی پر زندہ رہ سکتے ہیں۔"

اس ضمن میں سید حسن ریاض لکھتے ہیں:

"اگر مسلمان اس تحریک میں حصہ نہ لیتے تو پاکستان کے لیے جنگ کرنے کے قابل ہرگز نہ ہوسکتے۔"

مسلمان علماء کی طرف سے ترکِ موالات کا فتویٰ شائع کیا گیا۔ جس پر پانچ سو دستخط تھے۔ اس فتوے کی رو سے کونسلوں کی ممبری، وکالت، سرکاری کالج، سرکاری گرانٹ، سرکاری مال، آنریری مجسٹریٹی، فوجی اور غیر فوجی ملازمتیں، پیرویٔ مقدمات اور خطابات "موالات" تھے جن کا ترک کرنا مسلمانوں کے لیے فرض ہوگیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں "ترکِ موالات" کا ریزولیشن پاس کیا گیا۔ کانگریس نے اس صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتے میں منعقد کیا۔ اس سے پہلے کانگریس نے عدم تعاون کے سلسلے میں کوئی ریزولیشن پاس نہیں کیا تھا۔ تاہم اس خصوصی اجلاس میں

کانگریس نے نہ صرف عدم تعاون کا ریزولیوشن پاس کیا بلکہ عدم تعاون کا ایک تدریجی پروگرام بھی مرتب کر ڈالا۔ اسی سال مولانا ابو الکلام آزاد نے اور ان سے متفق بعض دوسرے علماء نے تحریکِ ہجرت شروع کردی۔ اسی طرح رولٹ ایکٹ کے خلاف کانگریس کے اجلاس کو روکنے کے لیے امرتسر میں ایسے اقدامات کئے گئے جن کے نتیجے میں "جلیانوالہ باغ" کا الم ناک واقعہ پیش آیا۔ ۱۳۔اپریل ۱۹۱۹ء اس واقعے نے بھی انگریزوں کے خلاف عام جذبات کو مشتعل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی سال تحریکِ خلافت ہی کے سلسلے میں ساحل مالا بار کے مسلمان موپلوں کی بغاوت کا واقعہ پیش آیا۔ موپلوں کا ردِ عمل انگریزوں کے ناروا تشدد کا نتیجہ تھا۔ تاہم جب موپلوں پر قابو پالیا گیا تو اُن پر مظالم کے پہاڑ توڑ دئے گئے۔

تحریکِ عدم تعاون کا ایک اہم جزو "تعلیمی عدمِ تعاون" بھی تھا۔ چناں چہ حکیم اجمل نے جامعہ ملیہ کی دہلی میں بنیاد ڈالی اور بنارس میں ہندو پاٹھ شالہ قائم کی گئی۔ مسلمانوں نے بطور خاص تحریک عدمِ تعاون میں حصہ لیا اور اس کے نتیجے میں سب سے زیادہ نقصان بھی مسلمانوں ہی کو ہوا۔ لارڈ ریڈنگ نے ۱۹۲۱ء میں وائسرائے بننے کے بعد مسلمانوں سے مفاہمت کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف اس کا یہ عزم تھا کہ ہندوستان کا کوئی لیڈر حکومتِ وقت کے خلاف نہ جانے پائے۔ ان حالات کے نتیجے میں بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ مثلاً سول نافرمانی کی تحریک، کم سنی کی شادی روکنے کا بل، شاردا ایکٹ، گول میز کانفرنسیں، ۱۹۳۵ء کا اہم ایکٹ، دوسری جنگِ عظیم، ہندوستان چھوڑ دو تحریک، بنگال کا بھیانک قحط، کیبنٹ مشن، ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کا آزاد ہند فوج کا مقدمہ، سبھاش چندر بوس کی روپوشی، عارضی حکومت کا قیام اور پھر ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو جب آزادی کی صبح مسکرائی۔ بدقسمتی سے یہ مسکراہٹ فرقہ وارانہ فسادات کے صدقے میں انسانی خون کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اس سمندر میں دو جزیرے نظر آرہے تھے:

تقسیم شدہ ہندوستان اور نوزائیدہ پاکستان۔ سید محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری

جو سکتے کے عالم میں یہ سب مناظر دیکھ رہے تھے، اُن لاشوں کو دیکھ کر اب چپ نہ رہ سکے اور پکار اُٹھے۔

صبر کیوں کر ہو دیکھ کر لاشیں
جابجا خون دربدر لاشیں

اپنی جنت الگ بسائیں گی
یہ مسلماں کی معتبر لاشیں

آسماں اُن پہ خون روئے گا
یہ نہ سمجھو ہیں کم اثر لاشیں

دیکھ کر مہروش شہیدوں کو
کرنیں گزری ہیں چوم کر لاشیں

آرزوئے حصولِ مقصد میں
سو رہی ہیں زمیں پہ لاشیں

آج اہلِ نظر نے پھر دیکھا
عرش پہ خون، فرش پہ لاشیں

یہ دکھائیں گی منزلوں کا نشان
جن کو کہتے ہیں بے بصر لاشیں

دیکھتے آئے ہیں یونہی ہم لوگ
عمر بھر دھوپ، عمر بھر لاشیں

مسلمانوں کی جدوجہد جاری تھی، اسی سلسلے میں ڈاکٹر محمود الرحمن لکھتے ہیں:

''سراج الدولہ کی سرکردگی میں مجاہدین کا آزادی کا جو قافلہ ۱۷۵۶ء میں روانہ ہوا تھا وہ سعی وعمل کی مختلف منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کبھی اس کی رہبری حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے اولوالعزم سپہ سالار کرتے رہے اور کبھی سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید جیسے علمائے دین اس کے رہنما بنے۔ کبھی عنانِ قیادت جنرل بخت خاں جیسے صاحب عزم و ہمت کے ہاتھوں میں رہی، کبھی مولانا احمد شاہ سالارِ کارواں بنر اُسے حریفوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتے رہے۔ حتیٰ کہ ہدایت وراہنمائی کا یہ علم جنگِ آزادی کے میدان میں مختلف ہاتھوں سے گزرتا ہوا قائد اعظم محمد علی جناح کے دستِ مبارک تک آپہنچا۔''

سید محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری کی زندگی میں ہندوستان کا جمہوری آئین تیار ہو کر نافذ ہوا، اور پاکستان علیحدہ ہوا۔ بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے کی یہ وہ فضا تھی جس میں حبیبؔ جونپوری کی شخصیت پروان چڑھی۔

خاندانی پس منظر

سید محبوب الحسن حبیبؔ جونپوری کے اجداد میں میر درویش علی ۱۵۵۶ء میں ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ایرانی فوج کے ساتھ وارد ہند ہوئے۔ تحصیل پھول پور ضلع الہ آباد میں میر

درویش علی کو چند ایکڑ قابلِ کاشت زمین ملی، جس کی آمدنی سے گھر کا گزارہ ہوتا تھا۔

امیر احسن اخوند ایرانی فوج کے سالار تھے۔ وہ میر درویش علی کے تجرِ علمی اور زہد وتقویٰ سے بے حد متاثر تھے۔ انہی کی وساطت سے میر صاحب مغل صوبیدار کڑا مانک پور کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔

الہ آباد کے گزیٹر مطبوعہ ۱۹۱۱ء میں درج ہے کہ جب رام چندر بن باس کے سلسلہ میں اپنے اہل و اعیال کے ساتھ دریائے گنگا پار کر کے تربینی کے مقام پر پہنچے تو وہیں قیام کیا۔ اسی وجہ سے یہاں ہر سال میلہ منعقد ہوتا ہے۔

رام چندر کے بیٹے ''کوسا'' نے یہاں ایک مندر تعمیر کیا۔ اب یہ علاقہ پریاگ کہلاتا ہے۔ کالیداس نے میگھوت اور ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اشوک نے ۲۷۲ قبل مسیح یہاں ایک مینار بنوایا جو آج تک موجود ہے۔ کڑا پریاگ سے کچھ فاصلے پر ہندوؤں کی زبردست بستی تھی، وہاں ایک قلعہ ہے جس پر ۱۰۳۶ء کا سن درج ہے۔ محمود غزنوی کے ایک سپہ سالار سا ہو نے ۱۰۰۵ء میں کڑا پر حملہ کرکے اسے تہس نہس کر دیا۔ ۱۱۹۲ء میں غوری کی فوج نے راجہ جے چند کو شکست دے کر کڑا کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۲۵۸ء میں ارسلان خاں کے دور میں کڑا مانک پور سے ملا کر ایک نیا صوبہ بنا دیا گیا۔ بلبن بادشاہ نے اس صوبے میں بڑے رفاہی کام کیے۔ ۱۲۸۶ء میں بلبن کا انتقال ہوگیا اور ۱۲۹۰ء میں جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا۔ اسی سال بلبن کا ایک جرنیل چھجو خاں کڑا کا سلطان بن گیا۔

خلجیوں اور تغلقوں کے دور میں یہاں مختلف صوبیدار آتے جاتے رہے۔ ۱۵۷۵ء میں یہاں کے صوبیدار نے مغلیہ سلطنت کے خلاف بغاوت کردی۔ اکبر خود فوج لے کر کڑا پہنچا۔ بدایونی کہتا ہے کہ اکبر نے صوبیدار کو شکست دے کر پریاگ اور کڑا کے متصل ایک نیا شہر بسایا جس کا نام اللہ باس رکھا گیا۔ مسلمانوں نے باس کی

جگہ باد کر کے اُسے اللہ باد کر دیا جو رفتہ رفتہ الہ آباد ہو گیا۔ اسی الہ آباد کی تحصیل پھول پور جس کا ذکر اوپر بیان ہوا، میں میر درویش علی کو گزر اوقات کے لیے بیس ایکڑ زمین ملی جو حبیب جونپوری کے والد مرحوم مولوی شبیر حسن صفا الہ آبادی تک آتے آتے صرف بیس بیگہ تک رہ گئی۔

خاندانی روایت کے مطابق میر درویش علی عربی اور فارسی زبانوں پر دسترس کامل رکھتے تھے اور اس کے علاوہ علمِ حدیث، علمِ تفسیر، علمِ جفر اور علمِ رمل کے بھی ماہر تھے۔

مقامی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے ان کا اہلِ دربار کے علاوہ عوام سے کوئی رابطہ نہ قائم ہو سکا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ سات آٹھ سال کے بعد شاگردوں کے ذریعے انہیں اتنی اجازت مل گئی کہ نمازِ عصر کے بعد فوجیوں کا اخلاق درست کرتے، ان کی عام بیماریوں کا علاج کرنے اور علمِ رمل اور علمِ جفر کے ذریعے اُن کی پریشانیوں کو حل کرنے کے لیے دربار سے دور وہ کہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اس اجازت کے بعد وہ سہ پہر کو اپنے ایک دوست کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر ہندو اور مسلمان دونوں کے مسائل سنتے اور حل کرتے رہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مغل سرداروں کی سخت گیر پالیسیوں کی وجہ سے وہ کھل کر اپنے اصل عقائد کا اظہار نہ کر سکے۔ ۱۷۶۵ء میں کڑا اور الہ آباد کے ضلع انگریزی عملداری میں آ گئے تو دوسرے اصحاب کی طرح اس خاندان کے افراد نے بھی دینی مشاغل میں کھل کر حصہ لیا۔

میر درویش علی کی چوتھی نسل میں میر مردان علی بڑے جید عالم گزرے ہیں۔ انہیں تاریخ، حدیث اور تفسیر پر پورا عبور حاصل تھا۔ مشہور ہے کہ وہ پہلے شیعہ تھے جو حج کے لیے گئے۔ افسوس ہے کہ اُن کی تمام نگارشات ضائع ہو گئیں اور آج اُن کے تمام اہلِ خانہ کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

پانچویں نسل میں مولوی میر انتظام علی ولد میر حسن علی وہ بزرگ گزرے ہیں، جن کا دنیائے عملیات میں بڑا نام تھا۔ کیپٹن ضامن حسین جلال الہ آبادی انہی کے شاگرد تھے۔ اس خاندان میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اُردو زبان میں خطوط لکھے اور ہندی زبان میں نوحے کہے لیکن مرحوم کا کوئی مطبوعہ کلام دستیاب نہیں ہے۔

حبیبؔ جونپوری کے والد مولوی شبیر حسن ۱۸۸۴ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور بہ سلسلہ ملازمت جونپور آگئے۔

ملک شرق خواجہ جہاں کو صوفیائے کرام سے عقیدت اور عالموں سے محبت تھی۔ اس لیے پورے ہندوستان سے علماء اور دانشور یہاں آکر آباد ہوگئے تھے، اُن میں ابوالفتح سن برسا بھی تھے۔ اُن کا مزار محلہ سپاہ میں آج بھی موجود ہے۔ یہ اپنے زمانے کے مانے ہوئے صاحب حکمت اور صاحب کرامت تھے۔ ان کی کرامات دیکھ کر اکثر ہندو مسلمان ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہندو راجہ نے اُن کو اس عمل سے باز رکھنے کے لیے کچھ سونا ارسال کیا، جسے انہوں نے واپس کرتے ہوئے دعا کی۔ اُسی وقت سونے کی ڈلیوں کی بارش ہونے لگی۔ جس مقام پر سونا برسا تھا، اُس کا نام ہی سونا برسا جو بگڑ کر سن برسا ہوگیا اور آج تک اُس جگہ کا یہی نام ہے۔

ابوالفتح سن برسا کی اولاد میں میر محمد محسن کی اکلوتی بیٹی صدیقہ بانو سے مولوی شبیر حسن (والد محبوب الحسن) کی ۱۹۱۳ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں ایک لڑکی واقیہ بانو پیدا ہوئی جو دوسال کے بعد انتقال کر گئی۔ مولوی شبیر حسن نے درگاہِ رب العزت میں دعا مانگی کہ اب اگر لڑکا پیدا ہوا تو اُسے عالمِ دین بناؤں گا، ان کی دعا مستجاب ہوئی اور ۱۸ مارچ ۱۹۱۶ء میں مولوی محبوب الحسن حبیبؔ جون پوری پیدا ہوئے۔ ان کا شجرۂ نسب جو کہ اُن کے چھوٹے بھائی محترم سید وحید الحسن ہاشمی صاحب نے عنایت کیا، مندرجہ ذیل ہے۔

نام اور ابتدائی تعلیم

حبیبؔ جونپوری کا اصل نام سید محبوب الحسن تھا اور حبیبؔ جونپوری شاعری میں استعمال کرتے تھے۔ اُن کے والدِ گرامی سید شبیر حسن خود بھی شاعر تھے اور صفاؔ الہ آبادی تخلص فرماتے تھے۔

اس دور کے عام رواج کے مطابق محبوب الحسن نے دینیات اور ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ سید محمد محسن سید شبیر حسن کے عزیزوں میں سے تھے اور محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ انہیں قوم کی تعلیم کا بڑا خیال رہتا تھا، اسی خیال کے تحت انہوں نے دس بارہ بچوں پر مشتمل اپنے گھر محلہ سپاہ جونپور، جس کو حبیبؔ جونپوری نے جنت الماوٰئی کہا ہے اور اپنی رباعیات میں اُس کا اس طرح ذکر کیا ہے:

شاعروں کی مطمئن دنیا میں شامل ہوگیا
ماہِ نو اُبھرا ابھر کر بدرِ کامل ہوگیا
ممتحن ہوں شاعرانِ بے بدل کا میں حبیبؔ
جنت الماوٰئی کو سب پر فوق حاصل ہوگیا

یہ تو کہہ سکتا نہیں ہوں میں کہ ماہر ہوگیا
شعر کہہ لینے پہ لیکن اب تو قادر ہوگیا
میرا مولد بن گیا ہے مرکزِ علم و ادب
بچہ بچہ جنت الماوٰئی کا شاعر ہوگیا

غنچہ غنچہ جام بر کف ہر کلی مے نوش ہے

لکہ لکہ ابر کا اک میکدہ بردوش ہے

تربیت میں میری شامل خود دو عالم ہے حبیب

جنت الماویٰ ہے جھولا اور فلک آغوش ہے

اسی جنت الماویٰ میں ایک مکتب خانہ کھولا اور بیگم گنج کی امام بارگاہ کے مولوی ہادی حسین کو دس پندرہ روپے ماہوار پر استاد مقرر کیا۔ اسی مکتب میں محبوب صاحب نے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مولوی ہادی حسین بڑے سخت گیر تھے اور ذرا ذرا سی کوتاہی پر طلباء کو سخت سزائیں دیتے تھے چونکہ شرارت میں محبوب الحسن اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اس لیے دوبارانہیں سزا بھی ملی۔

ادھر مولوی صاحب اپنی سخت گیر پالیسی پر گامزن تھے۔ ادھر طلبا نے بے سوچ سمجھے مدرسے سے غائب ہونا شروع کردیا۔ محبوب الحسن نے ایک دن موقع پاکر چپکے سے وہ بید غائب کردی جس سے مولوی صاحب اپنی سزا کا ہنر دکھاتے تھے۔ مولوی صاحب تاڑ گئے کہ یہ کام محبوب الحسن کا ہے۔ جب ان کے والد مولوی شبیر حسن سے شکایت کی گئی تو موصوف نے بڑی صفائی سے یہ کہہ کر اقرار کرلیا کہ مولوی صاحب کی مار سے طلبہ پڑھائی سے بددل ہو کر مکتب سے غیر حاضر ہو جاتے ہیں، اس دن سے مولوی صاحب نے سزا دینا بند کردی۔

دو تین سال کے عرصے میں مولوی صاحب نے بیس تک کا پہاڑا، اردو کی دوسری تیسری کتاب، نماز اور اس کے مسائل جوڑ، باقی، ضرب، تقسیم اور اعشاریہ کی مشقیں ختم کرادیں۔ تمام طلباء نے اس عرصے میں ناظرہ قرآن پڑھ لیا اور بعض طلباء کو جن میں محبوب الحسن بھی شامل تھے پندرہ مختصر سورتیں زبانی یاد ہوگئیں۔

جب سید محمد محسن نے شیعہ اسکول کی بنیاد رکھی تو اس میں کچھ طلباء انگریزی

پڑھنے چلے گئے۔ پروفیسر اقبال حسین کے بھائی ابو محمد، محبوب الحسن اور قربان علی ناصریہ اسکول جونپور میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہوگئے۔ اس مدرسے میں محبوب الحسن کے داخلے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جناب اعلم العلماء مولانا سبطِ حسین مرحوم نے مولوی شبیر حسن کو رائے دی تھی کہ اس بچے کو عربی کی تعلیم دلائیں۔ بڑا ہو کر ایک اچھا اور ہونہار مقرر بنے گا۔ مولوی شبیر حسن مولانا مرحوم کے فنِ شعر میں شاگرد تھے۔ اس لیے وہ اپنے استاد محترم کا کہا ٹال نہیں سکتے تھے۔ اس وقت ناصریہ مدرسے میں بڑے پائے کے عالم تھے جنھوں نے پوری محنت اور جانفشانی سے ان طلبہ کو فقہ، حدیث اور علم الکلام کی تعلیم دی۔ مولانا شبیر فیض آبادی مرحوم بڑے پائے کے عالم تھے۔ علمِ فقہ میں ان کا جواب نہ تھا۔ مولوی شبیر حسن سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ اس لیے انہوں نے محبوب الحسن کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اس توجہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ محبوب الحسن بڑے خوش الحان تھے۔ انہیں اساتذہ کے قصائد، سلام اور نوحے از بر تھے۔ وہ محلے کی انجمن کے صاحبِ بیاض بھی تھے اور نئی نئی دھنوں سے نوحہ پڑھنے میں ان کا اس وقت کوئی جواب نہ تھا۔ ناصریہ مدرسے میں ۱۵ شعبان کو ہر سال ایک عالیشان محفل ہوتی تھی اس محفل میں محبوب الحسن بھی اپنے والد سے دس بارہ اشعار لے کر جب ترنم سے پڑھتے تھے تو محفل کے لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔ مدرسے کے اساتذہ اس لیے بھی محبوب الحسن سے خوش تھے اور ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ بہر حال ۱۹۲۹ء تک انہوں نے علوم کی کئی منزلیں طے کرلیں۔ بقول پروفیسر ذوالفقار حسین ہاشمی، ''انہوں نے تعلیم کی ستائیس اسناد حاصل کیں۔''

محبوب الحسن کی نانی کی تربیت

محبوب الحسن کی تعلیم و تربیت میں ان کی نانی سیدہ بانو بی بی مرحومہ کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ چونکہ یہ مرحومہ کے پہلے نواسے تھے اس لیے ماں سے زیادہ انہیں اپنی نانی مرحومہ

سے شفقت و محبت ملی۔ وہ پوتوں کے مقابلے میں نواسے کو زیادہ پیار کرتی تھیں اور ان کے ناز اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھیں۔ وہ بھی انہیں کے پاس رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ صرف رات کے وقت اپنی والدہ کے پاس آجاتے تھے۔ مرحومہ خود عالمہ اور تہجد گزار تھیں۔ اس لیے نواسے کو بھی عجیب عجیب ترغیبوں سے دینی مسائل سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔ محبوب الحسن کو جو زیادہ قرآنی سورتیں یاد ہوگئی تھیں وہ انہیں پاک نہاد مرحومہ کا فیض تھا۔ ایک بار وہ شدید بیمار ہوگئے، مرحومہ مسجدوں اور امام بارگاہوں میں جاجا کر دعائیں مانگتی تھیں۔ جب نواسہ صحت یاب ہوا تو ڈھیروں منتیں چڑھائیں اور چونکہ محبوب صاحب کے دادا دادی کا انتقال ان کی پیدائش سے قبل الہ آباد میں ہو چکا تھا اس لیے ان کا رجحان ننھیال کی طرف ہونا فطری تھا۔ یہی سبب تھا کہ بڑے ہوکر انہوں نے اپنے تخلص کے ساتھ جونپوری کا لاحقہ استعمال کیا حالانکہ ان کے والد اپنے تخلص کے ساتھ الہ آبادی لکھتے تھے۔

لکھنو میں تعلیم

محبوب صاحب کے والد ۱۹۲۶ء میں زیارت کربلا کے لیے عراق جانے لگے تو لکھنؤ میں اپنے عزیز سید کاظم حسین ایڈووکیٹ کے سپرد محبوب الحسن کو کر گئے۔ ان کی وساطت سے محبوب صاحب نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ لکھنو میں قیام کے دوران وہاں انہوں نے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کی اسناد حاصل کیں۔ اس کے بعد فارسی میں منشی، منشی کامل اور منشی فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ اسی طرح عربی میں مولوی، عالم اور مولوی فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ ان اسناد کے حصول کا زمانہ ۱۹۳۷ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔

سلطان المدارس لکھنو میں محبوب الحسن صدر فاضل میں تھے اور مرتضیٰ حسین جو کہ ایک بڑے عالم فاضل شخص تھے، محبوب الحسن سے جونیئر تھے تو اکثر جب ان کی کلاس میں ٹیچر موجود نہیں ہوتا تھا تو وہ طلبہ کو پڑھا بھی دیا کرتے تھے۔ اکثر جب بار طلبا مختلف

انجمنوں کے صدر ہوا کرتے تھے اور ان کے لیڈر ہوتے تھے۔ اسی دور میں لکھنو میں انہوں نے یہ اشعار کہے:

ہم ترے تارے نہیں اے آسمانِ لکھنو
ہم ترے غنچے نہیں اے گلستانِ لکھنو

ہیں کہاں آئیں ذرا نام آوارانِ لکھنو
لکھنو میں لٹ رہے ہیں میہمانِ لکھنو

وقت بیداری کا ہے بیدار ہونا چاہئے
آگیا دامن پہ جو دھبہ وہ دھونا چاہئے

شبلی کالج اعظم گڑھ میں ایک تقریری مقابلہ ہوا، جس کا عنوان تھا ''اس متشدد دنیا میں عدم تشدد ممکن ہے یا نہیں'' اس عنوان کے حق اور مخالفت میں تقاریر کی گئیں۔ حق میں تقریر ذوالفقار حسین ہاشمی نے کی اور مخالفت میں مصطفیٰ کاظم نے۔ ذوالفقار ہاشمی کو پہلا انعام ملا اور مصطفیٰ کاظم کو دوسرا۔ یہ دونوں تقاریر جو ان صاحبان نے کی تھیں محبوب الحسن نے ہی انہیں لکھ کر دی تھیں اور ہر طرف یہ دھوم مچ گئی تھی کہ ان تقاریر میں جتنی اچھی عمدہ اردو کا استعمال کیا گیا اور جیسی جیسی نادر تشبیہات و معقولات کو استعمال کیا گیا وہ شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

بچپن کے کھیل

محبوب الحسن کو تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیلوں سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ہاکی، فٹ بال، والی بال وغیرہ میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ انہیں بیت بازی کا بھی بڑا شوق تھا۔ انہوں

نے بچپن ہی سے اساتذہ کے مشہور اور نایاب اشعار یاد کر لئے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے خود غزل کہی اور پڑھی۔ فنِ تقریر میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ تقریر کا فن انہیں کلب عباس ایڈووکیٹ اور کلب مصطفیٰ سے ملا تھا۔ جہاں کلب عباس ایڈووکیٹ تقریر کرتے تھے محبوب الحسن کا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ وہ اکثر نہج البلاغہ، نہج الفصاحت، آبِ حیات، دربارِ حیات، دربارِ اکبری، عرفی قاآنی، حافظ اور سعدی شیرازی کے دیوانوں سے جملے اور اشعار زبانی یاد کرتے تھے اور ان کی بدولت اپنی تقاریر میں زور اور برجستگی پیدا کرتے تھے۔

شادی

محبوب الحسن کی متاہلانہ زندگی کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۳۳ء میں بعمر ۱۶ سال مولوی مہدی علی مرحوم کی دختر کنیز زہرا سے ان کی پہلی شادی ہوئی۔ ان سے پہلی اولاد میں ۱۹۳۵ء میں مولانا سید محمد باقر زیدی پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں ان کی دوسری شادی سید فتح علی کی چھوٹی بیٹی سیدہ مشتاق فاطمہ سے انجام پائی۔ باقر زیدی صاحب کے علاوہ محبوب الحسن کے تین صاحبزادے سید معصوم رضا، سید منقاد حیدر اختر ہاشمی اور سید منصور حیدر ہیں۔ صاحبزادیوں کے نام سیدہ شمیم فاطمہ اور سیدہ اعجاز فاطمہ ہیں۔

ملازمت

۱۹۳۷ء میں الہ آباد کے ایک اسکول میں عربی فارسی کے مدرس کی حیثیت سے ملازمت کی۔ بعد میں ضلع جالون کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں اُنہی مضامین کے مدرس مقرر ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں لیبر آفیسر ہو کر کلکتہ چلے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں سید سجاد حیدر یلدرم کے شہر نٹور کے ایک اسکول میں عربی فارسی کے مدرس کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۸ء

میں نیشنل انٹر کالج موددہا ضلع ہمیر پور میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں ترکِ وطن کر کے لاہور آ گئے جہاں پہلے سے ہی ان کے بھائی سید وحید الحسن ہاشمی اور دیگر اعزہ موجود تھے۔ اسی سال گورنمنٹ ہائی اسکول آر۔ اے بازار جو کہ پہلے سی بی مڈل تھا اور بعد میں ۱۹۶۵ء میں یہ عابد مجید فیڈرل گورنمنٹ ہائی اسکول ہوگیا، میں عربی فارسی کے ٹیچر ہوگئے۔ وہاں جب تک سروس کی وہاں کی تعلیمی سرگرمیوں مثلاً ٹائم ٹیبل بنانا، تمام پیپرز کی ڈیٹ شیٹ تیار کرنا، پیریڈز کی ترتیب بنانا اور ادبی سرگرمیوں مثلاً بزمِ ادب میں تقاریر کرنا اور بچوں کو تقاریر لکھ کر دینا اور ان کے درمیان تقریری مقابلے کروانا، سب انہی کے ذمے تھا۔ وہ ان تمام نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے کرتا دھرتا تھے۔ کوئی ڈائریکٹر یا منسٹر آتا تو اسکول میں ہر طرح کے انتظامات وہی کرتے تھے۔ چودھری مشتاق احمد جو کہ وہاں کے ہیڈ ماسٹر تھے، اُن سے محبوب الحسن کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ دونوں میں بہت دوستانہ تھا اور ہیڈ ماسٹر صاحب ان کی بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں بے حد پسند کرتے تھے۔ ۱۹۷۶ء میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز رہ کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

جمال پروین وارثی جو کہ بیدم شاہ وارثی کی پوتی ہیں کے بقول:

"جب وہ آر۔ اے بازار میں تھے تو آر۔ اے بازار کا بچہ بچہ شاعر بن گیا۔ وہ اسٹوڈنٹس کو نظمیں اور غزلیں لکھ لکھ کر دیا کرتے تھے۔"

اور بزمِ آرزو کی بھی بنیاد رکھی اور انھیں فی البدیع اشعار کہنے میں ملکہ حاصل تھا۔"

مین مارکیٹ گلبرگ میں جہاں اب رحیم پلازہ بن گیا ہے پہلے اس میں تیسری منزل پر گلبرگ کالج ہوتا تھا۔ محبوب الحسن نے کچھ عرصہ شام کے وقت اسٹوڈنٹس کو عربی فارسی اور اردو پڑھایا۔ وہاں کے اسٹوڈنٹس ان کے پڑھانے سے عربی اور فارسی کے اچھے خاصے ماہر ہوگئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ محبوب الحسن ہی انہیں پڑھائیں مگر کچھ عرصہ پڑھانے کے بعد محبوب صاحب نے وہاں پڑھانا چھوڑ دیا کیونکہ تیسری منزل پر ان سے

پڑھا نہیں جاتا تھا اور تھک جاتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے وہاں پڑھانا چھوڑا۔ جدید کالج نسبت روڈ پر بچوں کو مفت ٹیوشن بھی پڑھاتے رہے۔ سید ظہور حسن کاظمی جو کہ واسا میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ B.A میں ان کے شاگرد تھے۔ ذوالفقار حسین ہاشمی نے منشی فاضل گلبرگ ہائی اسکول سے کیا اور محبوب الحسن نے ہی انہیں پڑھایا۔ جمال پروین وارثی ہفتم سے انٹر تک ان کی اسٹوڈنٹس رہیں۔ جمال پروین وارثی شاعری کرتی تھیں، اس میں انہیں اصلاح بھی دیتے تھے۔

حبیبؔ جونپوری کا مذہب

محبوب الحسن ہاشمی سید تھے اور آئمہ اثنا عشری پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کے متعدد اشعار، نعت، قصائد، سلام اور رباعیات سے بھی ان کے مذہبی عقائد کا اظہار ہوتا ہے۔ خدا کے بعد حضور ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیؐ کے مداح تھے اور حضرت علیؑ سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ حضرت علیؑ کی شان میں پانچ قصائد لکھے:

(۱) قصیدہ در مدح ساقیِ کوثر حضرت علیؑ

(۲) قصیدہ در مدح حیدر کرارؑ

(۳) قصیدہ در مدح علیؑ عقدہ کشا

(۴) قصیدہ در مدح حضرت علی

(۵) جشنِ غدیر

اس کے علاوہ ان کی شان میں بے شمار قصائد اور رباعیات لکھیں مثلاً:

زبان ہو بند مگر حسرتِ دلی نکلے
مرے مزار سے یارب ولی ولی نکلے

فرشتے قبر میں پوچھیں جو رشتۂ الفت
دہانِ تار سے یارب علیؑ علیؑ نکلے

دیکھنے والو! جمالِ قمر آرا دیکھو
آج کعبے میں امامت کا نظارا دیکھو
بیچ میں نورِ علیؑ گرد بتوں کا حلقہ
کالے بادل میں چمکتا ہوا تارا دیکھو

مشکل کی ہر اک مشکل پہ میرا ہے تصرف
مجھ کو یہ سند شاہِ ولایت سے ملی ہے
خود کوئی نہ گل اور نہ کلی بنتا ہے
اللہ بنائے تو ولی بنتا ہے
طاعت ہو، شجاعت ہو، یقین ہو، دل ہو
یہ وصف جو یکجا ہوں تو علیؑ بنتا ہے

حضرت محمدؐ اور حضرت فاطمہؑ کے متعلق اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

اوّل کے محمد کو نبوت دے دی
اوسط کے محمد کو امامت دے دی
آخر کے محمد کو خدا کیا دیتا
کچھ دن کو سبھی اپنی ہی غیبت دے دی

در پہ زہراؑ کے اگر کوئی بھی عزت پا جائے
پھر تو بن مانگے ہی دنیا میں وہ جنت پا جائے
صدقے کیا چیز ہے آغوشِ جنابِ زہراؑ
اس میں پل جائے جو بچہ وہ امامت پا جائے

ایک قصیدہ حضرت امام حسنؑ، ایک حضرت امام حسینؑ، ایک حضرت مہدیؑ آخر الزماں کے نام لکھا۔ حضرت امام حسینؑ کے متعلق اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

لہو سے سارے زمانے کو لالہ زار کریں
حسینؑ آئیں تو اسلام استوار کریں
تھپیڑے کھائے گی کشتی تو کون روکے گا
نبیؐ سے کہہ دو نواسے کا انتظار کریں

چہار دہ معصومینؑ سے محبت و عقیدت حبیبؔ کی رباعیات اور قصائد اور مختلف اشعار سے واضح ہے۔ ان کی ہمیشہ کوشش رہتی تھی کہ وہ دامنِ اہلِ بیت سے منسلک رہیں اور جید علمائے کرام اور مجتہدِ عظام کے نظریۂ حیات کی پابندی کریں۔

حبیبؔ جونپوری کے پسندیدہ کھانے

انہیں کھانے میں دال چاول، (رائتہ، اچار، سلاد ہر کھانے میں پسند کرتے تھے) پسند تھے۔ اگر کبھی سبزی بنتی تو اس میں گوشت یا چکن ضرور ڈلواتے تھے اور ساتھ میٹھا (Sweet Dish) ہر کھانے میں ضرور لیتے تھے۔ چائے کے بے حد شوقین تھے۔ اٹھتے بیٹھتے چائے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ اگر چائے پی لیتے تو پھر انہیں کھانے کی بھی

پروا نہیں رہتی تھی۔ وہ چائے پیتے جاتے اور شاعری کیے جاتے، کباب چکن کے پسند کرتے تھے اور ساتھ ٹماٹر کی چٹنی لیتے تھے۔

لباس

سادہ لباس پسند کرتے تھے۔ عموماً پاجامہ کرتا استعمال کرتے تھے۔ سر پر جناح کیپ استعمال کرتے تھے۔ کلکتہ میں جب سروس کی، اس وقت پینٹ شرٹ بھی استعمال کی۔ شیروانی کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔ حبیب جونپوری مشرق سے محبت کرتے تھے، اس لیے زندگی بھر مشرقی لباس ہی کو ترجیح دی۔ مشرقی روایات کی ہمیشہ پاس داری کی۔ وہ چیخ چیخ کر گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ بہت آرام اور دھیمے لہجے میں گفتگو کیا کرتے تھے جو سننے والوں پر اثر کرتا تھا، لیکن تقریر بہت باوقار انداز سے کرتے تھے۔ شعر کو ترنم سے سنانا پسند کرتے تھے کیونکہ خوش گلو تھے اور سامعین کی فرمائش بھی یہی ہوتی تھی۔ جسمانی لحاظ سے اونچے قد کاٹھ کے مالک تھے، کم عمری میں بھی بڑے دکھائی دیتے تھے۔ چہرہ گول، ہونٹ باریک تھے۔ ناک اونچی اور خوبصورت تھی، رنگ گندمی تھا، پیشانی کشادہ تھی۔ مونچھیں داڑھی سے متصل تھیں۔ داڑھی گول ٹھوڑی کے ساتھ ساتھ تھی۔

بطور بیٹے، والد، بھائی شوہر اور دوست

وہ ایک با ادب بیٹے تھے، والد اور والدہ کا خیال رکھنے والے۔ مشفق والد، ہمدرد استاد، مایہ ناز ادیب، بہترین مقرر، مشہور شاعر، صاحب دیوان، ممتاز ماہر تعلیم اور مسلم ماہر عملیات تھے۔ وہ ایک ہمدرد بھائی تھے، اپنے سب بھائیوں کا خیال رکھتے تھے اور جس وقت حبیب جونپوری کے والد کی نوکری ختم ہوئی، اس وقت انہوں نے اپنے سب گھر والوں کا بار اٹھایا۔

۱۹۵۹ء میں ذوالفقار حسین ہاشمی کو .TB. اور وہ دو تین ماہ گلاب دیوی ہسپتال میں داخل رہے تو محبوب الحسن روزانہ سائیکل پر گلاب دیوی بھائی کی عیادت کو جاتے تھے اور ساتھ پھل اور دودھ بھی روز لاتے تھے۔

محبوب الحسن ہاشمی ایک ہمہ صفت انسان تھے۔ فارسی، عربی، اردو اور دینی علوم کے ماہر اور عالم ہونے کے علاوہ ایک شعلہ نوا مقرر، اعلیٰ درجے کے شاعر، نہایت خوش خلق اور ملنسار تھے۔

بقول وحید الحسن ہاشمی صاحب:

''وہ عالم بھی تھے، عامل بھی، مقرر بھی تھے اور شاعر بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی۔

ڈاکٹر اختر ہاشمی:

''وہ ایک مشفق والد، ہمدرد استاد، مایہ ناز ادیب، بہترین مقرر، مشہور شاعر، صاحب دیوان، ممتاز ماہر تعلیم اور مسلم ماہر عملیات تھے۔''

دوست ایسے تھے کہ جب کسی دوست کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، انہوں نے ہر طرح سے اس کی مدد کی۔

جمال پروین وارثی اور مہتاب علی شاہ نے بتایا کہ جب ان کے دوست اجمل نے بک ڈپو کھولا تو انہوں نے پوری طرح سے اس کی مالی معاونت کی اور آر۔ اے بازار کے تمام بچوں کو ہر طرح کی سٹیشنری وہاں سے لینے کے لیے راضی کیا تا کہ اس کا بک ڈپو ترقی کر سکے اور اس کے لیے محبوب الحسن کی ہر طرح کی معاونت کی وجہ سے ایک سال کے اندر اندر اچھی خاصی ترقی کر لی اور بک ڈپو خوب چلنے لگا۔

جیل میں جانا

برصغیر پاک و ہند میں تیسری دہائی تک آزادیٔ وطن کی تحریک بہت زور پکڑ چکی تھی، اس وقت کے نوجوان اپنے اپنے میلانِ طبع کے مطابق اس سے متاثر تھے اور بقول سجاد ظہیر:

"تاریخ شاہد ہے وہ رجعت پرست حکمرانوں اور بر خود غلط حکومتوں نے سچائی کی آواز کو ہمیشہ جبر اور تشدد کے ذریعے دبانے کی کوشش کی ہے۔ آزاد ذہن، راست گو زبان اور بے باک قلم کو اگر وہ خرید نہیں سکے اور مرعوب نہیں کر سکے تو انھوں نے آہنی زنجیر اور سلاخ، زہر کے پیالے اور جلاد کی تلوار سے کام لیا۔"

اسی سچائی کا سامنا سید محبوب الحسن کو بھی کرنا پڑا، اور وہ بھی کانگریس کی مخالفت میں دو ماہ جیل میں رہے۔

آرزوؔ لکھنوی کا شاگرد ہونا

شاعری کا شوق چونکہ محبوب الحسن کو بچپن سے تھا اس لیے لکھنو میں لکھنو کے نامور شاعر آرزوؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ جیسا کہ پروفیسر سحرؔ انصاری اپنے مضمون "حبِ حبیبؔ" میں لکھتے ہیں:

"لکھنو میں قیام کے دوران وہاں کے ادبی ماحول سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی اور آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔"

بزمِ آرزوؔ کی بنیاد رکھنا

لاہور میں قیام کے دوران محبوب الحسن نے حقِ شاگردی ادا کرتے ہوئے بزمِ

آرزو کی بنیاد رکھی اور ان کی ادبی روایت کو بڑھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

وامق جونپوری سے دوستی

۱۹۲۸ء میں وامق جونپوری سے دوستی ہوئی۔ بقول وحید الحسن ہاشمی:

''بھائی صاحب مرحوم کی وامق جونپوری سے صرف شناسائی تھی لیکن ۱۹۲۸ء میں قیامِ لکھنو کے زمانے میں گہری دوستی ہوگئی۔ اس کی نظم ''بھوکا ہے بنگال'' سے متاثر ہو کر انہوں نے بھی...... ایک نظم ''فرنگی'' کے عنوان سے کہی۔''

سردار جعفری اور کیفی اعظمی سے دوستی

۱۹۳۶ء میں حبیب جونپوری کی سردار جعفری اور کیفی اعظمی سے دوستی ہوئی۔

بقول وحید الحسن ہاشمی:

''۱۹۳۶ء میں مرحوم کا کیفی اعظمی اور سردار جعفری سے میل جول بڑھا تو ان کی شاعری میں سیاسی رنگ آنا شروع ہوگیا۔''

حسین اعظمی صاحب لکھتے ہیں:

''کراچی میں میری ان سے حسینیہ سجادیہ امام بارگاہ میں دو مرتبہ ملاقات ہوئی، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے درس و تدریس اور شاعری کا سلسلہ ترک کر کے عملیات کی راہ کیوں اختیار کی، تو انہوں نے بڑے افسردہ لہجے میں فرمایا، بھائی اکیلا چنا بھاڑ نہیں جھونک سکتا۔ اب نہ مجھ میں حوصلہ ہے، نہ توانائی، نہ وسائل ہیں، جن کی مدد سے میں کوئی اصلاحی تحریک چلا سکوں۔ عمر کی آخری منزل میں ہوں، اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ پریشان حال اور مصیبت زدہ لوگوں کی پریشانیوں کا قرآنی عملیات اور

آئمہ معصومین کے وظائف کے ذریعے ازالہ کرنے کی کوشش کروں، مجھے خوشی ہے کہ میری یہ کوشش کامیاب رہی جس کا اندازہ آپ یہاں کے آنے والے لوگوں کی روز افزوں تعداد سے لگا سکتے ہیں۔

شاعری کا آغاز وارتقاء

جب محبوب الحسن نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو انہیں مولوی شبیر حسن صفا الہ آبادی جیسا ادب آموز باپ اور آرزو لکھنوی سا شفیق اور سخن فہم استاد ملا۔

مولوی شبیر حسن خود بڑے شاعر تھے، انہوں نے فارسی، اردو اور ہندی میں تقریباً تیس ہزار اشعار کہے اور اب تک دس ہزار اشعار شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں جتنا کلام شائع ہو چکا ہے،اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔اشکِ غم (نوحوں کا مجموعہ)

۲۔صحیفۂ غم (نوحوں کا مجموعہ)

۳۔صحیفۂ عقبیٰ (نوحوں کا مجموعہ)

۴۔ منظوم سوانحِ عمری امام موسیٰ کاظمؑ

۵۔ منظوم سوانحِ عمری امام محمد تقیؑ

۶۔ منظوم سوانحِ عمری امام رضاؑ

۷۔ منظوم سوانحِ عمری امام زمانہؑ

۸۔ منظوم سوانحِ عمری جناب سلمان فارسیؓ

۹۔ منظوم سوانحِ عمری جناب عون بن علیؑ

۱۰۔ منظوم سوانحِ عمری حبیب ابن مظاہرؓ

۱۱۔ منظوم سوانحِ عمری نافع بن ہلال

۱۲۔ منظوم سوانحِ عمری ہلال بن نافع

۱۳۔ منظوم سوانحِ عمری کمیل ابنِ زیاد

۱۴۔ منظوم سوانحِ عمری جابر ابنِ عبداللہ

۱۵۔ کربلا والے (سلاموں کا مجموعہ)

آپ غزل میں صفؔا اور نوحے سلام میں حیدرؔ تخلص استعمال کرتے تھے۔ محبوب الحسن نے شاعری کا جذبہ وراثت میں پایا تھا۔

حبیبؔ جونپوری اپنی نظر میں

حبیبؔ جونپوری نے ہمیشہ ایک مسلسل جدوجہد کرتے ہوئے زندگی بسر کی، ہمیشہ محنت کی، انہیں اس سلسلے میں بے شمار تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اپنے صبر و استقلال سے انہوں نے زندگی کی دقتوں کا سامنا کیا اور اپنے خطوط میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''میری مثال ایک دور افتادہ پتھر کی سی ہے جو سرِ راہ پڑا ہوا ہے اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھا کر بھی اپنی کیفیت پر قانع ہے۔ استدادِ زمانہ نے اسے صبر کی دولت سے مالا مال کردیا ہے۔ مرور ایام نے اپنے عطیات سے نوازا ہے۔ کبھی ضبط کی سوغات پیش کردی، کبھی استقلال کا درس دیا، کبھی سکون کا تحفہ مرحمت فرمایا، کبھی ہمت کا ارمغان عطا کیا۔ ان عطایت نے اسے جاذبِ نظر بنادیا۔ کوئی اسے مندر میں رکھ کر پوجنے لگا، کسی نے قابلِ اعتناء نہ سمجھا، پجاری کی عزت افزائی کے باوجود ہمیشہ اپنی حقیقت پر ناظر رہا۔''

اسی طرح اپنے متعلق لکھتے ہیں:

"میری فطرت پیرانہ سالی کے باعث نہیں بلکہ ابتداء ہی فقیرانہ رہی ہے۔ نہ غمِ زرد، نہ غمِ کالا۔ میری طبیعت دعا گو ہے میری دعا سلامت روی ہے "خاموشی بہترین شغل ہے، خلوص میری روح، ہمدردی میرا شیوہ، صاف گوئی میرا طریقہ ہے۔ متانت و سنجیدگی میرا پیشہ ہے، نہ امیروں کی خوشامد، نہ غریبوں سے دامن کشی بلکہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اس کے باوجود دنیا متکبر سمجھتی ہے۔ نہ میں نے دولت کا رعب ڈالا، نہ صلاحیت کا ڈنکا بجایا، نہ قابلیت کا غازہ ملا، انتہا یہ ہے کہ میرے قریبی دوستوں کو بھی یہ معلوم نہیں کہ میری تعلیمی استعداد کیا ہے، اس لیے کہ میرا نظریہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ:

مشک آنست خود ببوید نے کہ عطار بگوید

میری کم آمیزی نے مجھے اس خطاب کا مستحق گردانا ہے۔ میں اپنی اس کمزوری سے واقف ہوں، لیکن اتنی فرصت نہیں مشاغل سے، یہ مشاغل اب طبیعتِ ثانیہ بن چکے ہیں، ان سے روگردانی کے مترادف ہے، اس لیے مجبور ہوں انہیں ترک نہیں کر سکتا۔"

شاعرانہ تعلّی کی روایت میرؔ و سوداؔ، غالبؔ، شیفتہؔ، اکبرؔ اور آرزوؔ لکھنوی سے ہوتے ہوئے حبیبؔ جونپوری تک پہنچی اور حبیبؔ جونپوری کے ہاں بے شمار قطعات ایسے ہیں جن میں شاعرانہ تعلّی سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً یہ قطعہ دیکھیں:

خیال سب کا ہے اپنی نظیر ہم بھی ہیں
ادب کی جان، سخن کے امیر ہم بھی ہیں

جنوں زدوں نے بنائی ہے مل کے راہِ عمل

اسی لکیر کے ہاں ہاں فقیر ہم بھی ہیں

(کلیاتِ حبیبؔ۔ ص ۱۵۶)

ایک اور قطعہ میں اپنی شعر کہہ لینے کی قابلیت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

یہ تو کہہ سکتا نہیں ہوں میں کہ ماہر ہوگیا

شعر کہہ لینے پہ لیکن اب تو قادر ہوگیا

میرا مولد بن گیا ہے مرکزِ علم و ادب

بچہ بچہ جنت الماویٰ کا شاعر ہوگیا

(کلیاتِ حبیب، ص ۱۵۱)

حبیبؔ جونپوری اہلِ نظر کی نظر میں

مختلف ناقدین نے "کلیاتِ حبیبؔ" کے مطالعے کے بعد حبیبؔ جونپوری کی شاعری کے متعلق مختلف آراء دی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں۔

"جنابِ حبیبؔ جونپوری کا کلام اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے اور پڑھنے والے ان کی شاعری سے مستفید ہوسکتے ہیں۔"

ڈاکٹر سلیم اختر اُن کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"حبیبؔ جونپوری خوش لہجہ اور ادب افرزو شاعر تھے۔ سادگی، خلوص، وسیع النظری ان کی شاعری کے نمایاں جوہر ہیں۔ ان کے خطوط سے آپ کی شخصیت، علمیت

اور وجدانی بصیرت کی جھلک نظر آتی ہے۔"

پروفیسر سحر انصاری لکھتے ہیں:

"مولانا محبوب نے اپنے کلام کی اشاعت، ترتیب و تدوین پر بہت کم توجہ دی، اگر وہ دیگر شعراء کی طرح ایک منظم انداز میں اپنی تخلیقات کی اشاعت فرماتے تو بلاشبہ انہیں ادب میں وہ مقام ملتا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔"

پروفیسر نواز حسن زیدی اُن کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"بیسویں صدی کے ادبی منظر نامہ میں حبیبؔ جونپوری غیر معمولی مقام و مرتبہ کے حامل ہیں، انہوں نے جودتِ طبع سے کام لیتے ہوئے اردو شاعری کی روایت میں اپنا خونِ جگر شامل کیا۔ بالخصوص گیت کی صنف کی آبیاری میں معاصرین کے ہم سفر نظر آتے ہیں۔ یوں جس اردو گیت کی باقاعدہ ابتداء عظمتؔ اللہ خاں سے شروع ہوتی ہے وہ حبیب جون پوری تک پہنچتے پہنچتے شاعری کا ایک باب مکمل کر لیتی ہے۔

جب ہم حبیبؔ جونپوری کے گیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے گیت ترنم و تغزل کی شیرینی سے مملو نظر آتے ہیں۔ مترنم بحور کے انتخاب نے ان کی شاعری کو ساحری کے قریب کر دیا ہے۔"

عباس رضا لکھتے ہیں:

"حبیبؔ جونپوری کا تعلق شعری روایت کے اس قبیل سے ہے کہ جس نے شعر وسخن کو جذبوں کے اظہار کا وسیلہ ہی نہیں بنایا بلکہ تہذیبی اور معاشرتی رجحانات کا عکاس بنادیا ہے۔ ان کی نگاہ ادب کی کلاسیکی قدروں پر ہی نہیں تھی بلکہ وہ ادب کے عصری تقاضوں سے بھی بخوبی آگاہ تھے اور اس ذوق نے ان کے افکار کو ندرت عطا کی۔"

حبیبؔ جونپوری کا عرصۂ حیات ۱۹۱۶ء سے ۱۹۸۷ء تک ہے۔ اس عرصے

کے دوران برصغیر پاک و ہند میں تقسیم کا مرحلہ ۱۹۴۷ء میں پیش آیا۔ یہ دور سیاسی و سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں کا دور ہے۔ بیسویں صدی میں جن شعراء نے اپنا خونِ جگر دے کر چراغ غزل کی لو فروزاں رکھی، ان میں آرزو لکھنوی کا نام نہایت معتبر ہے۔ آرزو لکھنوی نے شاہراہِ عام سے ہٹ کر اپنے لیے فکر و اسلوب کا ایک ایسا راستہ منتخب کیا جو انہیں شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار تک لے گیا۔ اس زمانے میں حالی کی جدید شاعری کی تحریک نے اردو غزل کو بے اعتبار کر دیا تھا۔ آرزو لکھنوی کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دیا اور اپنے کمالِ ہنر سے یہ ثابت کیا کہ نظم کی مجموعی فضا میں بھی غزل اپنی حیثیت و انفرادیت برقرار رکھ سکتی ہے۔ آرزو لکھنوی نے نہ صرف اردو شاعری کو جدید لہجہ عطا کیا بلکہ سریلی بانسری کی لے سے اردو غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ آرزو لکھنوی کے شاگردوں نے اس شعری اسلوب اور فکری موضوعات کو حرزِ جاں بنایا اور اپنے روشن فکر اور عالی دماغ استاد کی جلائی ہوئی شمع کو تابندہ تر رکھنے میں اپنی صلاحتیں صرف کر دیں۔ برصغیر پاک و ہند میں آرزو لکھنوی کے شاگردوں کا شمار تو ممکن نہیں، تاہم نمائندہ تلامذہ کے کلام کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان شاگردوں نے اپنے استاد کی روش کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اس میں فکر و اسلوب کے نئے نئے رنگ و آہنگ بھی پیدا کیے۔ آرزو لکھنوی کے ان شاگردوں میں سے ایک اہم اور معتبر نام حبیبؔ جونپوری کا ہے۔ حبیبؔ جونپوری نے آرزو لکھنوی سے اصلاح بھی لی اور ان کے فکر و اسلوب کو اپنانے کی شعوری ولاشعوری کوشش بھی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فکری موضوعات و اسالیب پر آرزو لکھنوی کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حبیبؔ جونپوری نے ایک جانب تو آرزو لکھنوی کی فکری روایت کو اپنی شاعری کے ذریعے آگے بڑھایا اور دوسری جانب انہوں نے لاہور میں انجمنِ آرزو قائم کر کے دیگر شعراء کو بھی آرزو لکھنوی کے طرزِ فکر و احساس

سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی۔

جب حبیبؔ جونپوری نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا، اس وقت لکھنو میں مولانا صفیؔ لکھنوی، آرزوؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی، قدیرؔ لکھنوی، منظرؔ لکھنوی، بے خودؔ موہانی (جنہوں نے غالب کی شرح لکھی) یہ تمام علماء اور فضلاء اور شعراء مشہور تھے۔ مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔ عام طور پر طرحی مشاعروں کا رواج تھا۔ اس لیے شعراء غزلیں کہہ کر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اگر چہ اس وقت میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے خاندان کے لوگ مرثیے کہہ رہے تھے اور بڑے بڑے شعراء قصیدے بھی کہہ رہے تھے لیکن پورے لکھنو میں غزل ہی کا طوطی بولتا تھا اور شاعر کی کامیابی کا راز غزل گوئی تھا۔

اس دور سے پہلے رندؔ، صباؔ، وزیرؔ اور جانؔ صاحب کی شاعری میں اخلاق سے گری ہوئی باتیں نظم کی جاتی تھیں۔ حالیؔ نے اپنی کتاب مسدسِ حالیؔ کے مقدمے میں اس دور کی شاعری پر بہت لعن طعن کی ہے لیکن بیسویں صدی کے نصف ۱۹۵۰ء تک آتے آتے شعراء کے کلام سے وہ بد اخلاقی ختم ہوچکی تھی۔ اس دور میں محبوب الحسن پڑھنے کے لیے لکھنو گئے۔ یہ غزل ہی کا دور تھا۔ پرانے زمانے کی باتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ خصوصاً حسرتؔ موہانی نے اردو شاعری کو اعلیٰ رتبے تک پہنچا دیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب آیا، بادشاہت ختم ہوئی اور جمہوری نظام نے اپنا کام شروع کیا۔ اس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا۔ یہاں بھی انگریزی حکومت کے خلاف تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے سب سے بڑے شاعر جوشؔ ملیح آباد تھے۔ لکھنو کا ہر شاعر جوشؔ ملیح آبادی کی شاعری سے متاثر ہوا۔ اور اسی رنگ کی شاعری شروع ہوگئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ محبوب الحسن کے اپنے وطن کے ایک بہت بڑے شاعر وامقؔ جون پوری لکھنو میں موجود تھے اور جوشؔ ملیح آبادی کے رنگ میں لکھتے تھے۔ محبوب الحسن پر جوشؔ و وامقؔ جونپوری اور احسانؔ

دانش کے کلام کا کافی اثر پڑا۔ جوشؔ نے "ایسٹ انڈیا سے خطاب" نظم لکھی۔ یہ بہت مشہور ہوئی اور انہیں جیل جانا پڑا۔ وامقؔ جونپوری نے "بھوکا ہے بنگال بابا" لکھی۔ وامقؔ کی اس نظم سے متاثر ہو کر حبیبؔ جونپوری نے بھی انگریزوں کے خلاف ایک نظم "فرنگی" کے عنوان سے کہی۔

حبیبؔ جونپوری کا عہد شاعری میں موضوعی اعتبار سے نئے تجربوں کا عہد تھا۔ اس دور میں نئے سرے سے شاعری کا مفہوم متعین ہوا،اور اسے محض دل بہلاوے کی شے سمجھنے کی بجائے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے ایک مفید ذریعہ تسلیم کیا گیا۔ "اعلیٰ مقاصد" سے مراد یقیناً وہ خواب تھے جو سماج کو بدلنے کی زبردست خواہش کی صورت میں اس دور کے شعراء دیکھ رہے تھے۔ قوم کی سماجی اور معاشی زبوں حالی کو ختم کرنے، رہن سہن کے انداز بدلنے، معاشرت کے طور طریقوں کی درستی اور خوب سے خوب تر کی جستجو نے شاعری کے پرانے معیارات کو بدل کر رکھ دیا اور شعراء نے فنی اور سماجی شعور سے بہرہ ور ہو کر اردو شاعری کو نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔ یہ نئے رجحانات سماجی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر اُن خارجی عوامل سے ترتیب پاتے ہیں جنہوں نے تخلیق کار کے دروں میں جذبے اور احساس کی ایک نئی دنیا تشکیل دی۔ ماحول کی آویزش اور زمانے کی تلخیوں نے اپنے اظہار کے لیے ایک ایسا پیرایہ اختیار کیا جو روایت سے اکتساب کر کے جدید فکر وعمل کے رنگ میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ حبیبؔ جونپوری اس پورے منظر میں ایک نئے اور منفرد طرزِ احساس کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ یوں تو یہ نیا طرزِ احساس ہمیں اجتماعی سطح پر ملتا ہے لیکن حبیبؔ جونپوری کی شاعری کی مذہبی اور اخلاقی فضا اُن کے بطن میں نمو پانے والی روحانیت اور مذہبیت سے اثر پذیر ہو کر اپنا الگ رنگ جماتی ہے۔ انہوں نے گیت، قطعہ، غزل، رباعی، نظم اور قصیدہ سمیت اکثر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تفصیل آگے مختلف ابواب میں پیش کی جائے گی۔

کراچی منتقلی

۱۹۷۶ء میں کراچی منتقل ہو گئے۔ ۱۹۷۷ء میں سجادیہ امام بارگاہ میں پیش امام مقرر ہوئے۔ اسی منصب پر ۱۹۸۷ء تک فائز رہنے کے بعد ۱۹۸۷ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مولانا محبوب الحسن علمِ جفر، علمِ رمل، علم الاعداد اور علمِ نجوم جاننے کی وجہ سے خدمتِ خلق کے طور پر قرآنی آیات سے روحانی علاج کرتے رہے۔ جس میں انہیں بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ آج کل آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا باقر زیدی صاحب اسی فریضے کو انجام دے رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بیسویں صدی میں اُردو غزل

غزل کی صنف ہمارے بیشتر شعراء کو بہت مرغوب ہے۔ یہ واحد صنف ہے جو چار ساڑھے چار سو سال گزرنے کے بعد آج بھی اپنا طنطنہ قائم رکھے ہوئے ہے۔ دو مصرعوں میں ایک پورا مضمون بیان کرنا کائنات کو مٹھی میں اور سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

بقول غفور شاہ قاسم:

''کوہ ہمالیہ جیسی رفعتوں اور بحر الکاہل کی سی گہرائیوں کی حامل صنف مشرقی شعریات اور ہماری ادبی جمالیات کا گراں قدر اثاثہ ہے۔''

غزل جذب و خیال کی بوقلمونیوں، موضوعات و مضامین کی متنوع تجلیوں کا حیرت کدہ اور جہانِ معانی کا آئینہ خانہ ہے۔ غزل میں زندگی کی سی وسعت ہے۔ جس طرح زندگی اپنے اندر تمام موسم، رنگ، واقعات، جذبے، تحریکیں، چہرے، نظریئے اور رویّے سمولینے پر قادر ہے۔ اسی طرح غزل بھی ان سب عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ جس طرح زندگی کا ارتقائی سفر جاری ہے، اسی طرح غزل کا ارتقائی سفر بھی ایک تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ زندگی کے بدلتے مناظر اور مظاہر صنفِ غزل کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔

غزل کے دو مصرعے نہ صرف قاموسِ تخیل کو جذب کر لیتے ہیں بلکہ ذات سے لے کر کائنات تک، انفس سے لے کر آفاق تک، احساسات سے لے کر تاثرات تک،

عمیق کیفیات سے لے کر فلسفیانہ تفکرات تک، تمام زاویوں اور گوشوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔

انسانی دل و دماغ کی شاید ہی کوئی باریکی، کوئی کیفیت، کوئی حالت ایسی ہوگی جو زبانِ غزل سے ادا نہ ہو چکی ہو۔ یہ ایک بڑھتا پھیلتا تخلیقی عمل ہے۔ یہ ایک ذریعہ اظہار ہے، جس کے ذریعے شعور اور لاشعور کے تمام مسئلوں کو پوری احساسی گہرائی اور فکری خلوص کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ غزل کی آغوش ہر انسانی مشاہدے اور تجربے کی کفیل ہے اور اس کے کینوس پر ہر طرح کی گلکاری کی جا سکتی ہے، غزل انسانی جذبوں کی پناہ گاہ، ذوقِ لطیف کی تفریح گاہ اور سماجی رویوں کی تربیت گاہ ہے۔ غزل ہر عہد کے جذباتی روحانی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی آشوب کی نظریہ صورت اور کمپیوٹرائزڈ شکل ہے۔

بقول ڈاکٹر شبیہ الحسن:

"غزل انسانی فطرت کی نقاش ہے۔ ایجاز و اختصار کی خصوصیت ہے۔"

حبیبؔ جونپوری نے مختلف اصنافِ سخن مثلاً غزل، نظم، قصیدہ و رباعی میں طبع آزمائی کی۔ زیرِ نظر باب میں غزل کے حوالے سے حبیبؔ جونپور کی شعری قدر کا تعین مقصود ہے۔ وہاں شاعری میں اُن کے مقام و مرتبے تک پہنچنے کے لیے اس پس منظر کو جاننا ضروری ہے جو ان کی غزل میں ایک حرکی قوت کے طور پر اپنا کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔

حبیبؔ جونپوری کی غزل کے مطالعے کے لیے ہمیں اُردو غزل کی تین چار سو سالہ تاریخ کو کھنگالنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کا تعلق جدید اُردو غزل کے عہد سے ہے۔ جسے ہم اُردو غزل کے احیائی دور کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ حبیبؔ جونپوری کی غزل کو جس افادی اور اصلاحی نقطۂ نظر کا سامنا کرنا پڑا، اس نے غزل کی داخلی دنیا میں بعض ایسی تبدیلیوں کو راہ دکھائی جس کے نتیجے میں موضوعی اور معنوی سطح پر غزل کی نئی صورتیں سامنے آئیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس نئی صورتِ حال کو ان الفاظ میں

بیان کرتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

"غزل کی روایت پر اصلاح غزل کی اس تحریک کے اثرات بڑے گہرے اور ہمہ گیر ہوئے ہیں۔ غزل سے قافیہ پیمائی کا خیال رخصت ہوا اوراس کی جگہ حقیقت اور واقعیت نے لے لی۔ تقلید جواب تک غزل میں کسی نہ کسی طرح رونما ہوتی تھی، اس کا خاتمہ ہوا ہے اور اس کی جگہ خلوص اور صداقت کے عناصر رونما ہوئے ہیں۔ اس تحریک کے زیرِ اثر غزل نے حسن و عشق کو اپنا موضوع ضرور بنایا ہے۔ لیکن اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں اُن کی نفسیات کو خاص طور پر اپنے پیشِ نظر رکھا ہے، پھر غزل نے اپنے آپ کو حسن و عشق تک ہی محدود نہیں کیا ہے، دوسرے موضوعات کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ قومی، ملکی، تہذیبی اور اخلاقی تمام موضوعات اس تحریک کے زیرِ اثر غزل میں داخل کیے ہیں اور اُن کو پیش کرنے کا انداز غزل ہی کا رہا ہے۔"

بیس ویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہمہ گیر تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کا زمانہ ہے جس نے برصغیر کی عمومی فضا کو بدلنے اور زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر گہرے اثرات مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو غزل نے اس صورتحال کو نہ صرف قبول کیا بلکہ عصری تقاضوں کے تحت نئے حالات میں خود کو ڈھالنے کی طرف بھی پیش رفت کی۔ اس نے اپنی ظاہری صورت اور ہیئت کے اندر رہتے ہوئے زمانے کی تبدیلی کے ساتھ نہ صرف کود کو بدلا بلکہ اپنے اندر زندگی کی نئی وسعتیں بھی پیدا کیں اور زندگی کی ارتقاء سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر زندگی کے تنوعات، بوقلمونیوں، گہرائیوں رفعتوں، رنگینیوں اور سرمستیوں کو خود میں جذب کرلیا۔ مگر اس صنف، لطیف نے ان ساری تبدیلیوں کو ایسے خاموش اوررمزیاتی انداز میں اپنے وجود کا حصہ بنایا کہ بظاہر کسی بڑی تبدیلی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔

بقول ڈاکٹر احتشام حسین:

"غزل میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں، اُن کا پتا صاف طور پر سے نہیں چلتا۔ پھر بھی جب ہم عصرِ جدید کی غزلیں پڑھیں گے تو اُن میں نئی آواز اور زندگی کے نئے مسائل کی نسبت نیا نقطۂ نظر ملے گا۔"

تاہم اس سارے عمل میں اُردو غزل کسی ایک رجحان کے تابع نظر نہیں آتی۔ غزل کی دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کے باوجود غزل گو شعراء کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو روایتی غزل کی تخلیق کر رہا تھا۔ داغؔ اور امیرؔ مینائی کے اِتبع میں کہنے والے بھی موجود تھے۔ کچھ شعراء کے یہاں غالبؔ پرستی کا رجحان غالب تھا۔ پیروی میرؔ کے اثرات بھی کئی شاعروں کے یہاں نظر آتے ہیں اور پھر اقبالؔ کی غزل جو اُردو غزل کے اس پورے منظرمیں اپنی الگ پہچان کراتی ہے اور جس کے بارے میں آلِ احمد سرور کا یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے:

"اقبال نے میرؔ و غالبؔ کی زبان سے نطشے، برگساں، رومی، مارکس، گوئٹے اور ملٹن کے خیالات کی ترجمانی کی۔ اس حد سے بڑی ہوئی مقامی مشرقی اور مخصوص صنف میں انداز آفاقی پیدا کر کے انہوں نے اس کی گہرائی اور گیرائی تاثیر و تاثر میں انقلاب پیدا کر دیا۔"

بیسویں صدی کے آغاز میں اُردو غزل کی دنیا میں امیرؔ مینائی اور داغؔ کا شہرہ تھا۔ امیر مینائی، داغؔ اور جلالؔ لکھنوی کے ہاں قدرِ مشترک زبان کی صفائی اور سلاست ہے۔

بقول ناظر حسن زیدی:

"یہ تینوں شاعر اس زمانے کے ہیں جب اُردو زبان ڈھائی سو سال کی مشق اور منجھائی کے بعد صاف اور فصیح ہو چکی تھی۔"

گویا بیسویں صدی میں داخل ہونے والی غزل زبان کے معاملے میں ناسخ کی اصلاحِ زبان اور ان کے بعد مومن و غالب کے عہد کی زبان سے براہِ راست متاثر نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس دور کی غزل میں ان شعراء کا دم غنیمت تھا جنھوں نے غزل کی کلاسیکی روایت کو زندہ رکھا۔ یہ عہد شاعری کی نئی تحریکوں کے باعث روایتی غزل گوئی کے لیے سود مند نہیں تھا۔ غزل کی گرم بازاری ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ عصری تقاضے اتنے شدید تھے اور قومی، ملی اور فرد کے ذاتی مسائل اتنے گمبھیر تھے کہ غمِ دوراں کی حدت نے غمِ جاناں کو پگھلا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود غزل کا چراغ پوری طرح بجھنے نہیں پایا تھا۔ اُردو غزل جو کچھ عرصہ پہلے تک رہی روداد حسن و عشق، دنیا کی بے وفائی اور روایتی تصوف تک محدود تھی، اب متاثر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ دیرینہ تہذیب و روایت سے بعض شعراء کی قلبی وابستگی سنگِ راہ بنی۔

بقول آلِ احمد سرور:

"ابھی تک امیر و داغ کے چٹ پٹے اشعار مزا دیتے تھے۔ لوگ حالی کی اُبلی کھچڑی اور بے نمک سالن کی ضرورت تو محسوس کرتے تھے مگر جان اسی مسالے پر دیتے تھے۔"

لیکن اس کے باوجود قدیم روایت میں تبدیلی کا عنصر ہمہ گیر تھا۔ بقول ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل:

"لکھنو اور دہلی دبستانِ شاعری اس زمانے میں اپنے شباب پر تھے اور غزل کی قدم روایت کو قائم رکھتے ہوئے جدید روایت کی تحقیق و توسیع میں سرگرم کار تھے۔ ہمارے غزل گو شعراء اپنی پہنائی خیال اور وسعتِ خیال و افکار میں سارے جہاں کا درد سمونے کی کوشش کر رہے تھے اور غزل کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔"

مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں غزل کے بارے میں جو اصلاحات

تجویز کیں، اُن کے اثرات لکھنؤ کے غزل گو شاعروں پر مرتب ہوئے۔

حالی کا نقطۂ نظر یہ تھا:

''غزل کو محض عشقیات اور عشقیات کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس کو ہر قسم کے جذبات کا آرگن بنانا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ غزل میں معمولی مضامین بندھتے بندھتے ایک خاص زبان قرار پا گئی ہے اور وہ اس قدر کانوں میں رچ بس گئی ہے، اگر دفعتاً اس میں کثرت سے غیر مانوس اور اجنبی ترکیبیں اور اسلوبِ بیان داخل ہوجائیں تو غزل ایسی ہی گنٹھل ہوجائے جیسا کہ بعض شعراء کی غزل عربی اور فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اختیار کرنے سے ہوگئی ہے، حالاں کہ غزل کو بہ اعتبارِ مضامین کے وسعت دنیا بظاہر اس بات کا متقاضی ہے کہ زبان اور طریقۂ بیان کو وسعت دی جائے۔ پس ضروری ہے کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طریقۂ بیان میں دفعتاً کوئی بڑی تبدیلی بھی واقع نہ ہو اور باوجود اس کے غزل میں ہر قسم کے خیالات عمدگی کے ساتھ ادا ہوسکیں۔''

حالی کا غزل پر سب سے بڑا اعتراض اس کے روایتی عشق پر تھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ غزل کو بہ اعتبار اسلوب اور مضامین، زندگی کی طرح وسیع اور متنوع ہونا چاہیے۔ حالی کے اس نظریے کو کہیں کہیں قابلِ التفات سمجھا گیا اور اس کے دائرے کو وسیع کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ اکثر شعراء جن میں بڑے بڑے نام شامل ہیں، غزل کے روایتی انداز سے دست کش ہوئے بغیر غزل میں ایک ایسا ذہن لے کر آئے جو، چوبیس ویں صدی کے سیاسی اور سماجی شعور کو نمایاں کرتا ہے۔

بقول ابو اللیث صدیقی:

''یہ غزل صرف زلف و رُخ کی کہانی اور ہجر و وصال کی داستاں نہیں، اس میں زندگی کی پوری وسعتیں سما گئی ہیں۔ اسی لیے غزل میں میرؔ و غالبؔ کے دور کے مقابلے

میں واضح طور پر زیادہ وسعت ہے۔"

غزل کی اس نئی روایت میں واضح طور پر اخلاقی لب و لہجہ ملتا ہے۔ جذبات کے تناؤ کے بجائے ایک قسم کا ٹھہراؤ اور توازن موجود ہے۔ ان شعراء میں شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، اثر لکھنوی، جلیل مانک پوری وغیرہ نمایاں ہیں۔ اس عہد کی اُردو غزل غالب اور میر کی روایت سے آزاد نہیں ہو سکی۔ غالب اور میر غزل کے دو مختلف اسالیب اور آہنگ کے ترجمان ہیں۔

چناں چہ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں شروع شروع میں امیر و داغ اور بعد میں غالب و میر کا پرتو نظر آئے گا"۔

بیسویں صدی میں اُردو غزل کو سب سے سازگار ماحول اس وقت میسر آیا جب غزل کے اس کلاسیکی روپ کو جو میر، درد، مصحفی اور آتش کے ہاتھوں پروان چڑھا تھا اور غالب کی شکل میں اوج کمال کو پہنچا تھا۔ دوبارہ زندہ اور متحرک کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ اُسے غزل کے احیائی دور کا نام دیا جاتا ہے، اس عہد کے شعراء میں اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، سیماب اکبر آبادی، جگر مراد آبادی، یاس یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھپوری جیسے شعراء نے غزل کو سہارا دیا۔

بقول اختر انصاری:

"اپنے رچے ہوئے کلاسیکی مزاج شعری کی بدولت غزل کی قدیم اور فرسودہ علامتوں میں ذاتی تخیلی تجربات کا رنگ بھرا اور ان میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑا دی۔ مجموعی حیثیت سے ان شعراء کی تابانی فکر نے غزل کے ماحول کو جگمگا کر رکھ دیا اور بیسویں صدی کی غزل فی الواقع اور فی الاصل شعر و فن کی معراج معلوم ہونے لگی۔ اصغر اور فانی نے اپنی اپنی جگہ پر اور اپنی اپنی شاعری کے جداگانہ رنگ کے باوجود انیسویں

صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی روایت پرست اور انحطاط زدہ غزلیہ شاعری کو جن تغیرات سے دوچار اور جن توانائیوں سے مالا مال کیا، وہ درحقیقت بیسویں صدی کی غزل کے اعلیٰ ترین اکتسابات اور برگزیدہ ترین مقامات ہیں جن میں اُردو کی کلاسیکی غزل کی بازیافت کے ساتھ ساتھ دورِ جدید کے فکری عناصر بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور سموئے ہوئے ہیں۔"

یہ اُردو غزل کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے ایسے غزل گو میسر آگئے جن کے یہاں خود اپنا چراغ جلانے کی صلاحیت بھی موجود تھی اور اس عہد کی فکری اور جذباتی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر غزل کے فنی کمال تک پہنچنے کی صلابت بھی فراواں تھی۔ ہماری مراد فانیؔ، اصغرؔ، حسرتؔ، فراقؔ اور یگانہؔ سے ہے، جنھوں نے غزل کے متنوع رجحانات کے ہوتے ہوئے اپنے لئے الگ راہ نکالی۔"

فانیؔ بدایونی نے موت کی آرزو اور جستجو کرتے ہوئے تقدیر کی بے رحم جبریت کا تصور پیش کیا۔ اس کی نوعیت پہلے سے مختلف تھی۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر غم کی شاعری ہے اور محسوسات و تصورات کے نئے تراکیبی امتزاج سے جلا پاتی ہے۔ ان کے یہاں خواہشِ مرگ کا جذبہ اُن کی ذاتی زندگی کی تلخیوں کا نتیجہ ہے، جو زندگی سے بغاوت نہیں بلکہ بیزاری کی صورت میں اُبھرتا ہے۔ فانیؔ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مجنوںؔ گورکھپوری لکھتے ہیں:

"غالبؔ کے بعد اگر اقبالؔ سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کرلیا جائے تو اُردو غزل میں فانیؔ پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں شروع سے آخر تک حکیمانہ بصیرت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے وہاں جذبات و وارداتِ فکر و تامل کے احاطے سے گزر کر ہم تک پہنچتے ہیں اور اُن کی دردمندی ہم کو کسی حکیم یا عارف کی دردمندی معلوم ہوتی ہے...... فانیؔ کی غزلوں میں حزن و یاس ہے، وہ ایک مابعد الطبعیاتی تصور ہے اور اُن کی

قنوطیت ایک حکیمانہ توازن لیے ہوئے ہے۔"

فانی کی قنوطیت زندگی کے غموں کا عکس بھی ہے اور زندگی سے فرار کا ایک پہلو بھی۔ اُن کے یہاں غم محض راہ نوردی کے کام نہیں آتا بلکہ خود منزل بن جاتا ہے۔

اصغر گونڈوی نے متصوفانہ اور مابعد الطبیعیاتی شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی، تاہم ان کی غزل مابعد الطبعیات سے زیادہ ایک شائستہ مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ اس شائستہ مزاج نے اُن کی غزل میں رنگ، آواز اور خوشبو کا تصوراتی احساس پایا جاتا ہے، جو نہ صرف انسان کو عمل پر اُکساتا ہے بلکہ صحیح معنوں میں زندہ رہنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"اصغؔر نے اپنی حسن کار شاعری یا شاعرانہ حسن کاری میں تصوف سے بھی کام لیا ہے لیکن صرف اس حد تک جہاں اُن کا تصوف اُن کے شاعرانہ مقصد کے لیے کار آمد ہوسکتا تھا۔ اُردو شاعری میں تصوف کو اصطلاح و اعتقاد کے دائرہ سے نکال کر حسن آفریں اصغؔر نے بنایا۔ اصغؔر طبعاً صوفی نہیں، شاعر ہیں۔ اصغؔر کے کلام میں اُن کے تاثرات کو دل آویز بنادیا ہے۔"

اصغؔر ہر اعتبار سے جدید غزل کے معماروں میں شمار ہوتے ہیں کہ انہوں نے ایک نئے انداز سے غزل کے ساز پر تصوف کا راگ گایا اور یوں تصوف میں ایک نئی تازگی اور شادابی پیدا کردی۔ انہوں نے زندگی کی طرف رجائیہ اور نشاطیہ اندازِ نظر پیدا کرکے تصوف میں ایک نئی معنویت پیدا کی۔ اُن کے یہاں تصوف حسنِ ازل کے متنوع اور منتشر جلوؤں کے احساس کا دوسرا نام ہے۔

حسرؔت موہانی اس دور کے میرِ کارواں ہیں۔ وہ اپنے اسلوب کی حیرت انگیز جامعیت کے سبب رئیس المتغزلین کہلائے۔ انہوں نے اُردو کے متقدم شعراء کا نہایت تفصیل سے مطالعہ کر رکھا تھا۔

چناں چہ بقول احتشام حسین:

"اُن کے نگار خانۂ غزل میں کئی اساتذہ کی تصویریں نظر آتی ہیں لیکن اس نگارخانہ کی مجموعی بہار اور رونق اپنا ایک الگ حسن رکھتی ہے۔ اُن کے رنگِ سخن میں جو آراستگی اور شائستگی ہے، اس کی مشاطگی صدیوں کے تہذیبی ارتقاء نے کی ہے۔"

اُردو غزل میں حسرتؔ کے مقام و مرتبے کے بارے میں اختر انصاری کی یہ سطور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔

"اگر شعر و ادب کے کسی میوزیم میں اُردو کی تین سو سال کی کلاسیکی غزل کی نمائندگی کا مسئلہ درپیش ہو،اور اس مقصد کے لیے کسی ایک اور صرف ایک شاعر کا انتخاب مقصود ہوتو وہ شاعر حسرتؔ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔"

حسرتؔ کی غزل میں صحت مند جذبۂ عشق کے ساتھ ساتھ بالغ نظر انسانیت کا وہ تصور و عمل ملتا ہے جس نے زندگی کی آزمائشوں کو جمالیاتی تجربہ بنادیا۔ حسرتؔ نے اپنے دور کی سماجی توانائیوں سے مدد لے کر عشقیہ تجربات میں جو سرگرمیاں بھردی ہیں اُن سے غزل کے سلسلۂ اظہار میں بڑی وسعتیں آئی ہیں۔ اندازِ بیان کے حوالے سے حسرتؔ کے یہاں غزل کے کلاسیکی اسالیب کا ایک نیا اور خوش گوار امتزاج ملتا ہے۔ تاہم انہوں نے غزل میں نئے تجربات کا تکلف نہیں کیا۔ چناں چہ ان کے یہاں تفکر، جذباتی ونفسیاتی گہرائی کی تلاش کے بجائے زندگی کے کیف و رنگ اور انسانی زندگی کے پُر مسرت لمحوں کی داد دینا چاہیے۔

بقول نیاز فتح پوری:

"حسرتؔ کی شاعری میں نہ فلسفہ طرازی ہے، نہ معنی آفرینی، نہ بلندی خیال ہے نہ جدت بیان۔ وہ آسمان کے تارے توڑ لانے کی فکر نہیں کرتے بلکہ وہی باتیں کہتے ہیں جو عام طور پر سب کے دل میں گزرتی ہیں لیکن کہتے اس انداز سے ہیں کہ دل میں

اُتر جاتی ہیں۔"

حسرتؔ کے یہاں عشق یا محبت ایک ماورائی جذبہ نہیں بلکہ جیتی جاگتی زندگی کاایک مثبت سماجی عمل ہے جو مادی زندگی کے معاشرتی، سماجی اور انسان کے فطری تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

فراقؔ گورکھپوری نے اپنی غزل میں جدید ذہن کے فکر و احساس کو جمالیاتی آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جہاں وہ زندگی کے غموں کو بیان کرتے ہیں وہاں بھی وہ غم کے جمالیاتی احساس پر اپنی غزل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے آغاز میں کلاسیکیت کو اپنایا اور غزل کے لیے وہی انداز بیان اختیار کیا جو قدیم اساتذہ کے یہاں موجود ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اُن کے ذہنی ارتقاء کی قندیلیں روشن ہوتی گئیں۔ عصری تقاضوں اور زمانے کے انقلابوں نے انہیں نئے افکار کی راہ دکھائی۔ ان کی سیمابی طبع اور روشن دماغی نے انہیں کھوکھلی اور فرسودہ روایات کے مقابل لاکھڑا کیا۔ چناں چہ وہ اپنے ہم عصروں میں جہاں ایک بڑے انقلابی کے طور پر نمایاں ہوئے وہاں نئی غزل کے پیش رو بھی قرار پائے۔ فراقؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے غم و نشاط، خوشی والم اور رنج و راحت میں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کرکے اور ربط وضبط بڑھا کر زندگی کی تلخیوں کے ساتھ پیمانِ وفا باندھنے کی سعی کی ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوقؔ، فراقؔ کو اُردو غزل کی ایک بڑی طاقت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر حنیف فوق:

"اُن کے اشعار میں تجزیاتی نظر کی تجریدی مناعی ملتی ہے اور مفہوم کی مختلف تہوں سے اُن کے خیال کی متضاد پہلوؤں میں بنیادی وحدت تلاش کرلینے کی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے، اُن سے غزل کے جدید کیفیاتی و تاثراتی نظام کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ ایک کیفیت کو اس طرح گرفت میں لاتے ہیں کہ ایک آن کو صدیوں پر محیط ہونے کا احساس

ابھرنے لگتا ہے۔ دراصل فراقؔ کے اس نظامِ کیفیات کا تعلق صدیوں کے حاصل شدہ علم اور اجتماعی شعور سے قائم رہا ہے۔"

یاسؔ یگانہ چنگیزی کی غزل میں کشمکش اور ردّ و بدل کی منزلیں سر ہوتی نظر آتی ہیں۔ ان کی جارحانہ انفرادیت اور کھردری حقیقتوں نے اُردو غزل کو نئے تیور اور جدید آہنگِ اظہار سے آشنا کیا۔ تقلید و روایت پرستی کے خلاف یگانہؔ کی بغاوت زندگی کے نئے رجحانات کی آئینہ داری کرتی ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں جرأتِ گفتار اور ہمتِ کردار کا اچھوتا امتزاج ملتا ہے۔ یگانہؔ کی غالبؔ شکنی کے باوجود اس عہد کی اُردو غزل غالبؔ اور میرؔ کی روایت سے آزاد نہیں ہوسکی۔

مجنوںؔ گورکھپوری لکھتے ہیں:

"یگانہ، آتشؔ و غالبؔ کا ایک نہایت صحت بخش امتزاج ہیں۔ ان کے یہاں گمبھیر قسم کی مردانگی آتشؔ کی یاد دلاتی ہے اور متفکرانہ بلاغت اور عارفانہ آگاہی غالبؔ کے رنگ کا پتا دیتی ہے۔"

ناقدین نے یگانہؔ کو خود پرست، خودبین اور خودسر کہا ہے۔

بقول ڈاکٹر حنیف فوق:

"اُن کی انانیت کی لے اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ نہ وہ دل کی خطا پر شرمانے کے قائل ہیں اور نہ گمراہ ہوکر راہ پر آنا ضروری سمجھتے ہیں۔"

لیکن احمد ہمدانی کا خیال اس سے مختلف ہے وہ لکھتے ہیں:

"یگانہؔ خود پرست، خودبیں اور خودسر کہنا ایک معمول بن گیا ہے لیکن جب ہم ان کی شاعری کو بغور دیکھتے ہیں تو بات کچھ اور ہی نکلتی ہے۔ وہ خود پرست نہیں، روایت کے رسیا ہیں۔ وہ خود سر نہیں، خود آگاہی کی راہوں کے اَن تھک مسافر ہیں۔ ان کے تیوروں کے تیکھے پن اور ان کے لہجے کی کرختگی سے دھوکا ہوتا ہے کہ وہ نشۂ خودی میں چور

خود پرستی کے زعم میں مبتلا ہیں اور وہ انقلابی تبدیلیوں کے مبلغ ہیں۔ اسی غلط فہمی کی بناء پر کچھ لوگ ان کو غالبؔ کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں، یہ غلط فہمی غالبؔ اور یگانہؔ، دونوں کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔"

جدید غزل کے اہم شعراء میں جگرؔ مراد آبادی بھی ایک اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے سماجی اور سیاسی محسوسات و مشاہدات کے اظہار میں تغزل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کا انداز بیان سادگی، برجستگی اور بے ساختگی سے عبارت ہے، اُن کے یہاں اس عہد کے بعض دیگر شعراء کی طرح زندگی سے برگشتگی یا بے زاری کے جذبات نہیں ملتے۔البتہ انسانی تقدیر اور انسانی بوالعجبی پر اذیت ناک افسوس کا اظہار ضرور ملتا ہے۔

ان شعراء کے ساتھ ساتھ بیس ویں صدی کے معاصر عہد میں غزل کے پرانے ساز پر نئی دھنیں سنانے والے ایسے شاعر بھی موجود رہے ہیں جن کے یہاں فانیؔ، اصغرؔ، یگانہؔ، حسرتؔ، فراقؔ اور جگرؔ جیسی اجتہادی کوششیں تو نظر نہیں آتیں، البتہ انہوں نے اُردو غزل کو نئی سمتوں سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چناں چہ بیس ویں صدی کی غزل میں انہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان شعراء میں اکثر کا تعلق لکھنو سے ہے جنہوں نے اُردو غزل کی لکھنوی روایت کے برعکس غزل میں کسی نہ کسی قسم کا جدید رنگ پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس رنگ کو قبول عام نصیب نہ ہوسکا، یا وہ رنگ کوئی دیر پا اثر نہ چھوڑ سکا۔ عزیزؔ لکھنوی، صفیؔ لکھنوی، ناطقؔ لکھنوی، اثرؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی اور آرزوؔ لکھنوی کے یہاں کئی ایک غزلیں ایسی مل جاتی ہیں جو اپنے اندر ایک نئی لذت رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں حسن و عشق کے صحت مندر جحانات کے ساتھ مسائل حیات کے موضوعات بھی ہیں۔ فرسودہ مضامین میں ندرت اظہار کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ اُن کے کلام میں لطافت و رنگینی، تاثیر، صداقت اور

کیف و نغمگی کے ساتھ ساتھ لکھنوی تکلفات، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور خوش گوار آورد کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ چناں چہ ندرتِ اظہار اور جدید لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کے باوجود ان شعراء کے یہاں کوئی واضح قسم کی انفرادیت نظر نہیں آتی۔

شاؔد عظیم آبادی (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۲۷ء) کی شاعری کا عام آہنگ ناصحانہ اور اخلاقی نہیں ہے۔ اُن کے یہاں جذباتِ انسانی اور وارداتِ قلبی کی سچی تصویریں بھی ہیں جو میرؔ کے رنگ سے قریب تر ہیں۔ لیکن میرؔ کے یہاں اکثر ایک طرح کی سپردگی اور پامالی ملتی ہے۔ شاؔد کے یہاں اس کے برعکس حرکت، ولولہ اور شوق کی فراوانی ہے۔ عام طور پر ان کی وہ غزلیں جو نسبتاً طویل بحروں میں ہیں، ایک خاص غنائی کیفیت کی حامل ہیں۔

عزیز لکھنوی (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۳۵ء) کی غزل پر لکھنو کی غزل کے روایتی عناصر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ عزؔیز لکھنوی، لکھنو کے قدیم رنگِ تغزل کی آخری یادگار تھے۔ اگرچہ ان کے زمانے میں غزل کے قدیم اسلوب کے خلاف ایک پورا محاذ بن گیا تھا۔ لیکن یہ بنیادی طور پر غزل کے کلاسیکی انداز کے علم بردار رہے۔ غزل میں جذباتیت کو اہمیت دے کر اسے نئے مسائل کے اظہار کا وسیلہ بنانا، اُن کی غزل کا مخصوص رنگ ہے جس نے انہیں اپنے عہد کا ایک منفرد غزل گو بنادیا ہے۔ وہ اپنے کلام میں میرؔ و غالبؔ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں لیکن بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

"لیکن اس اعتراف کے باوجود اُن کا اپنا مخصوص لب ولہجہ ہے جس میں غالبؔ کے خیال کی گہرائی، میرؔ کا سوز و گداز اور اُن کی سادہ زبان ایک نئے سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔"

علامہ اقبالؔ بھی عزؔیز لکھنوی کے کلام کے معترف تھے۔ عزؔیز لکھنوی کے مجموعۂ کلام "گل کدہ" کے ابتدائی صفحات میں علامہ اقبالؔ کا یہ جملہ درج ہے کہ:

"میں آپ کے کلام کو ہمیشہ بہ نظرِ استفادہ دیکھتا ہوں۔"

مجنوںؔ گورکھپوری عزیزؔ کی غزل کے نئے آہنگ اور اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عزیزؔ سے اُردو غزل کو جو نئے اسالیب اور نئے آہنگ ملے ہیں، جن کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکے گا۔ انہوں نے غزل میں معنوی وسعتیں پیدا کی ہیں، وہ بھی یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔''

لیکن اس کے ساتھ ہی مجنوںؔ کو، عزیزؔ کے ماتمی لہجے پر اعتراض ہے۔ بقول اُن کے:

''اس کے کیا کیجئے کہ اُن کی غزلیں پڑھتے ہوئے ایسا احساس ہوتا ہے جیسے کسی جنازہ کے اٹھنے میں اور روانہ ہونے میں ناقابلِ برداشت حد تک دیر ہورہی ہے۔''

میرؔ کے نزدیک سوز و گداز، درد وغم غزل کے عناصر ہیں۔ خوش دلی کی منزل عاشق سے دور ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ رنگ میرے کلام میں بہت تیز ہے۔ مگر کیا کروں۔ رنگِ طبیعت سے مجبور ہوں، عبرت مجھ پر غالب، نشاطِ طبع مفقود ہے۔ اہلِ دل کبھی کبھی گورِ غریباں کی بھی سیر کرلیتے ہیں۔ آپ بھی ''گل کدہ'' کو اسی نظر سے دیکھیں۔''

اس حوالے سے دیکھا جائے تو اپنے سوز و گداز اور درد وغم کی بدولت عزیزؔ، میرؔ کے اثر قبول کرتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں دنیا کی بے ثباتی، انسان کی ناکامی اور محرومی اور حسرت و یاس کے مضامین بہ تکرار ملتے ہیں۔ جن میں میرؔ کا سوز و گداز جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

عزیزؔ کے ماتمی اور رثائی لہجے کو اس دور کی مرثیہ گوئی کے اثرات کا نتیجہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ہمارے خیال میں اس کا اہم سبب یہ ہے کہ عزیزؔ نے اپنی شاعری میں اگلی صحبتوں کو یاد کیا ہے جو ایک عظیم اور شان دار تہذیب و تمدن کی علامت

تھیں اور زمانے نے انہیں مٹا دیا ہے اور جو لوگ ان سے وابستہ تھے وہ انہیں بچانے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ یہ صورت حال ایک ایسی صورت حال کو جنم دیتی ہے جو بے چارگی اور مجبوری بن کر عزیزؔ کے کلام میں آتی ہے۔ یہ الم ذاتی اور شخصی نہیں بلکہ اجتماعی اور تہذیبی ہے:

هم گذشتہ صحبتوں کو یاد کرتے جائیں گے
آنے والے دور بھی یونہی گذرتے جائیں گے

دل پہ قابو نہ رہا سوچ کے کچھ رو ہی دیے
چھٹ کے زنداں سے جب اجڑے ہوئے گھر تک پہنچے

عزیزؔ کے ہاں بعض عارفانہ مضامین کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ عزیزؔ کے ہاں غالبؔ کے فکر و خیال کا تتبع نہیں ملتا بلکہ انہوں نے غالبؔ کے مخصوص اندازِ بیان اور زبان کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ درج ذیل مصرعے ہمارے اس خیال کی تصدیق کریں گے:

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا (غالبؔ)
میرے مرنے کا جو ساماں تھا وہ بھی نہ ہوا (عزیزؔ)
دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابہ جل گیا (غالبؔ)
سوزِ غم سے اشک کا اک قطرہ جل گیا (عزیزؔ)
آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے (غالبؔ)
آئینہ رکھو کے دیکھ تماشا کہیں جسے (عزیزؔ)

مرزا جعفر حسین، عزیز کی غالب پسندی پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عزیز مرحوم تمام شعراء سابقین میں سب سے زیادہ مرزا غالب سے متاثر تھے اور ولی کے رنگِ سخن کو قبول کرنے کی انہوں نے کامیاب کوشش کی تھی۔ انہوں نے بہ کثرت غزلیں غالب کی طرحوں میں کہی ہیں۔ یہاں تک کہ ''مشکل پسند آیا'' کے قوافی و ردیف میں بھی اُن کی غزل موجود ہے۔''

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں، ان کا اپنا ایک مخصوص لب ولہجہ ہے جس میں غالب کے خیال کی گہرائی، میر کا سوز و گداز اور اُن کی سادہ زبان ایک نئے سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔

ثاقب لکھنوی (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۵۱ء) کے یہاں بھی میر و غالب کی روایت کی بازیافت موجود ہے۔

بقول ثاقب لکھنوی:

''اپنی چھپن برس کی شاعری میں میری یہ کوشش رہی ہے کہ زبان میر کی سی اور تخیل غالب کا سا ہو۔ میرے حسنِ ظن رکھنے والے احباب مجھے میر و غالب کا صحیح پیرو خیال کرتے ہیں۔''

عرفان عباسی اُن کی غزلوں کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرزا ثاقب کی زبان لکھنو کی ٹکسالی زبان ہے۔ محاوروں کی بندش و برمحل استعمال 'ترکیب کی چستی' الفاظ کی سادگی، روانی اور موسیقیت، کلام کی پختگی، وارداتِ قلبی و کیفیاتِ داخلی کا دل کش پیرائے میں اظہار، میر کی زبان اور غالب کی تخیل کا تتبع اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ اُن کے کلام میں حیات کی دھوپ چھاؤں بھی ہے، انسانی محسوسات و تجربات بھی۔ عزم وارادہ بھی ہے۔ دل کشی و رعنائی بھی۔ تفکر و تغزل بھی ہے،

سوز و گداز بھی ہے۔ درد و اثر بھی ہے، استعارات و کنایات بھی۔"

میرؔ و غالبؔ کے اتباع کے باوصف ان کے یہاں اساتذۂ لکھنو کی شعری روایات کی جھلک بھی کہیں کہیں موجود ہے۔

آثرؔ لکھنوی (۱۸۸۵ء۔ ۱۹۶۷ء) لکھنو کے بہترین غزل گوؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جوشؔ ملیح آبادی اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت عزیزؔ لکھنوی کے قابلِ نازشاگرد، مجھ ہیچ مدان کے بھائی علم و عروض وفنِ شاعری کے مرکزی استاد، فارسی و انگریزی ادب کے زبردست نباض، قلزمِ انسانیت کے منارہ ضوبار، منبرِ انتقاد کے خطیبِ اعظم، مسندِ زبان کے قاضی القضات اور مدینہ تہذیب لکھنو کے طاق زریں کے، ہزاروں بجھے ہوئے چراغوں کی قطاروں میں، ایک ایسے آخری اور تنہا چراغ تھے، جن کے گل ہو جانے سے، تمام شہر پر مہیب اندھیرا محیط ہو کر رہ گیا ہے اور ہر ذرّہ، کراہ کراہ کر، فریاد کر رہا ہے کہ:

اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

اُن کی موت ایک فرد کی موت نہیں، ایک پوری صدی، ایک پورے طرزِ معاشرت کی موت ہے۔"

آثرؔ کے کلام میں متقدمین کا رنگ پایا جاتا ہے۔ البتہ زبان و بیان کے اعتبار سے اُن کی نسبت کہیں زیادہ صاف اور سلیس ہے۔ آثرؔ، میرؔ کی سادگی، تاثیر، جذبے کے خلوص اور صفائی کے گرویدہ ہیں۔ رنگِ میرؔ اُن کا پسندیدہ رنگ ہے۔

اپنے استاد عزیزؔ لکھنوی کے اثر سے ان کی غزلوں پر کہیں غالبؔ کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی آثرؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"آثرؔ کی زبان ایسی سادہ و پرکار ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات اس میں کہہ

جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ سہلِ ممتنع پر مشتمل ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت آہستہ لب ولہجہ میں بات کررہے ہیں۔ اُن کا پورا کردار اُن کی شاعری کی زبان میں پوشیدہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی ایسی کسک ہے اور ایسا اثر ہے کہ احساس کے سارے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔"

لکھنو کی بیس ویں صدی کی شعری روایت، جو اپنے دامن میں جدید رجحانات کے ساتھ اساتذۂ غزل کے ملے جلے رنگ لیے ہوئے ہے، آثر لکھنوی کی شاعری اپنی آخری ضو دکھاتی ہے۔ وہ حسن وعشق کے پاکیزہ جذبات کے ترجمان ہیں۔ میر کی سادگی، سوز اور جذبے کا خلوص اُن کی شاعری کی پہچان بن گیا ہے۔

جلیل مانک پوری (۱۸٦۷ء۔۱۹٦۴ء) کی غزل روایتی شاعری کا نمونہ ہے۔ وہ ان نئے تجربات، احساسات، جذبات، واقعات اور معاملات کو موضوعِ غزل نہیں بناتے جن کو ان کے دیگر معاصرین نے قبول کیا۔ اُن کی زبان صاف، شستہ اور متروکات سے پاک ہے۔ مضمون کو زبان پر ترجیح دیتے ہیں۔ کہیں کہیں معاملہ بندی میں جرأت اور ان کے مقلدین کا پرتو نظر آتا ہے۔ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو رعایتِ لفظی کا نمونہ ہیں۔

صفی لکھنوی (۱۸٦۲ء۔۱۹۵۰ء) کا شمار لکھنو کے ان اہم غزل گو شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے شاعری کے اندازِ فکر کو بدلنے کی کوششوں میں بھرپور حصہ لیا اور آگے چل کر اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل کی۔ صفی نے اپنی غزلوں میں قدیم صالح روایات کی پاس داری کرتے ہوئے عصری تقاضوں کو فنی کمال کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی ابتدائی غزلیں قدیم رنگِ تغزل کی آئینہ دار ہیں۔ بعد کی غزلوں میں روایتی رنگ کے ساتھ ساتھ نیا آہنگ بھی موجود ہے جو ان کی فنی صلاحیت، ادبی بصیرت اور جدید تعلیم کے اثرات کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ صفی کی غزل کا ابتدائی دور ۱۸۷۵ء سے ۱۸۹۵ء تک کے عرصہ پر

محیط ہے۔ جس میں وہ سر سید تحریک، حالی اور آزاد کی اصلاحی کوششوں سے متاثر ہوئے۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۱۴ء تک کے عرصہ میں پروان چڑھی اور قدیم رنگِ سخن کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات، انسان دوستی کے جذبات اور ہمدردی کے خیالات ان کے کلام میں جگہ پانے لگے۔ تیسرے دور میں جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۶ء تک کے زمانے پر مشتمل ہے، قومی اور ملکی مسائل شدت سے رونما ہو رہے تھے۔ چناں چہ صفی کی غزلوں میں اُن مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ چوتھے اور آخری دور (۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۰ء) میں اُن کی غزلوں میں ترقی پسند تحریک، سیاسیات و مذہبیات اور بعض دوسرے رجحان پائے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو صفی کا ۷۵ سالہ دورِ شاعری متنوع رجحانات کے سبب اس عہد کی ایک پوری تاریخ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس مدت میں انہوں نے بہت کچھ کہا۔ قدیم رنگِ سخن سے لے کر جدید طرزِ کلام تک اُن کی شاعری میں کئی اہم موڑ آئے، جنہیں انہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ کاٹتے ہوئے عصری رجحانات اور نئے تقاضوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ صفی کی غزل گوئی میں قدیم وجدید کی آمیزش میں اتنا توازن و تناسب ہے کہ ہم اُسے صحیح معنوں میں حالی کے خواب کی تعبیر دے سکتے ہیں۔ انہوں (صفی لکھنوی) نے اپنی غزل کو سطحی خیالات کا محور بننے سے روکا۔ قدیم صالح روایات کو باقی رکھا اور کارآمد اصلاحات کا اضافہ کیا۔ اس بارے میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ شعوری طور پر صفی ہی پہلے لکھنوی شاعر ہیں جنہوں نے جدید ادبی تحریکات کو سمجھا ہی نہیں بلکہ اُن کا خیر مقدم بھی کیا، صفی اس محدود جاگیر دارانہ اور قدامت پسندانہ ماحول سے باہر نکلنے کی برابر کوشش کرتے رہے جس نے بدلتے ہوئے حالات میں ادبی ترقی کی راہیں روک رکھی تھیں۔"

اسی طرح ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی بعض دیگر شعراء کے ساتھ صفی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان شعراء نے "جدید خیالات کی آمیزش سے غزل میں چار چاند لگادیے۔"

صفؔی کی غزلوں میں جہاں مضامین کا تنوع نظر آئے گا اور تصوف، سائنس، فلسفہ اور سیاسی رجحانات دکھائی دیں گے، وہاں تغزل سے بھرپور لہجہ بھی محسوس ہوگا۔ اُن کے اشعار خلوص و صداقت کا مرقع ہیں جن میں تصنع اور آورد نام کو نہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت صفؔی کی غزل اور انداز غزل گوئی پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں...... وہ لکھتے ہیں:

''صفؔی کی غزل گوئی کے متعلق یہ بات پوری ذمہ داری سے کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے غزل کو فرسودگی کے حصار سے باہر نکال کر وسعت و بلندی عطا کی اور اس کے بیمار جسم کو اپنی فکر سے قوت و توانائی بہم پہنچائی اور اس طرح صفؔی نے غزل کو جدیدیت کے لباس میں ملبوس کر دیا۔''

صفؔی کی غزل میں زبان و بیان کی سادگی، فکری بلند آہنگی، جدید مضامین اور خیالات اور اپنے عہد کے مسائل کا ذکر، فرسودہ اور پامال روایات سے انحراف اور ندرت و صفائی جیسی خصوصیات شامل ہیں اور یہ سب چیزیں مل کر صفؔی کو اپنے عہد کا ایک باکمال اور صاحب فن غزل گو ثابت کرتی ہیں۔ ان کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

ضو جتنی بڑھتی ہے شمع شعور کی
نزدیک ہوتی جاتی ہے ہر چیز دور کی

ہر چند لطف سیر و سیاحت سفر میں ہے
راحت ہے جس کا نام وہ اپنے ہی گھر میں ہے

مری لحد پہ کوئی سوگوار تک نہ رہا
ہوا چلی کہ چراغ مزار تک نہ رہا

اسی کو بڑھ کے گلے سے لگا لیا ہم نے

جسے بھی درد محبت کا رازداں دیکھا

ناطق لکھنوی (۱۸۲۷ء۔۱۹۵۲ء) لکھنو کے اہم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ذوقِ سخن گوئی ورثے میں ملا تھا۔ کم عمری ہی میں بطور شاعر شہرت حاصل کر لی تھی۔ ابتداء میں چند غزلیں امیرؔ مینائی کو دکھائیں، پھر فطری صلاحیت اور ذوقِ سلیم کو ہی رہنما بنالیا۔ نہایت زود گو اور قادر الکلام شاعر تھے۔ چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

انجمن خاموش تھی حسنِ ازل کے ساز کی

میں ہی ناطق تھا کہ جس نے گفتگو آغاز کی

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح

میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت

جس کا جتنا ظرف ہے اُتنا ہی وہ خاموش ہے

قدیرؔ لکھنوی (۱۸۹۰ء۔ ۱۹۶۹ء) لکھنو کی ادبی انجمنوں کے ایک اہم رکن تھے۔ کئی ادبی رسالوں سے وابستہ رہ کر زبان و ادب کی خدمات انجام دیں۔ میدانِ غزل گوئی میں خاص مقام رکھتے تھے اور اپنے دور کے مقبول شعراء میں شمار کیے جاتے تھے۔ غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ قدیرؔ کے کلام میں سادگی و سلاست، صداقت اور پاکیزہ جذبات کی ترجمانی، درد و غم کے اثرات، برجستگی، بے ساختگی، حسن و عشق کی چاشنی، تصوف کی جھلک وغیرہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اُن کے چند اشعار مندرجہ

ذیل ہیں:

قدرِ سوزِ محبت کبھی عیاں نہ ہوا
تمام عمر جلا دل مگر دھواں نہ ہوا

ہم اے کج لحد دنیا سے ایسے تنگ آئے ہیں
کہ تجھ کو حشر تک کے واسطے آباد کرتے ہیں

تخیلات کے دھوکے ہیں سب شبِ وعدہ
نہ آ رہا ہے کوئی اور نہ جا رہا ہے کوئی

منظر لکھنوی (۱۸۹۵ء۔ ۱۹۶۵ء) کی غزل کو لکھنو کا وہ دور اور ماحول ملا جس میں نئے نئے خیالات اور اسالیب پیدا ہو رہے تھے، زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا اور ہر طرف سماجی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں جن سے اس عہد کی شاعری بھی متاثر ہو رہی تھی۔ ان حالات میں منظر نے اپنی شاعری کی ابتدا کی اور بہت کم عرصے میں اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بناء پر اپنی منزل کا تعین کرلیا۔ منظر کے کلام میں زبان کی لطافت اور بیان کی ندرت کے ساتھ سیدھے سادے اور ہلکے پھلکے انداز میں اپنے احساسات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی بات بھی نہایت معصومیت اور بھولے پن سے کہہ جاتے ہیں۔ منظر کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مرگِ عاشق پر فرشتہ موت کا بدنام تھا
وہ ہنسی روکے ہوئے بیٹھا تھا جس کا کام تھا

بے خود ایسا کیا خوف شب تنہائی نے
صبح سے شمع جلا دی ترے سودائی نے

سراؔج لکھنوی (۱۸۹۵ء۔۱۹۸۶ء) لکھنو کے خوش فکر و مقبول شاعراور لکھنوی تہذیب کے اہم نمائندے تھے۔ سراؔج نے نئے میلانات کے تحت اپنی شاعری کی خصوصیات کا تعین کر کے جذباتِ قلبیہ کو سادگی اور رنگینی کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا اور بہت جلد خود کو ایک ہر دل عزیز شاعر ثابت کر دیا۔ اُن کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے قدیم شعراء کے رنگ کو کسی نہ کسی حد تک قبول کر کے ایک نئے لہجے کی بنیاد رکھی۔ اُن کے کلام میں اندازِ بیان کی تازگی، نغمگی، سادگی اور نازک خیالی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ وہ اُن خوش قسمت شعراء میں سے ہیں جنہیں اُن کی زندگی ہی میں شرفِ مقبولیت بخشا گیا۔ اُن کی غزلوں کا ایک مجموعہ "شعلۂ آواز" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

رات بھر شمع جلاتا ہوں بجھاتا ہوں چراغ
بیٹھے بیٹھے یہی شغلِ شب تنہائی ہے

چند تنکوں کی سلیقے سے اگر ترتیب ہو
بجلیوں کو بھی طوافِ آشیاں کرنا پڑے

تباہیوں نے مری خود انہیں سنوار دیا
وہ میرے بعد کسی کو تباہ کر نہ سکے

آلِ رضاؔ لکھنوی (۱۸۹۶ء۔ ۱۹۷۸ء) لکھنو کے اہم غزل گو شاعر ہیں اور جلاؔل

اور آرزوؔ لکھنوی کی روایت کے شاعر ہیں۔ انہوں نے لکھنوی کی شاعری کے اس جدید رجحان کو، جس کا آغاز جلالؔ سے ہوا، اور وہ صفیؔ، ثاقبؔ، آرزوؔ کے ہاتھوں پروان چڑھا، نہ صرف قائم رکھا بلکہ عصری شعور کے نتیجے میں اس میں کئی اضافے بھی کیے۔ وہ شاعری کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ غزل کے بارے میں اُن کے نظریات اس جدت پسندی کے مظہر ہیں جس نے بیں ویں صدی میں لکھنو کی غزل کے خدوخال سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ غزل گوئی میں "کیفیتِ خاص" کے قائل ہیں۔ آلِ رضاؔ لکھتے ہیں:

"دل و دماغ کی کاوشوں کو جذبات کی جامہ زیبی اور الفاظ کی طرح داری کے ساتھ ادبی سنجیدگی کی شان سے نمودار ہونا چاہیے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک ہی شعر میں مضمون، بیان اور زبان کا مربوط اور ہم آہنگ کردار چلتی پھرتی تصویریں بن کر آنکھوں کے سامنے آجائے۔"

اپنے عہد کے جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے زبان و بیان کے مروجہ طریقوں کو نہایت سلیقے سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی رضاؔ کی غزل کی لسانی خوبیوں پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آلِ رضاؔ نے بھی آرزوؔ صاحب کی طرح زبان سے بھاری بھر کم، بوجھل ترکیبیں خارج کردیں اور محض وہ لفظیات استعمال کیں جو اُن کی دل کی دھڑکنوں کو زبان دے سکیں۔"

اسی طرح ظفرؔ جونپوری، آلِ رضاؔ کی فن غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آلِ رضاؔ صنفِ غزل میں کسی خاص انقلابی طرز کے موجد نہیں ہیں لیکن اپنے نادر اسلوبِ بیان کی وجہ سے اپنی علیحدہ پہچان ضرور رکھتے ہیں۔ وہ غزل کے سانچے کو غزل کے حدود میں رکھ کر نہایت نازک اور لطیف دلی جذبات کی مصوری کرنے کے موجد

ہیں اور یہ رنگِ خاص اُن کے استاد حضرت آرزوؔ سے مستعار ہے۔"

آلِ رضاؔ نے لکھنوی شعری روایت کی پاس داری کرتے ہوئے اپنے عہد کے حقائق، عصری حسیت اور نفسیاتی و ذہنی رویوں کے امتزاج سے جو انفرادی لہجہ تشکیل دیا، وہ اُردو غزل گوئی میں انہیں ایک اہم مقام عطا کرتا ہے۔

مجازؔ لکھنوی (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۵۵ء) بیس ویں صدی کے وسط کے اہم لکھنوی شاعر ہیں۔ مجازؔ کی اصلی شہرت نظموں کے حوالے سے ہے۔ تاہم انہوں نے غزل گوئی میں بھی نام پیدا کیا۔ مجازؔ بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی رومانی شاعری کا آغاز غزل سے کیا اور اس میں ایک نیا احساس پیدا کر کے اپنے عہد کے نوجوانوں کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کی عکاسی کی۔ رومانی مزاج رکھنے کے باوجود انہوں نے مختلف عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کے اظہار میں سماجی حقیقت پسندی کے گہرے شعور سے کام لیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"اُن کی غزلوں میں گردشِ دوراں کے باعث زلفِ پریشاں اور دیدۂ گریاں بھول جانے، اس کا مداوا کرنے اور گریبان سینے، لیکن اپنا مداوا نہ کرسکنے اور اپنا گریباں نہ سی سکنے، سیاستِ اہلِ جہاں سے نہ ڈرنے، خوگرِ آلام رہنے، حشر کو خاطر میں نہ لانے' زلفوں کے پیچ و خم کے مقابلے میں دنیا کے سنوارنے کو مشکل سمجھنے کا جو تذکرہ موجود ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجازؔ محض جذباتی شاعر نہیں ہے۔ اس کے یہاں زندگی کا شعور بھی موجود ہے۔"

مجازؔ نے جدید غزل میں ایک انقلابی بانکپن پیدا کردیا ہے۔ مجازؔ نے غزل کو انفرادی جذبات اور مجرد تصورات کا وسیلۂ اظہار بنانے کے بجائے اپنے عہد کے تقاضوں کے تحت اجتماعی جذبات اور سماجی احساسات کو پیش کرنے کا ذریعہ بنایا۔

آرزوؔ لکھنوی (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۵۱ء) کا نام بھی اُن شعراء کی فہرست میں شامل

ہے جنہوں نے لکھنوی شاعری کو سنوارنے میں بڑا حصہ لیا۔ تیرہ برس کی عمر میں جلالؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کی اور مدت تک اپنے استاد کے رنگ میں شعر کہتے رہے، جن میں مضمون کی طرف توجہ کم تھی، البتہ زبان کی صحتِ صفائی پر زیادہ زور تھا لیکن بعد میں اپنے معاصرین کی طرح یہ بھی رنگِ قدیم کو ترک کرکے جدید میلانات اور رجحانات کی علم برداری کرنے لگے۔ وصی احمد اختر، آرزوؔ کے پہلے دیوان" فغانِ آرزوؔ" کے مقدمے میں اُن کی غزل پر غالبؔ و میرؔ کے اثرات کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آرزوؔ نے خیال اور طرزِ ادا میں غالبؔ کی پیروی کی ہے اور زبان و محاورہ میں میرؔ کی تقلید۔"

یہ درست ہے کہ اپنے ہم عصر شعراء کی طرح آرزوؔ کے ہاں بھی غالبؔ و میرؔ کی شعوری تقلید کا اثر ملتا ہے لیکن یہ کہنا کہ تخیل اور طرزِ ادا غالبؔ کا اور زبان و محاورہ میرؔ کا ہے، صحیح نہیں۔ آرزوؔ کے پہلے دیوان میں زیادہ تر میرؔ کا رنگ غالب ہے۔

بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

"میرؔ کی طرح یاس و حسرت کے مضامین بہت ہیں، جنہوں نے کہیں کہیں ماتم، سینہ کوبی اور مرثیت کا رنگ اختیار کرلیا ہے۔ مرگ و جنازہ اور اس کے متعلقہ مضامین اس دور میں بڑی کثرت سے ہیں اور شاید ذہنی طور پر آخر دور کی لکھنوی شاعری پر مرثیہ گوئی اور مرثیت کے اثرات اس صورت میں بظاہر ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ اثرات آرزوؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ وغیرہ سب کے یہاں موجود ہیں۔"

ڈاکٹر حسن رضوی آرزوؔ لکھنوی کے کلام پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اُن کے کلام میں وہ رنگ نہیں ملتا جس کے لیے لکھنو کی روایتی غزل بدنام تھی، بلکہ ایک نئے دور کا شعور، نئے مسائل کا احساس، ایک جذبہ اور کیفیت کا بیان، غزل کی زبان اور اس کے استعاروں میں ملتا ہے۔"

ڈاکٹر عارف ثاقب لکھتے ہیں:

''آرزوؔ لکھنوی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی غزلوں نے ایک بالکل نئی آواز کی حیثیت اختیار کی ہے جس کی بازگشت موجودہ عہد کے چند ایک شعراء کی غزل میں سنی جا سکتی ہے۔''

آرزوؔ لکھنوی کے دوسرے دیوان میں غالبؔ کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔آرزوؔ کی ابتدائی عہد کی غزل گوئی میں اساتذہ کے رنگ نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں اُن کے ہاں فلسفیانہ خیالات، انسانی جذبات کی رنگارنگ تصویر کشی، خوب صورت زبان کا حسنِ استعمال اور لفظی و معنوی صنائع بدائع پیش کرنے کا اہتمام ملتا ہے۔ اسی دور میں آرزوؔ کے یہاں زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور لہجے کی ہندوستانیت کا رجحان ملتا ہے، جس کی ترقی یافتہ شکل اُن کی ''خالص اُردو'' ہے۔

آرزوؔ کی شاعری کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ کلکتہ گئے اور وہاں انہیں تھیٹر میں زبان کی درستگی اور مکالموں کی ترتیب کا کام سونپا گیا۔ یہاں انہوں نے ٹکسالی زبان کو اپنی غزلوں میں برتا اور بہت سے ایسے الفاظ کو اپنی غزلوں میں استعمال کیا جنہیں یا تو لوگ جانتے ہی نہ تھے یا فصاحت کے منافی سمجھتے تھے۔آرزوؔ کے دوسرے دیوان جہاں آرزوؔ کی غزلیں اس دور کی امتیازی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔ دوسرے دور کی غزلوں میں اکثر مقامات پر نفسیاتی باریکی بینی میں آرزوؔ کی غزلیں اس دور کی امتیازی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔ دوسرے دور کی غزلوں میں اکثر مقامات پر نفسیاتی باریک بینی میں آرزوؔ کی مہارت کا احساس ہوتا ہے۔ بیشتر اشعار نفسیاتی تحلیل و تشریح کا نمونہ ہیں جو ان کے ذاتی مشاہدہ، تجزیۂ باطن اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔آرزوؔ کی شاعری کا تیسرا اہم ترین دور ہے، سریلی بانسری اور ''نشانِ آرزوؔ'' اسی دور کی نمائندگی

کرتے ہیں۔ اس دور کی غزلوں میں گیتوں کی سی فضا ملتی ہے۔ جن سے شاعر کے دل و دماغ کی آسودگی کا پتا چلتا ہے۔ ان غزلوں میں رنج والم کی وہ گھٹی گھٹی فضا نہیں ملتی جو پہلے دو،ادوار میں پائی جاتی ہے۔

آرزو کی غزل گوئی کے یہ تینوں ادوار اُن کے تخلیقی سفر کے ارتقاء کا پتا دیتے ہیں۔ ابتداء میں اُن کے ہاں لکھنو رنگ کی باقیات نظر آتی ہیں لیکن بعد میں انہوں نے لکھنو کے خوش مزاج اور زندہ دل شعراء کی پرانی روش کو چھوڑ کر ایسے اشعار کہے جن میں یاس وحسرت، الم پرستی اور حرماں نصیبی کے مضامین ہیں۔ان کی غزل میں کلاسیکی غزل کا رس اور رچاؤ اور نئے ماحول اور تقاضوں کا شعور دونوں چیزیں موجود ہیں۔ آرزو کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

"انہوں نے میر کی لمبی بحروں میں اور میر کے انداز کی مشابہت لیے ہوئے غزلیں کہی ہیں اور حسن وعشق کی کیفیات کی کہیں کہیں بڑی کامیاب مصوری کی ہے لیکن چونکہ بوساطت اپنے جلال کے وہ خاندانِ ناسخ کے شاعر ہیں۔اس لیے زیادہ تر خارجی اور کم تر داخلی کیفیاتِ حسن وعشق کی مصوری آرزو کے ہاں ملتی ہے۔ آرزو کے یہاں زبان وطرزِ ادا میں وہی سنگھار اور بناؤ پایا جاتا ہے جو مسجع ومرصع نثر میں ہوتا ہے۔"

اسی طرح مجنوں گورکھپوری، آرزو کی غزل پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آرزو ایک ماہر فن کار ہیں، وہ نہ صرف زبان اور محاورہ پر قابو رکھتے ہیں بلکہ عروض کے رموز ونکات سے بھی واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ شعر میں آہنگ کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔ اُن کا کوئی شعر شاید ہی ایسا ہو جو محض ترنم سے اپنی طرف متوجہ نہ کرے اور یہ ترنم ایک تمثیلی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اُردو غزل میں آرزو لکھنوی نے جو اسلوبی اضافے کیے ہیں وہ مستقل قدر وقیمت رکھتے ہیں۔"

[illegible] کے کلام سے چند منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

کیفیت اضطراب کی سی ہے
زندگی موج آب کی سی ہے

شب کو بھی میرے داغ سوزاں میں
روشنی آفتاب کی سی ہے

تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

☆☆☆☆☆

بیسویں صدی کی غزل کا مجموعی جائزہ

گزشتہ صفحات میں ہم نے بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے تناظر میں لکھنو کے غزل گو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اس جائزے میں اہم بات جو ہمارے پیشِ نظر رہی، یہ ہے کہ اُن رجحانات کو تلاش کیا جائے جنہوں نے تقریباً نصف صدی کی لکھنوی غزل کو ایک نیا انداز اور آہنگ بخشا اور اس لکھنوی روایتِ شعری میں بنیادی تبدیلیاں کیں، جو آتش و ناسخ کے دور سے وابستہ رہی ہیں۔ اگرچہ تبدیلیوں کا یہ عمل انیسویں صدی میں شروع ہوگیا تھا، لیکن اس دور میں اُن تغیرات نے واضح شکل اختیار نہیں کی تھی۔ انفرادی سطح پر شعراء کے ہاں سیاسی اور تہذیبی شعور کی واضح بازگشت سنائی دیتی ہے اور اپنے عہد کے کرب اور آشوب کو غزل کا موضوع بنانے کا رجحان ملتا ہے۔ لیکن یہ رجحان اجتماعی سطح پر ایک رویے یا رجحان کی صورت اختیار نہیں کرتا اور یوں غزل کی مجموعی شکل وہی رہتی ہے جسے لکھنویت قرار دے کر مطعون کیا جاتا رہا ہے لیکن یہ طعنہ زنی اکثر صورتِ احوال سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ معترضین اکثر اس حقیقت کو فراموش کردیتے ہیں کہ لکھنو اس دور میں تہذیب کا مرکز بنا جب دلی کہ تہذیبی انتشار نے تمام انسانی قدروں کو پامال کردیا تھا۔ دِلّی کے لٹے پٹے شعراء نے اس کی آغوشِ محبت میں آکر سکون کا سانس لیا اور ایک نئے تہذیبی مرکز کے قیام میں اپنا کردار ادا کیا۔ لکھنوی زندگی کی خوش فکری، خوش فعلی اور خوش مزاجی نے دہلوی شعراء کے ذہن کو ایک خاص لذت پسندی کا عادی بنادیا۔ جس کے نتیجے میں شاعری کے لب و لہجے میں ایک نمایاں تبدیلی کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن

اس صورتِ حال میں لکھنو سے مرثیے جیسی صنف کا پیدا ہونا، اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ لکھنو کے شعراء خود بھی شاعری کے اس انداز سے، جو غزل میں رواج پا گیا تھا، زیادہ مطمئن نہ تھے چناں چہ انہوں نے مرثیے جیسی صنف کو پروان چڑھایا اور ایسے اخلاقی مضامین بیان کئے جن کی غزل متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ مرثیے کی ترقی کا ایک اہم فائدہ غزل کو یہ پہنچا کہ اس کے لہجے میں ایک اہم تبدیلی کے آثار پیدا ہونے لگے۔

اسی لیے بیسویں صدی کے غزل گو شعراء نے غزل کے حقیقی عناصر کو قائم رکھتے ہوئے اس کے مزاج میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں اور یوں اُردو غزل کلاسیکیت اور جدیدیت کے امتزاج سے ایک ترقی یافتہ شکل میں سامنے آئی جہاں تک اسلوب و بیان اور زبان کا تعلق ہے تو جدید غزل متنوع اسالیب کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ بیانیہ، خطیبانہ، رومانی اور علامتی اسالیب انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر نظر آتے ہیں۔ الفاظ کی سادگی ترکیبوں کی چستی محاوروں کی بندش اور اُن کا برمحل استعمال اُن تمام چیزوں نے مل کر بیسویں صدی کی غزل میں سلاست، روانی اور موسیقیت پیدا کردی ہے جس کا ذائقہ ہر زبان شناس اور سخن فہم بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔

حبیبؔ جونپوری کی غزل گوئی

شعراء کی اس برادری سے حبیبؔ جونپوری کا تعلق ہے وہ آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء سے اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی اور لکھنو، سیتاپور، فیض آباد، بارہ بنکی، جونپور، جھانسی، بنارس، الہ آباد، کلکتہ، پٹنہ، حمیر پور، جالون، مچھلی شہر، آگرہ اور غازی آباد کے مشاعروں میں طرحی اور غیر طرحی غزلیں پڑھیں اور پھر لاہور آکر متعدد غزلیں کہیں اور کتنے احباب کو شاعر بنادیا۔ انہوں نے لاہور کینٹ میں پاکستان کے مستند شاعر سید عابد علی عابدؔ کی انجمن کے مقابلے میں متعدد شعراء پر مشتمل

"انجمن آرزوؔ" قائم کی اور پہلو بہ پہلو غزلیں کہیں لیکن افسوس کہ آج ہمیں صرف اُن کی سولہ غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں سید وحیدؔ الحسن ہاشمی صاحب لکھتے ہیں:

"میں نے کئی بار اُن سے غزلوں کا دیوان شائع کرنے کی فرمائش کی لیکن وہ ہاں ہوں کہہ کر ٹالتے رہے یہاں تک کہ ان کی اور میری غیر حاضری میں ان کے کینٹ والے کمرے کی چھت شدید بارش کی وجہ سے ایسی گری کہ اہم کتابیں، اساتذہ کے دیوان، بیاض اور ان کا شعری سرمایہ کافی حد تک تلف ہوگیا۔"

سیتاپور میں آرزوؔ لکھنوی کی صدارت میں طرحی مشاعرہ تھا۔ قوافی اُلجھن، مدفن اور ردیف "ہے" تھی۔ مرحوم حبیبؔ جونپوری نے بڑے اہتمام اور پوری قوت اور قابلیت صرف کرکے سات اشعار کہے اور اپنے استاد آرزوؔ لکھنوی کے پاس غزل برائے اصلاح لکھنو روانہ کی۔ استاد نے اصلاح کئے بغیر یہ لکھ کر غزل واپس کر دی کہ مشاعرے میں صدارت میری ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔

حبیبؔ جونپوری مشاعرے کی تاریخ سے دو تین دن قبل جب پہنچے تو وہاں کچھ اور ہی سماں نظر آیا۔ جگرؔ مراد آبادی اور اُن کے سوسوا سو متعلقین مشاعرے میں شرکت کی تیاری کر رہے تھے۔ جب کہ آرزوؔ لکھنوی کے ہم نواؤں کی تعداد پندرہ افراد سے زیادہ نہ تھی۔ حبیبؔ جونپوری اور آرزوؔ لکھنوی کے دیگر شاگردوں نے تین دنوں میں ڈیڑھ سو افراد شاگرد بنائے اور سب کو لے کر مشاعرے میں پہنچے۔ مشاعرے میں نشست کی عجیب صورت تھی۔ اسٹیج پر اساتذہ فروکش تھے۔ دائیں جانب جگرؔ مراد آبادی کے طرف دار اور بائیں جانب آرزوؔ لکھنوی کے ہم نوا مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ جب کہ ان دونوں پارٹیوں کے پیچھے عوام الناس تھے۔ جب دائیں جانب کا کوئی شاعر شعر پڑھتا تھا تو اسی طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور بائیں جانب والے بالکل خاموش رہتے تھے اور جب بائیں جانب کا کوئی شاعر شعر پڑھتا تھا تو دائیں جانب والے منقار زیر پر

ہو جاتے تھے۔ اسی رسہ کشی میں ایک بجے رات کے قریب حبیبؔ جونپوری نے ترنم سے اپنی غزل شروع کی۔ اب کیا تھا، اُن کی پارٹی والوں نے چیخ چیخ کر داد دی۔ حبیبؔ جونپوری نے دوسرا یہ شعر پڑھا:

قفس سے چھوٹ کر اپنا نشیمن ڈھونڈنے والے

جہاں بجلی گری ہے جا وہیں تیرا نشیمن ہے

مجمع نے تو شعر کو سر پر اُٹھالیا اور مکرر مکرر کی آوازیں بلند ہونے لگیں لیکن اُسی عرصے میں آرزوؔ لکھنوی نے پہلے مصرع کو اس طرح دھرایا:

اندھیری رات میں اپنا نشیمن ڈھونڈنے والے

جب حبیبؔ جونپوری نے اس تبدیل شدہ مصرع کے ساتھ پڑھا تو شعر کی کم اصلاح کی داد زیادہ ہوگئی۔ افسوس کہ حبیبؔ جونپوری کی یہ مضبوط ترین غزل بھی نہیں مل سکی۔

جس زمانے میں حبیبؔ جونپوری نے غزلیں کہنا شروع کیں، آرزوؔ لکھنوی کے علاوہ صفیؔ، ثاقبؔ، اثرؔ، حسرتؔ، دلؔ، سیمابؔ، ناطقؔ، بیخودؔ، عزیزؔ، آغا شاعرؔ، سائلؔ، بے خود بلوی، وحشتؔ، شفیقؔ جونپوری، سراجؔ، قدیرؔ، منظرؔ، جگرؔ اور علامہ اقبالؔ بساطِ شعر پر چھائے ہوئے تھے۔ لیکن حبیبؔ جونپوری نے آرزوؔ کی شاگردی اختیار کر کے گویا یہ تسلیم کرلیا کہ وہ ذہن و عقل و تخیل کے مقابلے میں دلی جذبات اور زبان کی شاعری پسند کرتے ہیں۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ اگر میں آرزوؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار نہ کرتا تو ثاقبؔ لکھنوی کا شاگرد ہو جاتا۔

ان کی ابتدائی غزلوں میں وہی لکھنوی رنگ جھلکتا ہے۔ لفظوں کا برمحل استعمال چست مصرع، محاورات کی بہتات، جذبات کا اظہار، عشق کی مختلف کیفیات کا نقشہ، محبوب سے چھیڑ چھاڑ، وفا اور جفا کے تذکرے، طعن و تشنیع اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر

جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

بے حجابی کا یہ انداز الٰہی توبہ
نازنینوں سے جدا شرم و حیا ہی ہیں

جاتے جاتے رُخِ محبوب کا دیدار ملے
میری نظروں سے کبھی وہ نگہ یار ملے

ان کی نظروں سے تو گھائل ہیں طلب گارِ حیات
اور دل کی یہ طلب ہے وہی تلوار ملے

دل کی دھڑکن سے بس اک نام کی آتی ہے صدا
مدتیں ہو گئیں ان سے مجھے یکبار ملے

شامِ وعدہ گاہ رونا گاہ ہنستا دیکھئے
آپ تو آئے نہیں ورنہ تماشا دیکھئے

سر جھکا کر لے لیا گردن پہ خود خونِ وفا
کس طرح چہرے سے ان کے رنگ اُڑتا دیکھئے

میری خوددار طبیعت کو جگاتے کیوں ہو
جب مجھے بھول چکے سامنے آتے کیوں ہو

برق و باراں کی جو سازش میں ہے مدت سے شریک
آشیانہ اسی ڈالی پہ بناتے کیوں ہو

شیوۂ حسن نہیں راز کا افشا کرنا
تم جسے سن نہیں سکتے ہو سناتے کیوں ہو

وہ آئے بزم میں میرے سوا ملے سب سے
جو میں نے خواب میں دیکھا وہ کوئی خواب نہ تھا

اسے پسند نہ آیا خلوصِ دل نہ سہی
حبیبؔ تیری وفا کا کوئی جواب نہ تھا

مجھے تو آپ کے ہر فیصلے پہ چلنا ہے
جو حکم دیں تو بدل دوں ابھی زمانے کو

انداز دلبری کے دکھا کر کریں گے کیا
آئے وہ میرے بعد تو آ کر کریں گے کیا

اُلفت کے تذکروں پہ ہوں پابندیاں جہاں

اس بے وفا کی بزم میں جا کر کریں گے کیا

۱۹۳۹ء میں حبیبؔ جونپوری کا کیفی اعظمی اور علی سردارؔ جعفری سے میل جول بڑھا تو ترقی پسند مصنفین نے اُردو شاعری کا رخ بدل کر سیاسی کردیا۔ انہوں نے ایک طرف تو قدیم الفاظ کو نئے معنی پہنائے۔ دوسری طرف ایسے ایسے محاورات اور ایسی تراکیب وضع کیں جنہیں سن کر جوان طبقہ بڑا متاثر ہوا۔ حبیبؔ جونپوری کی ۱۹۳۶ء کی درج ذیل غزل شاید اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی ہے:

حکمِ حاکم ہے عزمِ سفر کاٹ دو
قید کرنے سے پہلے ہی پر کاٹ دو

چھاؤں حق ہی نہیں اہلِ افلاس کا
سایہ دیتے ہیں جو وہ شجر کاٹ دو

یہ کیا والیٔ شہر نے فیصلہ
جو جھکاتا نہیں سر تو سر کاٹ دو

دیکھنے دو نہ ایوان ہائے بلند
آنکھ والوں کا تارِ نظر کاٹ دو

روشنی کا غریبوں سے کیا واسطہ
آسمانوں سے رنگِ سحر کاٹ دو

فیض پائے نہ طاقت سے ناطاقتی
رشتۂ آفتاب و قمر کاٹ دو

خود پناہی میں کوئی مزاحم نہ ہو
اس کی خاطر گلوئے بشر کاٹ دو

اے حبیبؔ اب خوشامد ہے اصلِ سخن
خود ہی تم اپنا دستِ ہنر کاٹ دو

اس ایک ہی غزل میں حکمِ حاکم، اہلِ افلاس، سرکاشا، والیِ شہر، ایوان ہائے بلند، روشنی، غریبوں، رنگِ سحر، طاقت، ناطاقتی، خود پناہی، گلوئے بشر، دستِ ہنر کاشا، جیسے الفاظ و تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔ اس غزل کی خود ردیف ''کاٹ دو'' بتاتی ہے کہ اس کا مرجع و منبع حلقہ ترقی پسند مصنفین ہے۔ اگر حبیبؔ جونپوری کی کہی ہوئی اس دور کی غزلیں موجود ہوتیں تو معلوم ہو سکتا تھا کہ انہوں نے کہاں تک اس رنگِ تغزل کو اپنایا۔

اُن کی کیفی اعظمی اور علی سرؔدار جعفری سے دوستی کے متعلق حسین اعظمی لکھتے ہیں:

''کیفی اعظمی اور علی سرؔدار جعفری کی دوستی سے اُن کے رنگِ سخن میں انقلاب خیز فضا پیدا ہوگئی۔ ان کی خوش فکری اور زود گوئی کا یہ عالم ہوگیا کہ وہ غزلیں اور قصیدے کہہ کر نوجوان شعراء کو دے دیتے تھے۔ میں نے اکثر اُن کے پاس نوجوانوں کا جمگھٹا

دیکھا۔ انہیں میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی صاحب کتاب ''حیاتِ زبیر'' بھی تھے۔''

مولانا حبیبؔ جونپوری کی غزلوں میں سیاسی وابستگی اور قومی شعور کسی نہ کسی شعر میں نمایاں ہو ہی جاتا ہے مثلاً:

اُن کو ہے چمن سے کیا مطلب یا پھول کھلیں یا آگ لگے
جن تنکوں نے رشتہ جوڑا تھا چن چن کے جلائے جاتے ہیں

بتلائیں حبیبؔ راز تمہیں کیا شامِ فراق میں ہائے چراغ
کس طرح جلائے جاتے ہیں کس طرح بجھائے جاتے ہیں

اگر حبیبؔ جونپوری کی کہی ہوئی اس دور کی اور غزلوں کو دیکھیں تو یہاں ایک رنگ کبھی کبھی اپنے استاد آرزوؔ لکھنوی کا بھی بڑی خوبی سے جھلک اُٹھتا ہے۔ مثلاً یہ غزل:

تقدیر بگڑتی جاتی ہے گو بات بنائے جاتے ہیں
وہ اتنا ہی روٹھے جاتے ہیں ہم جتنا منائے جاتے ہیں

اب جا کے نہیں آنے والے کچھ طور یہ پائے جاتے ہیں
ہنستے ہیں تسلی دینے کو اور اشک بھی آئے جاتے ہیں

رہ رہ کے دھڑک اُٹھتا ہے جگر اور سانس بھی اکھڑی جاتی ہے
اے موت ٹھہر تعجیل نہ کر دم بھر میں وہ آئے جاتے ہیں

باتوں میں مروت کے رشتے وہ توڑ رہے ہیں ہنس ہنس کر
آنکھوں سے محبت کے ساغر رہ رہ کے پلائے جاتے ہیں

درج ذیل اشعار میں لہجے کا بانکپن اور انفرادیت صاف محسوس کی جاسکتی ہے:

دیکھ کر مجھ کو وہ گھبرایا بہت
ایک آنسو میرے کام آیا بہت

قلب کا آئینہ ٹوٹا تو مگر
غم کے ہر پتھر سے ٹکرایا بہت

وہ تو میرے دل کے اندر تھا کہیں
طور پہ میں جا کے پچھتایا بہت

مشکلیں آتی ہی رہتی ہیں محبت میں حبیب
کیا ضروری ہے کہ ہر راستہ ہموار ملے

ممکن ہے دل کے جلنے سے روشن ہو شہر غم
پی لو نظر جو آئے کہیں دوستی کی آگ

بحرِ ہستی سے تباہی کی شکایت ہے عبث
نقش بہتے ہوئے پانی پہ بناتے کیوں ہو

درد کی لے کا نہیں لحنِ سکوں سے کوئی ربط
میری آواز سے آواز ملاتے کیوں ہو

اک حشر ہے اُس کا کسی کوچے سے گزرنا
رفتار کی حد حدِ قیامت سے ملی ہے

مشکل کی ہر اک شکل پہ میرا ہے تصرف
مجھ کو یہ سند شاہِ ولایت سے ملی ہے

جو سطحِ آب پہ اُبھر اُبھر کے ٹوٹ گیا
وہ میری عمر کا آئینہ تھا حباب نہ تھا

کلیمِ طور کی حالت بدل گئی جس سے
وہ اک نظر کی کرامت تھی انقلاب نہ تھا

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ بیسویں صدی کی غزل جس ڈھب پر اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس میں حبیب

جونپوری کا زیادہ نہ سہی لیکن ایک قابلِ اعتبار حصہ ضرور بنتا ہے۔ انہوں نے حالیؔ اور اُن کے معاصر لکھنوی شعراء کے زیرِ اثر اصلاحِ غزل کا کام نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ ایک ایسے انداز میں غزل کی صورت گری کی وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُن کے ہاں زندگی کے ناپائیدار اور فانی ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اُسے بسر کرنے اور برتنے کا سلیقہ بھی موجود ہے۔ بے عملی اور زندگی سے فراریت کا رجحان جو اس دور کے شعراء کے ہاں نظر آتا ہے، حبیبؔ جونپوری کی غزل میں ایک حقیقت پسندانہ انداز میں مشکلوں اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صورت میں ملتا ہے:

مشکلیں آتی ہی رہتی ہیں محبت میں حبیبؔ
کیا ضروری ہے کہ ہر راستہ ہموار ملے

اُن کی غزلیں پہلو دار ہیں اور غور وفکر کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات کی تپش بھی رکھتی ہیں۔ چند منتخب اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

اُسے پسند نہ آیا خلوصِ دل نہ سہی
حبیبؔ تیری وفا کا کوئی جواب نہ تھا

ذرّے سے جو سنتا ہوں میں سورج کی کہانی
یہ آگہی مدت کی ریاضت سے ملی ہے

گاہکوں نے مرے سر کی تو لگائی قیمت
میری اُلفت کے نہ دنیا میں خریدار ملے

۱۹۵۳ء میں لاہور میں مارشل لاء لگ گیا۔ بڑے بڑے جید عالم گرفتار کر کے قید میں ڈال دیے گئے۔ مولانا مودودی جیسے مشہور عالم کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ مذہبی طاقت پر فوجی طاقت غالب آگئی۔ صرف لاہور نہیں پورے پاکستان کے مسلمانوں کو یہ عمل اچھا نہ لگا اور وہ خاموش احتجاج کرتے رہے۔ اگلے سال ۱۹۵۴ء میں گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی توڑ کر سیاسی طاقت اور سارا اختیار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ابھی سال گزشتہ کا مذہبی ہیجان ختم نہ ہوا تھا کہ سیاسی ہیجان رونما ہوگیا۔ حبیبؔ جونپوری بھی بتقاضائے علم اس صورت حال سے پریشان تھے اور بار بار حافظؔ شیرازی کا یہ مصرع دہرایا کرتے تھے:

طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

معلوم ہوتا ہے کہ ملکی حالات اور حافظؔ شیرازی کی مذکورہ غزل سے متاثر ہو کر حبیبؔ جونپوری نے بھی وہ غزل کہی جو مندرجہ ذیل ہے:

مہبطِ عشق کو گریاں بخدا می بینم
بند ہوتے ہوئے بازارِ وفا می بینم

بے حجابی کا یہ انداز الٰہی توبہ
نازنینوں سے جدا شرم و حیا می بینم

عملِ خیر ہے اللہ کے بندوں پہ گراں
فکرِ انساں میں سبک جرم و خطا می بینم

کوئی سنتا نہیں تسبیح کے دانوں کی پکار
دستِ زہاد میں آلاتِ غنا می بینم

بھیس اپنائے ہے شاہیں کا ہر اک زاغ و زغن
حق نوائی کی جگہ مکر و دغا می بینم

پستیِ ذوقِ مسلماں نے وہ کھائے ہیں فریب
سرنگوں اب علمِ صدق و صفا می بینم

مدحتِ زر میں حبیبؔ اتنے ہیں مشغول ادیب
باغِ افکار میں مسموم ہوا می بینم

حبیبؔ جونپوری ۱۹۵۳ء میں ہندوستان سے پاکستان آگئے اور لاہور میں مستقل قیام کیا۔ لاہور ایک عرصے سے جدید لہجے کا شہر تھا۔ ملکی حالات کی سنگینی نے مزاحمتی رجحان شدید تر کردیا۔ فیض احمد فیض اور ندیم تو پہلے ہی ترقی پسند گروہ میں شامل تھے۔ احسانؔ دانش جیسے کلاسیکل شاعر بھی مزاحمتی غزل کہنے پر مجبور ہوگیا۔ احسان دانش کی ۱۹۵۸ء کی ایک غزل کے دو شعر انہیں بے حد پسند تھے:

جوان خون نئے کھیت کو مفید سہی
زمین فصل کو خود کھا گئی تو کیا ہوگا

نہ رہنماؤں کی محفل میں لے چلو مجھ کو
میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

لاہور ہی کے ایک اور کلاسیکل شاعر محسنؔ برلاس کا مقطع ان کی فکر کو مہمیز کرتا

تمناؤں کا پھر اک قافلہ لے کر چلے محسن
اگر لوٹا گیا یہ بھی سرِ منزل تو کیا ہو گا

حبیبؔ جونپوری کی غزلوں میں یہی رجحان طبع در آیا، ورنہ لکھنو اسکول کے شعراء کی غزلوں میں اس ڈھب کے اشعار شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے:

انسان سے رخصت ہوا معیارِ فضیلت
دستار لاکھوں ہیں مگر سر نہیں ملتا

برق و باراں کی جو سازش میں ہے مدت سے شریک
آشیانہ اسی ڈالی پہ بناتے کیوں ہو
دھوپ جب صحرا میں تڑپانے لگے
ایک ٹہنی کا بھی ہے سایہ بہت

حبیبؔ ان کو کبھی ان رہزنوں کا خوف نہیں
جو اپنے گاؤں میں کچے مکاں بناتے ہیں

طنز کی رو غالبؔ و مومنؔ سے ہوتی ہوئی یگانہؔ چنگیزی تک پہنچی۔ حبیبؔ کے کلام میں اور اُن کے لہجے میں جو تیزی ہے، ممکن ہے وہ یگانہؔ ہی کی صحبت کا اثر ہو۔ کیوں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ یگانہؔ کی محفلوں اور مجلسوں میں کثرت سے شرکت کرنے لگے تھے۔ یگانہؔ کی غزل کا درج ذیل شعر اس دور میں بہت مشہور تھا۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہؔ خدا بنا نہ گیا

اس سلسلے میں حبیب جونپوری کے چند طنزیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

انداز دلبری کے دکھا کر کریں گے کیا
آئے وہ میرے بعد تو آکر کریں گے کیا

الفت کے تذکروں پہ ہوں پابندیاں جہاں
اس بے وفا کی بزم میں جا کر کریں گے کیا

جب اُن کے شغل کو ہے اندھیروں سے اجتناب
ہم مشعلِ حیات بجھا کر کریں گے کیا

یہ تو ممکن نہ تھا وفا کرتے
آپ مل کر بھی مجھ سے کیا کرتے

آ تو جاتے کہ وقتِ آخر تھا
میرے مرنے ہی کی دعا کرتے

نہ ملے وہ نہ حسرتیں نکلیں
کٹ گئی عمر مدّعا کرتے

جو ہیں نا آشنا کے حرف وفا
وہ کسی سے کہاں وفا کرتے

ان کے آنے سے میں نہ جی جاتا
رسم دنیا تو وہ ادا کرتے

ذرا بتائیں جو فرقت میں ہم پہ بیت گئی
یہ وقت آپ پہ پڑتا تو آپ کیا کرتے

پھر دیکھنا سفید پروں پر سیاہ داغ
روشن کبھی تو ہوگی میری بے بسی کی آگ

غزل کی ردیف ہے "آگ" اس کے دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

اُٹھ، کہ اٹھتی نہیں اب سینہ ایام سے آگ
دل آفاق پہ برسا اُفق جام سے آگ

دور ہے راوی ایمن ہو کر طور سینا
اب یہ موقع ہے کہ برسادے ہر اک بام سے آگ

اسی طرح حبیب جونپوری کی ردیف "آگ" والی غزل ملاحظہ کیجئے۔

دنیا کو پھونک دے گی یہی خامشی کی آگ
دیکھی کہاں کسی نے ابھی زندگی کی آگ

پھر دیکھنا سفید پہ سیاہ داغ
روشن کبھی تو ہوگی میری بے بسی کی آگ

موقع ملے تو تیرگیِ دل بھی دیکھنا
پہچانتے ہو تم تو فقط روشنی کی آگ

طبعِ بشر میں عنصرِ آتش بھی ہے نہاں
اکثر بھڑک بھی جاتی ہے سادہ دلی کی آگ

سارے جہاں کو قطعِ محبت کی دھمکیاں
تنہا رہو گے پال کے دل میں خودی کی آگ

ممکن ہے دل کے جلنے سے روشن ہو شہرِ غم
پی لو نظر جو آئے کہیں دوستی کی آگ

اے دوست اس ادا پہ فدا ہے دلِ حبیب
پیاری ہے تجھ سے بڑھ کے تری برہمی کی آگ

حبیب جونپوری کے کلام میں فلسفہ کا اثر موجود ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے اصل شاعری اور فلسفہ میں ایک بعد ہے۔ ۔۔۔ شاعری کے مبالغوں اور غلط بیانیوں

کو برداشت نہیں کرسکتا۔ چوں کہ اس کا تعلق ٹھوس حقیقت سے ہوتا ہے اور شاعری خشک مسائل کی تلخی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ چوں کہ اس کا مقصد انسانی جذبات کو تحریک دینا، ہیجان میں لانا، یا ان کی تسکین بخشنا ہوتا ہے۔ پھر بھی جن لوگوں کو فلسفہ اور شاعری دونوں سے لگاؤ ہوتا ہے یا وہ شاعرانہ طبیعتیں جو غور وفکر کی عادی ہوتی ہیں، ان کے کلام میں فلسفہ کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے شاعروں کی دو قسمیں ہیں، اوّل وہ جن کا فلسفہ، ذہنی ترکیب کے اعتبار سے اُن کی شاعری پر مقدم اور غالب ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جن کی شاعری اُن کے فلسفہ پر مقدم ہوتی ہے۔ پہلے قسم کے شعراء ابھی دنیا نے بہت کم پیدا کیے ہیں۔ وہ فلسفہ کے مسائل کو اس لیے شاعری کا رنگ دیتے ہیں کہ وہ عام فہم اور قابلِ قبول صورت میں عوام تک پہنچ جائیں۔ اس کی مثال اُردو میں علامہ اقبالؔ ہیں۔

دوسرے قسم کے حضرات وہ ہیں، جن کے پیشِ نظر اصل مقصد شاعری ہے مگر چوں کہ طبیعت سوچنے اور غور وفکر کرنے کی عادی ہے۔ اس لیے اکثر زبان وقلم سے ایسے اشعار نکل جاتے ہیں جو فلسفیانہ مسائل کے حامل ہوتے ہیں۔ اس قسم کے شعراء کی ہر زبان میں کافی ہوتی ہے۔ حبیبؔ جونپوری کا شمار بھی ان ہی حضرات میں ہے وہ خود مستقل حیثیت کے فلسفی نہیں ہیں مگر ان کے کلام میں فلسفہ کی مثالیں ضرور ملتی ہیں: مثلاً

دھوپ جب صحرا میں تڑپانے لگے
ایک ٹہنی کا بھی ہے سایہ بہت

وہ تو میرے دل کے اندر تھا مکیں
طور پہ میں جا کے پچھتاتا بہت

دنیا کو پھونک دے گی یہی خامشی کی آگ
دیکھی کہاں کسی نے ابھی زندگی کی آگ

طبع بشر میں عنصر آتش بھی ہے نہاں
اکثر بھڑک بھی جاتی ہے سادہ دلی کی آگ

پیشانیاں ڈھونڈیں تو کہاں اپنا ٹھکانہ
سجدوں کا جو مرکز تھا وہی در نہیں ملتا

عالم کو بہاراں ہے کئے اس کی تمنا
گلشن کو مہک پھول کی صحبت سے ملی ہے

ذرے سے جو سنتا ہوں سورج کی کہانی
یہ آگہی مدت کی ریاضت سے ملی ہے

اس قوم کو اب کوئی بھٹکنے کا نہیں ڈر
منزل جسے صدیوں کی مسافت سے ملی ہے

اب آگے حشر میں کیا ہوگیا بود و باش حیات
ہم اس مقام تک انسانیت کو لائے ہیں

ادائے حسن تو طالب ہے جاں نثاری کی
کلیم کیسے تجلی کا سامنا کرتے

وفا ہے آج بھی حل من مزید کی طالب
حبیب مر گئے کتنے وفا وفا کر کے

بیگانہ رسومِ پرستش ہے جب یہ دل
کعبہ بسا لیا تو بسا کر کریں گے کیا

سوال عشق پہ جن و ملک رہے خاموش
ہمیں چنے گئے یہ بارِ غم اٹھانے کو

کلیم طور کی حالت بدل گئی جس سے
وہ اِک نظر کی کرامت تھی انقلاب نہ تھا

بحر ہستی سے تباہی کی شکایت ہے عبث
نقش بہتے ہوئے پانی پہ بناتے کیوں ہو

چار دن میں اپنی صورت ہی نہ پہچانی گئی
ہم کہاں سے زندگی لاتے کہ دنیا دیکھتے

حبیب جونپوری کی غزل میں کہیں کہیں سرگوشی کا سا لہجہ بھی ملتا ہے مثلاً

جس کا مجھے ارماں ہے وہ اکثر نہیں ملتا
میں ہوش میں ہوں اور مجھے گھر نہیں ملتا

جو چاہے سنے ہے یہ مرے قلب کی آواز
جو حق ہے مرا سب کے برابر نہیں ملتا

جب تک طلب صبر تھی دل نے نہ دیا ساتھ
اب ذوق ستم ہے تو ستمگر نہیں ملتا

دیوانگی شوق کا کیسے ہو نظارا
سر پھوڑنا چاہوں بھی تو پتھر نہیں ملتا

تم کو تو حبیب اس نے صدا دی ہے کئی بار
ایسا تو کسی کو بھی مقدر نہیں ملتا

حبیب جونپوری اپنی غزلوں میں کہیں کہیں محبوب کو یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ آج تم کو جو یہ شہرت اور عزت ملی ہے اور جو یہ محبت ملی ہے۔ اس کی وجہ صرف میں ہوں: مثلاً کہتے ہیں:

تم یاد نہ رکھو مجھے لیکن یہ رہے یاد
شہرت تمہیں میری ہی محبت سے ملی ہے

حبیب جونپوری کے ہاں جذبہ اور فکر ایک توازن کے ساتھ اپنی موجودگی کا اعلان کرتے ہیں اور بالآخر ایک نقطے پر مرتکز ہو کر کلیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ حبیب جونپوری کے ہاں جذبے اور احساس کی یہی سطح دکھائی دیتی ہے جو کلاسیکی مزاج سے ہم آہنگ ہو کر جدید اُردو غزل کا آہنگ ترتیب دیتی ہے۔ اپنے عہد کے مسائل، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کا عمل اور انتشار اُن کے ہاں ایک حزینہ کیفیت کو جنم دیتے ہیں: مثلاً حبیب جونپوری کہتے ہیں:

لبوں سے جن کے برستے تھے قہقہے دن رات
وہ لوگ آج ترستے ہیں مسکرانے کو

وہی زمانہ جو ہنستا تھا زندگی پہ میری
چلا ہوں چھوڑ کے روتے اُسی زمانے کو

جس کے سننے کو جہاں میں کوئی تیار نہیں
تم حبیب ایسے فسانے کو سناتے کیوں ہو

چار دن میں اپنی صورت ہی نہ پہچانی گئی
ہم کہاں سے زندگی لاتے کہ دنیا دیکھتے

مشکلیں آتی ہی رہتی ہیں محبت میں حبیب
کیا ضروری ہے کہ ہر راستہ ہموار ملے

جانے وہ کون تھا جس کو کہیں سایہ نہ ملا
کچھ نشاناتِ محبت پسِ دیوار ملے

عالمِ وقت کی تضحیک ہے اُمت کا شکار
حاکمِ وقت کی اب مدح و ثنا می بینم

بھیس اپنائے ہے شاہیں کا ہر اک زاغ و زغن
حق نوائی کی جگہ مکر و دغا می بینم

پستی ذوقِ مسلماں نے وہ کھائے ہیں فریب
سرنگوں اب علم صدق و صفا می بینم

مدحتِ زر میں حبیب اتنے ہی مشغول ادیب
باغِ افکار میں مسموم ہوا می بینم

حبیبؔ جونپوری کی غزل اُن کے تجربات کی ہمہ نوع جہتوں کو آشکار کرتی ہے اور ان کی غزلوں میں کہیں کہیں ان کی آواز ایک گھن گرج اور خطابت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور غزلوں کے لہجے میں اس زور، اس شکوہ اور اس گھن گرج کا پیدا ہونا، صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ شاعر کی چشمِ بینا زمانے کی ناانصافی اور حق شناسی کو دیکھنے کی تاب رکھتی ہو، اور اس کا قلب وانا اس ناانصافی اور حق شناسی کی پردہ دری کی جرأت رکھتا ہو، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا قلم تلوار بن کر اس حق ناشناسی کے استعمال کو اپنا فنی

منصب جان کر وہ کہہ سکے، جسے کہنا مصلحت اندیشی کے تقاضوں کے خلاف ہے جیسا کہ اوپر اشعار میں عیاں ہے۔

عالم وقت کی تضحیک ہے امت کا شکار
حاکم وقت کی اب مدح و ثناسی ہیئم

چھاؤں حق ہی نہیں اہل افلاس کا
سایہ دیتے ہیں جو وہ شجر کاٹ دو

یہ کیا والئی شہر نے فیصلہ
جو جھکاتا نہیں سر تو سر کاٹ دو

دیکھنے دو ایوانہائے بلند
آنکھ والوں کا تار نظر کاٹ دو

حبیبؔ جونپوری کے مندرجہ بالا اشعار نوکر شاہی کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں ذاتی کرب اور سماجی کرب ایک ہو کر شاعر کو یاسیت کے کنارے تک لے جاتا ہے لیکن یہ یاسیت قنوطیت میں تبدیل نہیں ہونے پاتی۔ ان کی شاعری زندگی کی حقیقتوں اور تجربوں کی شاعری ہے۔ زندگی کی حقیقتیں اور تجربات طرب انگیز کم اور الم انگیز زیادہ ہیں۔ ویسے بھی شاعر کا احساس زندگی کی طرب انگیزیوں سے کم ہی حصہ پاتا ہے۔ اس کے سامنے تو زندگی ایک جبر مسلسل کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ جو ہمہ وقت تلخی ایام کی کہانی دہراتی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

تقدیر بگڑتی جاتی ہے گو بات بنائے جاتے ہیں
وہ اتنا ہی روٹھے جاتے ہیں ہم جتنا منائے جاتے ہیں

درد و غم عشق بتاں ضبط فغاں
اب ہے میرے پاس سرمایا بہت

دھوپ جب صحرا میں تڑپانے لگے
ایک ٹہنی کا بھی ہے سایہ بہت

مرے ہی باغ وفا سے نہ پھل ملے مجھ کو
مگر میں خوش ہوں کہ کچھ ڈالیوں کے سایے میں

اسے پسند نہ آیا خلوص دل نہ سہی
حبیب تیری وفا کا کوئی جواب نہ تھا

گاہکوں نے مرے سر کی تو لگائی قیمت
میری اُلفت کے نہ دنیا میں خریدار تھا

حبیب جونپوری کی غزل میں تنہائیوں کے ساتھ تعلق اور محبوب کی یادوں کے رشتے میں تلخی ایام کو گوارا بنانے کی کوشش ملتی ہے۔ کہتے ہیں:

ذرا سے دل میں محبت کا سوز لائے ہیں
جو اٹھ سکا نہ کسی سے وہ بار اٹھائے ہیں

جہاں جہاں ترا نقش قدم نظر آیا
کسی نے بیٹھ کے آنسو وہیں بہائے ہیں

تمام عمر مری آنکھ سے وہ دور رہا
یہ وہ چمن تھا جو منت کش گلاب نہ تھا

میری خوددار طبیعت کو جگانے کیوں ہو
جب مجھے بھول چکے سامنے آتے کیوں ہو

میرے مشرب میں محبت کی نمائش ہے حرام
بزم اغیار سے شکوہ ہے تو جانے کیوں ہو

شام وعدہ گاہ رونا گاہ ہنسنا دیکھتے
آپ تو آئے نہیں ورنہ تماشا دیکھتے

اپنی صورت اپنا پر تو اپنا جلوہ دیکھتے
آپ دل کو توڑ دیتے تو تماشا دیکھتے

کاش جو انجام موسیٰ پر ہیں نازاں اے حبیبؔ
ایک دن میرا بھی وہ ذوق نظارہ دیکھتے

جاتے جاتے رُخ محبوب کا دیدار ملے
میری نظروں سے کبھی وہ نگہ یار ملے

دل کی دھڑکن سے بس اک نام کی آتی ہے صدا
مدتیں ہوگئیں ان سے مجھے یکبار ملے

عمر بھر رازِ تمنا کو چھپایا میں نے
مٹ گیا میں تو مرے عشق کے آثار ملے

حبیبؔ جونپوری کے عہد میں جب کہ شعری بساط پر اکھڑتی اور ریزہ ریزہ ہوکر بکھرتی صداؤں کی یورش ہے۔ حبیبؔ جونپوری نے ان ٹوٹی ہوئی صداؤں کے درمیان ایک بھرپور، توانا اور مستحکم آواز کو ابھارا ہے۔ اُن کی غزلیں انتشاری کیفیات اور ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہوئی شخصیت کے اظہار کی بجائے ایک مجتمع آواز کے نقش ابھارتی ہیں۔ حبیبؔ جونپوری کی غزل فن کار کی داخلی اور روحانی تنظیم کی مثال ہے۔ یہ غزلیں ایک منظم شخصیت کی فنکارانہ شہادت ہیں۔

حبیبؔ جونپوری کی بعض غزلیں کائنات کے روح فرسا اور زہرہ گداز شور میں فرد کی بے باکانہ للکار کے مماثل ہیں۔ اُن کا مردانہ لہجہ، تپے ہوئے لوہے کی طرح بھاری آواز اور کہیں کہیں جارحانہ معاشرے کے کھوکھلے انفعالی اور تصنع آمیز رویوں کے خلاف

ایک شعری جہاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۷۶ء کے بعد حبیبؔ جونپوری لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے۔ کراچی میں اُن پر وہ افتاد پڑی کہ شعر و شاعری کی فرصت ہی نہ ملی اور وہ آخر دم تک میرؔ حسن کا یہی شعر گنگناتے رہے۔

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

اپنی تمام دشواریوں، پریشانیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اُن کی غزلوں میں قدیم اور جدید رنگوں کا حسین امتزاج ہے۔ اگر ایک طرف عشق و عاشق کے مسائل کی تشریح و توضیح ہے تو دوسری طرف قوم کو خواب سے بیدار کرنے کا جذبہ ہے۔ ہر دو صورتوں میں اُن کی غزلوں میں جرأت کی چوما چاٹی ہے نہ رند اور صبا کا ابتذال ہے۔ اُن کی غزلیں مختلف ادوار کا آئینہ دکھاتی ہیں جس میں سوز و غم بھی ہے اور روحانیت کے ساتھ آزادی کی تڑپ رکھنے والے مجاہد کی للکار بھی ہے۔

پروفیسر سحرؔ انصاری حبیبؔ جونپوری کی شاعری پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

"اُن کی زندگی متنوع واقعات کا مجموعہ تھی۔ انہوں نے زندگی کے تجربات کو محسوس کیا اور خدمتِ خلق اور تخلیقِ شعر کے ذریعے دنیا کی راہنمائی بھی کی۔"

آگے لکھتے ہیں:

"مولانا حبیبؒ نے اپنے کلام کی اشاعت، ترتیب و تدوین پر بہت کم توجہ دی۔ اگر وہ دیگر شعراء کی ایک منظم انداز میں شاعرانہ تخلیقات کی اشاعت فرماتے تو بلاشبہ انہیں ادب میں وہ مقام ملتا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ لوگ

مولانا حبیبؔ جونپوری کے مقام و مرتبہ سے اُن کی زندگی میں آگاہ نہیں تھے۔ روشن زمانہ تو یہی ہے جس کی طرف غالبؔ نے بڑی خوبی سے اشارہ کیا ہے۔

تو اے کہ محوِ سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

پروفیسر عبدالکریم خالد لکھتے ہیں:

"غزلیں انہوں نے کم کہیں ہیں لیکن جتنی بھی کہی ہیں، ان میں ان کا اپنا ایک خاص انداز اور روایت کی پاس داری مل جل کر نئے لہجے کی خبر دیتے ہیں۔"

مندرجہ بالا آرا سے پتا چلتا ہے حبیبؔ جونپوری کی غزل کے یہ ملے جلے رنگ ایک ایسے شاعر کا پتا دیتے ہیں جو بیک وقت قدیم اور جدید کے رویوں کی آمیزش سے ایک ایسا پیکر تخلیق کرتا ہے جو نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ فنی اور تخلیقی سطح پر فن کی نئی دنیاؤں کا متلاشی بھی ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ حبیبؔ جونپوری کی غزل اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے روایت اور اپنے عہد کے اسلوب کا خوب صورت امتزاج ہے۔ انہوں نے اپنی غزل میں وہ سوز و گداز پیدا کیا جس کی جڑیں اُن کے رثائی کلام میں موجود ہیں۔ حبیبؔ جونپوری اپنے تخیل کے زور پر اور اسلوب کے بل بوتے پر ان جڑوں پر ایسا شجر سایہ دار استوار کرتے ہیں جو غزل کی فضا میں برگ و بار پیدا کرتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی غزل لطفِ کلام اور اثر کے اعتبار سے انیس بیں ویں صدی کے قابلِ ذکر غزل گو شعراء میں ایک اہم مقام عطا کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

نظم...... مختصر تعارف

نظم ایک اکائی یونٹ ایک، وحدت اور شعری تجربے کا نقطۂ ارتکاز ہے۔ نظم کی کرافٹ میں کسی ایک خیال، ایک عنوان، ایک مصرع یا ایک مشاہدے کو پہلے مرتکز کیا جاتا ہے پھر لفظوں میں سمو دیا جاتا ہے۔ نظم تخصیص کا عمل ہے، جہاں معانی اور گرداب کی تلاش ہے۔ نظم دریافت، بازیافت اور طویل فکری مسافت کی ایسی تخلیقی سرگرمی ہے جس میں مقامیت سے لے کر آفاقیت تک تمام زاویے سمٹ آتے ہیں۔

عہدِ گزشتہ کی نظم ہو یا عہدِ حاضر کی۔ اس کا تنقیدی تجزیہ کیا جائے تو بنیادی حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر عہد میں موضوع اور اظہار دونوں سطحوں پر نظم اپنا پیرہن بدلتی رہی ہے۔ روایتی فارم اور فریم توڑتے ہوئے نظم بڑی سرعت سے نئے آفاق اور نئی جہات کی طرف سرگرم سفر رہی ہے۔

اُردو نظم کا سفر اپنے عہد کے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور تہذیبی سفر کے متوازی جارہا ہے۔ جو نظمیں لکھی جاتی ہے، وہ اپنے دور کے انتشار، فسادات، امید اور مایوسی کی داستان سناتی ہیں۔ جوں جوں سیاسی حالات جبر اور گھٹن کا شکار ہوتے جاتے ہیں، نظم میں ابہام، علامت اور لسانی شکست و ریخت جھلکنے لگتے ہیں اور قومی احساسات کی از سرِ نو دریافت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

نظم نگاروں نے ملکی، قومی اور کائناتی مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور اپنے گہرے تہذیبی شعور، تخلیقی آگہی، عرفانِ ذات، جدید طرزِ احساس، عمیق مطالعے و مشاہدے اور مزاج کی موزونیت کی وجہ سے اسے نقطۂ کمال پر لا کھڑا کیا ہے۔

بیس ویں صدی کی اُردو نظم

بیس ویں صدی میں جس صنفِ سخن نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی اور غزل کی طرح اپنے پیچھے ایک مضبوط روایت نہ ہونے کے باوجود نت نئے تجربات کے ذریعے مضبوطی سے اپنے قدم جما لیے، وہ نظم کی صنف ہے۔

بیس ویں صدی کی اُردو شاعری بدلتے ہوئے حالات، واقعات، نئی قدروں اور جدید لہجے کی بازیافت کے عمل سے عبارت ہے اور اس عمل کے نتیجے میں ابھرنے والے شعور کے پیش منظر میں ترتیب پاتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے لے کر انیس ویں صدی کے وسط تک تقریباً ڈیڑھ سو سال کا زمانہ اُردو شاعری کے ارتقاء کا زمانہ ہے۔ دلی اور لکھنو دو اہم ادبی اور تہذیبی مراکز میں پروان چڑھنے والی شاعری نے بحرانوں اور انقلابات میں صورت پذیری کے اَن گنت مراحل طے کیے ہیں۔ غالبؔ کا عہد، گزشتہ ایک سو پچاس سالہ شاعری کا حرفِ آخر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اُردو شاعری کی نئی جہتوں اور سانچوں کی دریافت نے اس شمع خانے میں نئے چراغ روشن کیے جن کی روشنی پرانے چراغوں کی مدھم ہوتی لو سے مل کر بیس ویں صدی کی آخری دہائی تک پہنچ رہی ہے۔

بیس ویں صدی کا آغاز، سرزمینِ ہند پر وقوع پذیر ہونے والے بے شمار عوامل سے ہوتا ہے، جنھوں نے اس خطے کے لوگوں کی سوچ اور فکر میں دور رس تبدیلیاں پیدا کیں۔ یہ تبدیلیاں ایک ایسے تاریخی شعور کا باعث بنیں جس نے اُردو شاعری میں ایک

بالکل نئی اور تازہ صورتِ حال کو جنم دیا۔ یہ ایسے تاریخی شعور کا نتیجہ تھا کہ فکر کے نئے زاویے، انسانی زندگی کے نئے موضوعات اور بیان کے نئے اسالیب اُردو شاعری میں در آئے اور یوں اس کی تفریحی و ذوقی حیثیت منقلب ہو کر اجتماعی مقاصد اور سماجی زندگی سے روشناس ہوئی اور اس نے اخلاقی، فکری، سماجی، تہذیبی اور مذہبی موضوعات کے لیے اپنا دامن کشادہ کر دیا۔ شاعری کی اس قلبی ماہیت میں جہاں دیگر عوامل کار فرما تھے۔ وہاں سرسید تحریک سے وابستہ اُن شعراء کی شعوری کاوشیں بھی شامل تھیں، جنہوں نے شاعری کو سماجی میلانات کا آئینہ دار بنا دیا۔

یوں کہہ لیجیے کہ اس عہد کے شعراء نے اپنے سماجی اور تاریخی شعور سے رشتہ جوڑ کر اپنی ذات کی طرف رجوع کرنے کے بجائے عصری تقاضوں کو پہچانا اور انہیں شاعری میں پیش کیا۔

یہاں اس امر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ بیس ویں صدی کے اس عہد میں روایت سے مکمل طور پر تعلق ختم نہیں ہوا بلکہ کئی ایک شعراء کے یہاں روایت کہیں مکمل طور پر اور کہیں جزوی طور پر قائم رہی۔ اس سلسلے میں ان غزل گو شعراء کی مثال ہمارے سامنے ہے، جنہوں نے جدید شعری تحریکوں کے نتیجے میں بپا ہونے والی نئی صورتِ حال میں بھی روایت سے ناتا نہیں توڑا اور کلاسیکی غزل سے بجھتے ہوئے چراغ کو بچانے کے جتن کرتے رہے، لیکن نظم کے مقابلے میں غزل کو وہ اہمیت نہ مل سکی جو ماضی میں اُسے حاصل تھی، تاہم غزل میں ایک کام ضرور ہوا کہ ابتدائی چند عشروں کو چھوڑ کر بعد کے ادوار کی غزل میں موضوعات کے تنوع اور سماجی میلانات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ یہ عہد اپنی بوقلمونی اور رنگا رنگی کے کئی مظاہر رکھتا ہے۔ ان تمام مظاہر کو احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ البتہ نظم کے حوالے سے اس طویل دور کی عہد بہ عہد اجتماعی صورتِ حال، متنوع رجحانات اور مختلف شعری تحاریک کا عمومی جائزہ اس باب میں پیش

کیا جائے گا۔

اُردو نظم اپنی مختلف صورتوں میں اُردو شاعری کے آغاز ہی سے موجود تھی۔ قلی قطب شاہ سے لے کر نظیر اکبر آبادی تک نظم کا اطلاق، ماسوائے غزل، تقریباً ہر صنفِ سخن پر کیا جاتا رہا ہے، لیکن جب "نظم" کا لفظ شاعری کی مخصوص صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد اشعار کا ایسا مجموعہ ہے جو اپنے مرکزی موضوع اور ارتقائے خیال کے سبب تسلسل کا احساس پیدا کرے۔ نظیر اکبر آبادی نظم کے اسی تصور کو لے کر اُٹھے اور یوں اپنی نظموں کے ذریعے زندگی کے اَن گنت گوشوں کو منور کر گئے۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد ایک طویل عرصے تک اُردو نظم کا میدان خالی رہا۔ یہاں تک کہ انیس ویں صدی کی نویں کی دہائی میں ہندوستان کی سماجی زندگی ایسے ڈھب پر آ گئی کہ شعوری طور پر غزل کے مقابلے میں نظم کو اہمیت دینے کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔

محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے ذریعے شعراء کو باقاعدہ نظم کہنے پر آمادہ کیا اور ایسے مشاعروں کی بنیاد رکھی جن میں موضوعی نظمیں پیش کی جاتی تھیں۔ یہ مشاعرے ایک برس تک جاری رہ کر بند ہو گئے، لیکن نظم نگاری کے جس نئے رجحان کی طرح ڈال گئی، بیس ویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک بڑی تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ انجمن پنجاب کے چند ابتدائی مشاعروں میں حالؔی بھی شریک ہوئے۔

الطاف حسین حالؔی

چنانچہ حالؔی (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۱۴) کی اکثر منظومات، مثنویوں اور قطعات وغیرہ پر اس تحریک کی چھاپ نظر آتی ہے اور آزاؔد اور حالؔی کو نظم کے سلسلے میں اس لیے اوّلیت حاصل ہے کہ انہوں نے "نیچرل شاعری" کی تحریک کے ذریعے اُردو میں "جدید نظم نگاری" کی بنیاد رکھی اور ۔۔۔ قومی اصلاح کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ آزاد اور حالؔی

نے جدید نظم کا تصور پیش کیا۔ اس نے ان کے معاصر شعراء کو ہی نہیں بلکہ بیس ویں صدی کے اوائل کے اکثر شعراء کو متاثر کیا۔ حالؔی اور آزادؔ کے علاوہ مولوی نذیر احمد، اسمٰعیؔل میرٹھی، شبلؔی نعمانی، اکبرؔ الہ آبادی، نادرؔ کاکوروی، نظمؔ طباطبائی، عظمتؔ اللہ خاں، شوقؔ قدوائی، برج نرائن چکبستؔ، خوشی محمد ناظرؔ، ظفرعلی خان، جوشؔ ملیح آبادی، اخترؔ شیرانی، حفیظؔ جالندھری جیسے نظم گوشعرا نے اُردو شاعری میں نئے رجحانات کو پروان چڑھا کر آزادؔ اور حالؔی کی جدید شاعری کی تحریک کو قوت بخشی۔ زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ تمام شعراء (چند ایک کو چھوڑ کر) ایک دوسرے کے ہم عصر ہیں اور یہ وہی دور ہے جس میں ایک مضبوط اور توانا آواز علامہ اقبالؔ (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۸ء) کی صورت میں بلند ہوتی سنائی دیتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ آواز نہ صرف بیس ویں صدی کے تمام عشروں پر محیط ہوجاتی ہے بلکہ اُردو شاعری میں ایک نشانِ راہ قرار پائی ہے۔ اقبالؔ نے اپنے تصورات اور اظہار کی نوعیت کے اعتبار سے دیگر شعراء سے الگ ایک راستہ منتخب کیا اور اُردو نظم میں معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے قابلِ قدر اضافے کیے اور اس صنف کو نئے امکانات سے بہرہ ور کیا۔

اُن شعراء کے ہاں اپنے عہد کے مخصوص سیاسی وسماجی حالات کے پس منظر میں ایک خاص طرح منظّم اور اجتماعی طرزِ احساس، قومی مسائل کا بیان اور اُن کا علمی و عقلی حل ملتا ہے اور جذباتی ومحسوساتی سطح پر آسودگی بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ ذہن وفکر اور وسعتِ نظر کے سلسلے راہ پاتے نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ عہد اپنے سیاسی میلانات اور سماجی رجحانات کے اعتبار سے حکمرانوں اور رعایا کی باہمی آویزشوں اور رنجشوں کا عہد ہے۔ جدید علوم وفنون اور افکارِ نو، صدیوں پرانے تصورات سے وابستہ ذہنوں میں تشکیک کی چنگاریاں پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سرسید تحریک کے گمبھیر اثرات اپنی جگہ پر، لیکن اسلام کے عقائد وتصورات کی عقلی تاویلوں نے ان چنگاریوں کو اور ہوا دی۔ مغربی علوم کے زیرِ اثر عقلیت، نیچر، سائنس، مادیت اور ارضیت کے تصورات نے مسلمانوں کے

مقاصد پر گہرا اثر ڈالا اور بقول شمس الدین صدیقی:

"اُن کا اپنے مذہب، اپنی تاریخ، اپنی روایت، اپنی ثقافت، اپنی معاشرت اور اپنے تصورات و اقدار پر یقین و اعتماد کم ہونے لگا۔ احساسِ کمتری کی رو میں بہہ کر ملتِ اسلامیہ اپنی شخصیت کو مسخ کرتی ہوئی اپنے مرکز اور اپنی بنیاد سے ہٹنے لگی۔"

چنانچہ اس عہد کی شعری صورتِ حال میں جہاں ان مغربی اثرات اور مغرب زدہ لوگوں کے خلاف ایک شدید ردِعمل نظر آتا ہے، وہاں زندگی کی مادی ضرورتوں کو قابلِ توجہ قرار دیتا ہوا ایک ہمہ گیر اصلاحی اور مقصدی رجحان بھی صاف دیکھا جاسکتا ہے، ان دونوں رویوں میں قوم کا درد اور ہمدردی ایک قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے۔ مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو قوم پرستی اور حب الوطنی کی لے (جس کا نقطۂ آغاز انجمن پنجاب کے مشاعروں کو قرار دینا چاہیے)۔ بیس ویں صدی کی ابتدائی چار دہائیوں کی شاعری میں تیز تر ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حالؔی کی مسدس نے جس ملی رجحان کی بنیاد رکھی تھی، وہ آگے چل کر تقریباً تمام شعراء کے ہاں ملی نظموں کی صورت میں بلندیوں کو چھونے لگتا ہے۔

آزؔاد اور حالؔی نے انگریزوں کے توسط سے مناظرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت کو شعوری طور پر اپنی نظموں کا موضوع بنایا تھا۔ یہ سلسلہ بعد کی شاعری کا تجربہ بھی بنا۔ متعدد شعراء نے انگریزی نظموں کے تراجم کیے اور نئے مضامین اور جدید اسالیب اظہار سے اُردو شاعری کو متعارف کروایا۔ اس سلسلے میں ہیئت کے تجربات بھی ہوئے۔ اگرچہ آزؔاد ہیئت کے نئے تجربے کی طرح ڈال چکے تھے، تاہم اس کی ایک آدھ مثال ہی ان کے ہاں نظر آتی ہے۔ لیکن بعد میں اسمٰعیل میرٹھی، شررؔ اور نظم طباطبائی نے بے قافیہ نظموں اور نظمِ معریٰ کے ذریعے ان متنوع تجربات میں پیش رفت کی۔ لیکن یہ تجربات اس دور میں زیادہ کامیاب نہیں رہے اور مقبول نہ ہوسکے۔ سرسید تحریک کی عقلیت اور اجتماعیت نے

جہاں اُردو شاعری کو ایک نیا زاویہ بخشا تھا، وہاں اس کے خلاف مختلف سطحوں پر ردِعمل بھی ظاہر ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ ایک اہم ردِعمل رومانیت کی صورت میں سامنے آیا، جس کی اوّلین صورت اقبالؔ کے یہاں نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؔ

''اقبالؔ نے انسانی احساسات کو فطرت کے پُراسرار عمل سے پہلی مرتبہ روشناس کرایا اور اس کی پہنائیوں میں کھو جانے کے بجائے فطرت کی منہ زور قوت سے زندگی کو تحرک اور تازگی عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کو رومانی تحریک کا اوّلین اہم شاعر شمار کیا جاتا ہے۔''

اس تناظر میں ڈاکٹر محمد حسن کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے کہ:

''اقبالؔ کی شاعری میں رومانوی اثرات بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں جذبات اور وجدان کی افراط اور غلبہ اس قدر زیادہ ہے کہ اگر ان کو رومانوی شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔''

مقصدِ اقبالؔ کے وجدان کا جزو لاینفک ہے۔ اس لیے کسی مقام پر بھی اُن کی شاعری میں فن اور مقصدیت میں تصادم پیدا نہیں ہوا۔ ادبی زاویے سے اقبالؔ نے مقصد اور فن کی متصادم حدود میں جمالیاتی انضمام پیدا کیا اور شعر کو تنقیدِ حیات کہنے کے بجائے خود حیات کو تنقیدِ شعر قرار دیا۔ اقبالؔ سے پہلے حالیؔ نے مقصد کو شاعری میں سمونے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے لفظ اور معانی کو دو الگ اکائیاں قرار دے دیا اور معنی کو لفظ کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معنی اور لفظ کے درمیان خلیج حائل ہوگئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے کہ:

''اسی وجہ سے حالیؔ کی اپنی اکثر نظمیں پھیکی ہیں۔''

اقبالؔ نے لفظ اور معانی کے اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو نہ صرف جوڑنے کی کوشش کی بلکہ لفظ کو معنی کے اظہار کا وسیلہ قرار دیا۔ چنانچہ اقبالؔ ہی ایسا توانا شاعر نظر آتا ہے جس نے لفظ کے نئے اسالیب اور ریاضت کو اور موضوع کو مقصود بالذات قرار دینے کے باوصف فن کا جمالیاتی پہلو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اقبالؔ کی ایک منفرد عطا یہ ہے کہ اس نے فنی پابندیوں کو اہم سمجھا، لیکن اس میں معنوی وسعت پیدا کرنے کے لیے فن کاری کی داخلی آزادی کو تسلیم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کی شاعری میں کوئی موضوع، رجحان یا شے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ انہوں نے غزل اور نظم کی اصناف کو بڑی قادر الکلامی سے برتا اور انہیں اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر فنی برتری، فکری بصیرت اور شعری کمال کا سکہ منوالیا۔

اقبالؔ نے جمود کو حرکت میں اور قنوطیت کو رجائیت میں بدلنے کی سعی کی اور اس کے لیے فلسفہ، نفسیات اور تاریخ کو محرک قوت کے طور پر استعمال کیا۔ اُردو نظم میں اقبالؔ کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے فطرت کے خارج اور انسان کے داخل میں ایک لازوال رشتہ قائم کیا اور یوں بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ''فرد کی داخلی دنیا کو برانگیختہ کردیا۔''

اقبالؔ نے اپنی نظموں کے ذریعے فرد و انسانیت پر مائل کیا تو اس فاضل قوت کو بروئے کار لانے کی راہ بھی دکھائی۔ اُردو نظم میں معاشرتی موضوعات کو کثرت سے پیش کیا۔ ان کی نظم ایک مسلسل فکری عمل ہے، چنانچہ عظمتِ انسان اور خودی کا تصور، فرد اور معاشرت کا رشتہ، زندگی کے لیے حرکت اور حرارت کی ضرورت، حسن اور فن کے تخلیقی تصورات، ذاتِ باری اور تصوف کے نظریات، مذہب کی ضرورت اور اہمیت، معاشرے میں عورت کا مقام، مابعد الطبیعیات اور سائنس وغیرہ سب موضوعات پر اقبالؔ کے ذاتی خیالات معلوم کرنے کے لیے اقبالؔ کی نظموں کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اقبالؔ نے نظم کو اجتماع سے خطاب کا وسیلہ بنایا اور زندگی کی جزئیات پر ذاتی ردعمل ظاہر کرنے کی بجائے پوری قوم کا تاثر پیش کرنے کی سعی کی۔ اقبالؔ کی نظم ان کی شخصیت اور ان کے فکری نظام کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ اقبالؔ نے لفظ و معانی کا جو رشتہ قائم کیا تھا، نظم میں اُسے یوں تقویت ملی کہ ہمہ اقسام موضوعات نظم کی اقلیم میں داخل ہوگئے اور مسلسل خیال کی پیشکش میں لفظ کے تخلیقی استعمال کو فوقیت حاصل ہوگئی۔ جس سے نظم کی جہت یکسر بدل گئی اور اس میں دروبینی کا احساس پیدا ہوا۔ ان سب زاویوں کو مدِنظر رکھیں تو حالیؔ، اکبرؔ، آزادؔ اور شبلیؔ کے سلسلۂ نظم میں اقبالؔ ایک سنگِ میل ہی نظر آتے ہیں بلکہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''وہ جدید اُردو نظم کے اوّلین علمبردار ثابت ہوتے ہیں۔''

اُن کی تحریک نے مستقبل کے ادب پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ ترقی پسند، رومانوی اور داخلی روی تحریکوں نے اقبالؔ سے گہرے اثرات قبول کیے اور نئی شاعری کے فروغ میں اقبالؔ سے راہنمائی حاصل کی۔

رومانوی تحریک نے بھی نظم کو متاثر کیا۔ رومانوی نظم نگار ایک طرف تو اپنے عہد کے تناظر میں سیاسی، مذہبی معاشرتی اور اخلاقی مقاصد کی پیروی کرتے ہوئے موضوعی اعتبار سے ایک وسعت پذیر تخلیقی منطقے میں محوِ سفر تھے اور دوسری طرف مناظرِ فطرت کی رعنائیوں میں ڈوب کر نا آسودہ خواہشوں اور آرزوؤں کو جذباتی اور محسوساتی سطح پر تخلیق کا جواز فراہم کر رہے تھے۔ بقول جیلانی کامران:

''نظم کا یہ سارا عمل ایک نئی دنیا کو قائم کرنے کا عمل ہے، جس کے پیچھے توانائی، اعتماد اور خودسپردگی کے محرکات کارفرما نظر آتے ہیں۔''

ان رومانوی شعراء میں حفیظؔ جالندھری، عظمتؔ اللہ خان، جوشؔ ملیح آبادی، اخترؔ

شیرانی اور ساغر نظامی نمایاں ہیں۔جن کے ہاں خارجی مشاہدات، جذباتی واردات کی صورت میں باطن کی دنیا سے مربوط ہو کر ایک نئے طرزِ احساس اور طرزِ فکر کو اجاگر کرتے ہیں۔ جوشؔ کے بارے میں بعض ناقدین نے لکھا ہے کہ وہ مکمل طور پر رومانوی شاعر نہیں ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی

بقول ڈاکٹر شارب ردولوی:

"جوشؔ کی وہ شاعری جب وہ شاعرِ شباب تھے، منفرد و روحانی عنصر لیے ہوئے ہے، لیکن اُن کی گھن گرج اور آن بان کسی حد تک اُن کو رومانوی شاعروں سے الگ کردیتی ہے۔ وہ جمالیاتی شاعر ہیں۔ اُن کا تصور، انفرادیت اور حسن سے وابستگی، پڑھنے والوں کو ایک بار اُن کے رومانوی ہونے کا احساس ضرور دلاتی ہے، لیکن ان کا سنبھلا ہوا شعور اور ان کا سیاسی ادراک انہیں پوری طرح رومانوی شاعر کی صف میں نہیں آنے دیتا۔"

محمد جمیل احمد لکھتے ہیں:

"جوشؔ ملیح آبادی موجودہ دور میں اُردو شاعری میں محاکات کے بادشاہ ہیں۔ زبان میں سلاست، صفائی، سادگی و شیرینی ورنگینی اور بعض جگہ گھن گرج ہے۔ وہ الفاظ سے کھیلتے ہیں اور الفاظ ان کی زبان پر اس طرح وارد ہوتے ہیں جیسے آبشار سے پانی کی دھاریں بہتی ہوں"

جوشؔ ملیح آبادی کی رومانویت میں جذبے کا طوفانی اُبال سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں سیمابی اضطراب اور ہیجانی کیفیت بتدریج شدت اختیار کرگئی۔ ان کی رومانویت کا ایک زاویہ احساسِ حسن کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے اور جمالِ

فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں اور بوقلموں رعنائیوں کو خارجی سطح پر نمایاں کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

"وہ بیک وقت شاعرِ شباب ہیں اور شاعرِ انقلاب بھی"

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی اس رائے میں جوشؔ کی رومانویت کے تمام زاویے سما گئے ہیں۔ جوشؔ کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پُرجلال آواز سے گھن گرج پیدا کی۔ چھوٹے سے خیال کی وادی کے گیر و الفاظ، تشبیہات اور مترادفات کا کوہ ہمالہ چن دیا۔ لیکن جب اس وادی کے داخل میں جھانکنے کی سعی کی گئی تو تخیلی زاویہ گہری کھدائی کے باوجود جلوہ فشاں نہ ہوسکا اور جذبہ لفظوں کی گونج میں ہی گم ہوگیا۔

جوشؔ ملیح آبادی کی شاعری میں رومانویت بھی ہے اور ترقی پسندانہ تحریک کے اثرات بھی۔ ان کی ترقی پسندی ان کے لا ابالی مزاج کا حصہ ہے۔ حیدرآباد کی ملازمت سے برطرفی کے بعد ان کے ہاں احتجاج کا زاویہ اور ردِعمل کی قوت پیدا ہوئی اور ان کا روئے سخن انگریزی حکومت کی طرف ہوگیا۔ جوشؔ کی چند مشہور نظمیں "غلاموں کی بغاوت" "ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام"، "نظامِ نو" اور "انسانیت کا کورس" وغیرہ ہیں۔ ان نظموں میں رجز کا انداز اور خطابت کا لہجہ نمایاں ہے۔ بلاشبہ جوشؔ کا تصورِ انقلاب ہندوستان کی غلامی کے ردِعمل میں پروان چڑھا تھا۔ تاہم ان کے ہاں انقلاب کا واضح تصور موجود نہیں۔ لیکن جوشؔ کے پُرجوش لہجے کو قبولِ عام حاصل ہوا۔

اختر شیرانی

اختر شیرانی کے یہاں رومانوی رجحان سب سے زیادہ نظر آتا ہے اور ان کی شاعری کی بنیاد ہی رومانویت ہے۔ زندگی کو ایک ماورائی خواب بنانے اور اس میں تخیل کی آزادہ روی سے رنگ و رعنائی سمونے میں اختر شیرانی نے سب سے زیادہ شیفتگی کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ وہ رومانویت کی اوّلین آوازوں میں شمار ہوئے۔ ان کی شاعری میں

جذبے کی بدوی صورت نمایاں ہے۔ اس میں شدت بھی ہے اور دل بستگی بھی۔ چنانچہ اختر شیرانی نے نہ صرف رومانوی تحریک کو فروغ دیا بلکہ نئی اُردو نظم کو بھی کروٹ دی۔

جوشؔ ملیح آبادی، اخترؔ شیرانی، حفیظؔ جالندھری اور عظمتؔ اللہ خاں نے اُردو نظم کے فکر وفن کے نئے تجرتے کیئے اور اپنے بعد کی نسل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ عظمتؔ اللہ خاں نے نظم کا ایک مختلف اور غیر روایتی ڈھانچہ پیش کیا اور پہلی بار نظم کو غزل کے اثر سے آزاد کرنے کی شعوری کوشش کی۔

عظمتؔ اللہ خاں

عظمتؔ اللہ خاں کے مزاج میں رومانویت کا وہ عنصر موجود تھا جو موجودہ حقیقت کو منقلب کرنے اور نئے اُفق تلاش کرنے پر فرد کو آمادہ کرتا ہے۔ انہوں نے اُردو ہندی کے امتزاج سے لوک گیتوں کی تجدید کی اور یوں غزل کی قدیم روایت کے خلاف نظم نے جو بغاوت کی تھی، اس میں لسانی تجدد کا زاویہ بھی شامل کردیا۔ اہم بات یہ ہے کہ عظمتؔ اللہ خان نے اُردو نظم کو ہندوستانی عورت سے متعارف کروایا۔ اس کوشش میں اس سرزمین کی رسوم بھی اس کی نظم میں شامل ہوگئیں، جن سے نظم کی داخلی دھڑکن تیز تر ہوگئی۔

اُردو نظم کے سفر میں بیس ویں صدی کے چوتھے عشرے میں ہم ایک ہیجان خیز دور میں داخل ہوتے ہیں۔ اس عہد میں نظم گو شعراء کا ایک انبوہِ کثیر ان رجحانات اور رویوں کے نقطۂ اتصال پر کھڑا نظر آتا ہے جو بیس ویں صدی کے ابتدائی تیس برسوں میں مقصدیت، اجتماعیت، فطرت پسندی، حقیقت پسندی اور رومانوی صورت میں موجود رہے اور شعراء کے انفرادی تجربوں کی صورت میں ان کی تخلیقی کاوشیں ایک مرکز پر سمٹ کر اجتماعی جدوجہد کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اس اجتماعیت کا سہرا ترقی پسند تحریک کے سر جاتا ہے، جس نے ایک باضابطہ منشور تحریر کرکے ادیبوں اور شاعروں کی ایک خاص سمت میں رہنمائی کی۔ بقول علی سردار جعفری:

"ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، پیاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں"

ان سطور کی روشنی میں بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس عہد کے شاعروں کی نگاہ میں سیاسی ذلت، اقتصادی زبوں حالی اور سماجی پستی جیسے مسائل کس قدر اہمیت رکھتے تھے۔ انگریزوں نے جس نوع کے جاگیرداری نظام کو فروغ دیا تھا، اس نے غریب، کسانوں اور کاشتکاروں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ صنعتی انقلاب نے مزدوروں کا طبقہ پیدا کیا، جسے اکثر و بیشتر فاقہ کشی کا سامنا تھا۔ معاشرتی زندگی میں گھٹن اور دباؤ سے انسانی شخصیت انتشار کا شکار تھی۔ جنسی اور جذباتی زندگی کی کشمکش نے کئی طرح کی اُلجھنیں، پیچیدگیاں اور بے راہرویاں پیدا کیں۔ دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے اثرات ہندوستان بھی پہنچے۔ بنگال کے قحط نے کاروبارِ زندگی کو تہہ و بالا کردیا۔ مہنگائی اور فاقوں نے عوام کا رہا سہا خون بھی نچوڑ لیا۔ ان حالات میں ہمارے شاعروں پر بڑی بھاری ذمے داری آن پڑی۔ چنانچہ ان میں اپنے عہد کی صورتِ حال سے بغاوت کا عنصر پیدا ہوا، اور ان کی شاعری میں انقلاب کے نعرے گونجنے لگے۔

فیض احمد فیضؔ، اسرار الحق مجازؔ، معین احسن جذبیؔ، جاں نثار اخترؔ، مخدومؔ محی الدین، اخترؔ الایمان، ساحرؔ لدھیانوی، کیفیؔ اعظمی، ظہیرؔ کاشمیری، سردارؔ جعفری نے بے شمار ایسی نظمیں لکھیں جو انقلاب اور تشکیل کے سماج کا پتا دیتی ہیں۔ ان نظم نگاروں نے عالمی سطح پر جدید زندگی کے مسائل کو ادبی پیرائے میں پیش کیا۔ ان کے تجربات کا کردار نئے اندازِ فکر و احساس کا رہینِ منت ہے۔ ان کے ہاں نظم کی موضوعی اور تکنیکی جدت گزشتہ شاعری کے خلاف شعوری ردِعمل کے پیش منظر میں ابھرتی ہے۔

یہ دور نظم کی ہیئت میں تبدیلیوں اور نت نئے تجربات کا دور ہے۔ فسادات اس

شاعری کا اہم موضوع ہے۔ نظم نگاروں نے فسادات کے نتیجے میں مٹتی ہوئی اخلاقی قدروں اور سماجی انارکی کا ماتم کیا ہے۔ زرد چہرے، خاک آلودہ صورتیں، قافلوں کی صورت میں انجانی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ وہ پوری طرح باخبر ہیں کہ اس جنون نے اُن گنت انسانوں کو نڈھال یا برباد اور بے خانماں بنا دیا ہے۔ شعراء نے اس طرح کے حالات اور فسادات سے اتنا گہرا اثر قبول کیا کہ اُن کے لہجے میں جارحانہ پن صاف طور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اسرار الحق مجازؔ

اسرار الحق مجازؔ (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۵۶ء) ایک پُر جوش رومانوی اور باغی شاعر تھے۔ وہ عشق و محبت کے پرستار اور سماجی اور سیاسی پابندیوں کے خلاف علمبردار رہے۔ اُن کی شاعری اُن ہی جذبات کی ترجمان ہے، اس میں شعریت بھی ہے اور رنگینی بھی۔ دل کی دھڑکنیں بھی ہیں، جنسی تقاضے بھی، انقلاب کی خواہش بھی ہے اور بغاوت کا اظہار بھی۔

اسرار الحق مجازؔ کی شاعری میں تین اہم مقام آئے ہیں۔ وہ اوّلاً محبوبِ دل نواز کے حسنِ فسوں گر کی مدح و توصیف کرتے ہیں۔ وہ مطربِ بزمِ دلبراں کی حیثیت سے ابھرے۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی لکھتے ہیں:

''حسن و عشق کے ازہائے سربستہ کا انکشاف شیریں و دل نشیں انداز میں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ کرنا، ان کا وتیرہ رہا ہے''

بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

''وہ بحیثیت مجموعی اپنی شاعری کی رومانوی فضا میں پلتے رہے ہیں''

انہوں نے اپنی نظم ''تعارف'' میں خود ہی اس امر کا اعتراف کیا ہے:

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

ثانیاً ظالم سماج اپنے نوکیلے کانٹوں سے مجازؔ کو نہ صرف کچوکے لگاتا ہے بلکہ یہ محبوبہ اور شاعر کے درمیان رکاوٹ بھی بن جاتا ہے اور اس مقام پر مجازؔ وحشتِ دل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آخری مقام وہ ہے جب مجازؔ انقلاب کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ عوام کو بھی مشورہ دیتے ہیں کہ:

گرا دے قصرِ تمدن کا، اک فریب ہے یہ
اٹھا دے رسمِ محبت، عذاب پیدا کر

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

اسی سلسلے میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

''وہ رومان سے انقلاب کی طرف آئے''

مجازؔ لکھتے ہیں:

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

مجازؔ کی شاعری نے یہ تینوں مراحل بخیر و خوبی طے کیے ہیں اور اس چوتھے مقام سے بھی گزرے ہیں، جہاں ان کی آواز میں عوامی لہجہ اُبھرا ہے۔ اور وہ انبوہ کے ساتھ مل کر گاتے ہیں:

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواں ڈول

مخدومؔ محی الدین

مخدومؔ محی الدین کی شاعری میں رومان اور انقلاب کی آواز بیک وقت سنائی دیتی ہے۔ ان کے ناقدین نے ان کی شاعری کو خلوص کی پیداوار قرار دیا ہے اور مخدومؔ نے اس خلوص کو اپنی محبوبہ اور نظریئے کے لیے یکساں طور پر برتا ہے۔

مخدومؔ رزمیہ مزاج اور عسکری لہجے کے مالک ہیں۔ ان کے عشق میں وفور اور وارفتگی ہے اور عشق سے انقلاب کی طرف پیش قدمی میں بھی مخدومؔ کا والہانہ پن قائم رہتا ہے۔ چنانچہ مخدومؔ نے انقلاب کی آواز کو اپنی روح کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ ترقی پسند شاعری میں مخدومؔ عرفانِ انقلاب کا زاویہ ہے۔ وہ وطن کے تحفظ اور سلامتی کے لیے تلوار اٹھا لینے کے آرزومند تھے۔ کہتے ہیں:

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں

کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں

کیا مجاہد نہ بنوں

کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر

مخدومؔ کی نظمیں جو للکار، گھن گرج، عزم اور جذبہ رکھتی ہیں، ان سب نے اُسے بڑی تاب و توانائی عطا کی ہے۔ یہی تاب و توانائی ظلم و جور کے اندھیروں میں مجاہدین کا حوصلہ بڑھاتی رہی ہے اور دشمنوں سے معرکہ آراء ہونے اور آزادی کی خونیں جنگ لڑنے کے لیے حرارت بخشتی رہی ہے۔

ساحرؔ لدھیانوی

ساحرؔ لدھیانوی، وہ ایک رومان پرست شاعر کی حیثیت سے ابھرے، لیکن ان کی عشقیہ شاعری کا تانا بانا سیاسی ماحول میں ہی بنا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی فکر،

اُن کے خیال، اُن کے تصور پر غلامانہ زندگی کا کرب، محکوم و مظلوم افراد کی بے بسی اور معاشرے کے بگڑے ہوئے اقتصادی نظام کے اثرات پوری طرح مسلط ہیں۔ کہتے ہیں:

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

ساحر کے بیدار شعور نے برِاعظم میں غربت و افلاس کی ماری ہوئی غلام قوم کا صرف حالِ زبوں ہی نہیں دیکھا تھا، سیاسی ماحول کے تباہ کن اثرات کو بھی محسوس کیا تھا، کہتے ہیں:

یہ بات بات یہ قانون و ضابطہ کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دوری، مجبوری

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو رنگِ گلستان پہ اختیار نہیں

رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی امنگوں کا خروش

دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں
اُفق سے تابہ اُفق پھانسیوں کے جھولے ہیں

دلوں پہ خوف کے پہرے لبوں پہ قفلِ سکوت

سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

ساحرؔ نے اپنے ولولہ انگیز اور پُر جوش ترانوں کے ذریعے براعظم میں نمایاں ہونے والی بیداری اور حصولِ آزادی کے جذبے کو جس حسن و خوبی سے پیش کیا ہے، اس سے اُنہیں حریت پسند شاعروں کی صفِ اوّلین میں جگہ ملی ہے۔

علی سردارؔ جعفری

علی سردارؔ جعفری ابتدائے شعور سے ترقی پسند ادب سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ انقلاب اور تغیر کے نقیب ہیں۔ اس لیے برصغیر کی غلامانہ زندگی اور سامراجی نظام کے خاتمے کے لیے ایک خونی انقلاب کی تمنا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کو مزدور کا نعرہ بنا دیا۔ اُن کی شاعری فکری اعتبار سے عہدِ حاضر کی آئینہ دار ہے۔ ان کی بے باک شاعری کو ماحول کا عکس قرار دیتے ہوئے شعوری انقلاب سے تعبیر نہ کرنا، ایک روشن حقیقت سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ ان کے افکار کی ہر جہت میں بیداری اور عظمتِ انسانی کا پیام ملتا ہے۔ ان کی اکثر نظمیں ایسی ہیں جو تیرگیٔ شب میں پیامِ طلوعِ سحر دیتی ہیں۔ ان کا پیغام سعیٔ مسلسل رہا ہے اور رہے گا۔

نوجوانی کے گرم اور پُر جوش لہو کے ساتھ اور بغاوت کا مسئلہ لے کر جب سردارؔ جعفری میدانِ سیاست میں اُترتے ہیں تو اپنے مخصوص نظریۂ حیات کا اعلان بھی کرتے جاتے ہیں۔

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا

بغاوت میرا پیغمبر بغاوت ہے، خدا میرا

بغاوت رسمِ چنگیزی سے تہذیبِ تتاری سے

بغاوت جبر و استبداد سے، سرمایہ داری سے

بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے، ریاست سے

بغاوت سامراجی نظم و قانونِ سیاست سے

علی سردار جعفری ان شعراء میں سے ہیں، جنہوں نے شکست و ریخت کے منقلب اثرات کو شعوری طور پر محسوس کیا کہ مطرب و چنگ و رباب سے تمکین و ہوش لٹنے کا زمانہ کبھی کا گزر چکا ہے اور وہ وقت آ گیا کہ سرمایہ داری کا قزاق مزدور اور محنت کشوں کی دنیا لوٹ رہا ہے۔ افلاس کا اندھیرا ہنستی کھیلتی زندگی کو ایک شکستہ قبر کی تاریکی کا ہول ناک کفن پہنا رہا ہے۔ لہٰذا علی سردار جعفری ہمیں اس درد انگیز کیفیت سے یوں آگاہ کرتے ہیں:

شب کے سناٹے میں یہ کس کا لہو گاتا ہے

سرحدِ درد سے یہ کس کی صدا آتی ہے

انہوں نے "ایک بات" کے عنوان سے اپنے عہد کی کرب سامانی کو اس طرح نظم کیا ہے:

اس پہ پھولے ہو کہ ہر دل کو کچل ڈالا ہے

اور ہر گوشۂ گلزار میں سناٹا ہے

آج وہ کچھ نہ سہی کل کو جواں تو ہوگی

وہ جواں ہو کے اگر شعلۂ جوالہ بنی

خود ہی سوچو کہ ستمگاروں پہ کیا گزرے گی
اس پہ بھولے ہو کہ ہر گل کو کچل ڈالا ہے

کسی شے میں فغاں تو ہو گی
وہ جواں ہو کہ اگر آتشِ صد سالہ بنی

پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی لکھتے ہیں:

"انسانیت کے علمبردار اور شعراء میں علی سردار جعفری صفِ اوّل میں شمار کیے جاتے ہیں"

سردار جعفری نے زندگی کو قریب سے دیکھا اور اُسے اپنی شاعری میں خوب برتا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو مردانہ وار زندہ رہنے کا پیغام بھی دیا۔ انہوں نے زندگی کی تلخیوں کو بیان کیا۔ ہول ناکیوں اور تباہ کاریوں کے تذکرے کو بھی انہوں نے ایک حقیقت قرار دیتے ہوئے اپنی شاعری میں نہ صرف روا رکھا ہے بلکہ اُن حقائق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ انسانیت اکائی کی صورت میں اپنے استحقاق کی تحصیل کے لیے کوشاں رہے۔ مسائلِ حیات کا احساس، تجربات و مشاہدات کی بصیرت افروزی اور داخلیت کا گہرا رچاؤ اُن کی شاعری کے اجزاء ہیں۔ اُن کا سیاسی شعور اور اُن کی زندگی ہم آہنگ ہوگئے ہیں۔ خلوص و مشاہدہ اُن کی شاعری کے خاص جوہر ہیں اور شاعری کے ذریعے انہوں نے احساس اور صداقت دونوں کو ابھارا ہے۔

تلنگانہ، جشنِ بغاوت، سامراجی لڑائی، انقلابِ روس، سیلابِ چین اور ملاحوں کی بغاوت جیسے موضوعات پر انہوں نے طغیانِ طوفان کو پورے ولولے سے شاعری میں ڈھالا ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

کوئی اب اُڑے شرارے کو دبا سکتا نہیں
کوئی بادل سرخ تارے کو چھپا سکتا نہیں

ایک ہی ہلکے سے جھٹکے سے کلائی موڑ دے
اے مجاہد سامراجی انگلیوں کو توڑ دے

حکومتِ برطانیہ کو نیست و نابود کر دینے کے لیے سردار جعفری تنہا آگے نہیں بڑھتے، وہ اپنے ساتھ اہلِ وطن کو بھی لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں انقلاب کا پیغام سنا کر غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔

اُٹھو ہند کے باغیو اٹھو!
اُٹھو انقلابی جوانو اٹھو!

غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار موڑ دو

اُن کی شاعری سے رزمیہ مزاج اور عسکری لہجہ عیاں ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں عظمتِ زندگی کے نقیب کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔

احسان دانش

مزدوروں اور کسانوں کے تلخ لمحاتِ زندگی کی حقیقت سے زیادہ قریب تر تصویریں احسان دانش نے کھینچی ہیں۔ اگرچہ ان میں الم انگیزی، نوحے اور رقت کا انداز غالب ہے۔ تاہم احسان نے محنت کش طبقات کے شب و روز کا مطالعہ و مشاہدہ قریب سے کیا ہے، بلکہ خود ان شب و روز سے گزرے ہیں۔ اس لیے وہ اس طبقے کے جذبات

و احساسات کو زیادہ خوبی سے پیش کر سکے ہیں۔ ان کی شاعری میں محنت کش طبقے کی حالت نوحۂ غم اور نغمۂ شادی سے بیگانہ سہی، لیکن ان کی الم انگیز زندگی اپنے دامن میں کچھ ایسی خصوصیات بھی چھپائے ہوئے ہے جو اونچے طبقوں کی زندگی میں خال خال نظر آتی ہے۔ ''مزدور کی عید، مزدور کی دیوالی، مزدور اور برسات، مزدور کا مہمان، مزدور کا چالان، مزدور اور کالجیٹ، مزدور کی موت، کسان وغیرہ یہ نظمیں انہی خصوصیات کی حامل ہیں۔

احسانؔ مزدوروں اور کسانوں کو مقدر پر قانع رہنے کی بجائے تدبیر کی راہ بجھاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ سرزمینِ ہند پر ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب یہ طبقاتی امتیازات ختم ہوجائیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ سرزمین بھی بغاوت اور انقلاب کے شعلوں سے تہہ و بالا ہوجائے گی۔ ''الہام سحر'' اسی احساس کی ترجمان ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مفلسی رو کر اٹھے گی سرزمینِ ہند سے
دور ہو جائے گی یہ کالک جبینِ ہند سے

ورنہ اک دن ضبطِ غم سے تنگ آجائیں گے
جب نہ کھانے کو ملے گا تم کو کھا جائیں گے

یہ عرشِ اعظم ہے فغانِ بیکساں سے متصل
قدسیوں کا اُن کی خاموشی پہ بھر آتا ہے دل

ان کی فریادوں سے کہساروں میں لگ جاتی ہے آگ
اُن کے آنسو لوٹ لیتے ہیں ستاروں کے سہاگ

بجلیوں کی باگ ہے اُن کی دعا کے ہاتھ میں
ہاتھ ہے اُن فاقہ مستوں کا خدا کے ہاتھ میں

ان افکار و اشعار میں انقلاب ایک نعرہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت بن کر نمودار ہوا ہے۔

فیض احمد فیضؔ

فیض احمد فیضؔ کے ہاں ترقی پسند نظریے کا رجحان اور ادراک واضح انداز میں موجود ہے۔ انہوں نے عشق سے انقلاب کی طرف قدم بڑھایا اور خوبانِ جمال سے علیحدگی اختیار کر کے کشمکشِ اضطراب میں مبتلا ہوئے۔ اُن کی شاعری میں موجودہ نظام کو بدلنے کی خواہش، حقیقت نگاری اور سیاسی شعوری کے اشارے جا بجا ملتے ہیں۔ اُن کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں:

"فیضؔ کے اندازِ بیان کی شاداب تشبیہوں کی رنگینی مغربی انداز کے تاثر پاروں کا استعمال ...... بہت مشہور ہوا"

فیضؔ نے غلامانہ دور کی تصویر کشی کی ہے۔ مظلوم و محکوم قوم کی دردناک زندگی کے رخ کو پیش کیا ہے۔ ظالم و جابر آقاؤں کے طرزِ عمل پر شدید حملے کیے ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمود الرحمٰن:

"ماحول اور معاشرے کے دکھ بھرے منظر کی طرف جب فیضؔ کی نظر لوٹتی ہے تو وہ طوق و سلاسل میں جکڑی ہوئی قوم کو اس کی غربت و وفاداری کو...... فرنگی آقاؤں کی

سیاسی حکمت عملی اور ظلم وجور کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتے ہیں"

فیضؔ کے درج ذیل اشعار اُن کی فکر کی نشان دہی کرتے ہیں:

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں
چند روز اور مری جاں! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم

فیضؔ نے اپنی شاعری میں اشتراکی انسان دوستی کے درد کو اپنایا ہے۔ اُن کے ہاں انقلاب کے عملی پہلو سے کم اور اس کے تصور سے زیادہ دل چسپی ملتی ہے۔

کیفی اعظمی

کیفی اعظمی، اس عہد کے شاعروں میں ہیں جو اس میں سیاسی شدت کا عہد تھا۔ رومانویت کے باغی مزاج کو انقلاب کی گھن گرج میں بڑی اپنائیت محسوس ہوئی اور انہوں نے پوری شدت کے ساتھ اس آواز کو لبیک کہا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کیفی جس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اُس نے انسانیت کی تذلیل اور بے حرمتی کو زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ بقول پروفیسر شارب ردولوی:

"کیفی کی شاعری احتجاجی شاعری ہے اور احتجاج بھی ایک جوشیلے نوجوان کا احتجاج"

کیفی نے نقطۂ نظر کی فوقیت کو تسلیم کیا اور شاعری کو مستقیم انداز میں نظریاتی تبلیغ کا وسیلہ بنایا۔ ان کی شاعری میں محبت کا عمودی زاویہ بہت جلد حقیقت کے ارضی زاویہ کے ساتھ منطبق ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مزدور کا اور دہر کا غم بتدریج اُبھرتا چلا جاتا ہے۔ ان کے لہجے میں جلالی گھن گرج زیادہ ہے۔

کیفی نے اپنی شاعری اور بلند آہنگی سے لوگوں کو صرف جھنجھوڑا اور جگایا ہی نہیں ہے بلکہ اپنی ذمے داری کا احساس دلایا ہے۔ اُن کی نظموں میں کیفیت درد انگیزی اور اثر پذیری زیادہ ہے۔ حصولِ آزادی کے سلسلے میں ان کا اشتراکی نظریہ اُن کے کلام پر پوری طرح اثر انداز ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پورے وثوق کے ساتھ ظلم و جور پر مبنی سامراجی نظام کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں۔ اس اظہار میں محض ان کے جذبات کی ترجمانی ہی نہیں، حقائق کا پرتو بھی ہے۔ جذبات و حقیقت کے اس امتزاج کا رنگ ملاحظہ ہو:

جاگ اٹھی سینوں میں آزادی کی رو
اب یہ دھارا رخ بدل سکتا نہیں
سامراج اب پھول پھل سکتا نہیں
لٹنے ہی والا ہے دم بھر میں حکومت کا سہاگ
لگنے ہی والی ہے جیلوں، دفتروں، تھانوں میں آگ
بہنے ہی والا ہے ایوانِ شہنشاہی میں خون
پھٹنے ہی والی ہے چھت، گرنے ہی والے ہیں ستون

اس انقلابی ماحول میں کیفی نے اپنے جوشیلے اور روح پرور کلام سے مجاہدوں کے رگ و پے میں ایک آگ سی بھڑکا دی ہے۔ اُن کے ولولوں میں حصولِ آزادی کی

تڑپ پیدا کردی۔ اس رویے نے انہیں اغیار سے براہ راست معرکہ آرا ہونے کا جذبہ محکم عطا کیا ہے۔

وامق جونپوری

وامق جونپوری نے اپنی ذہانت اور فطری دردِ دل سے متاثر ہو کر ہندوستان کے اس کرب کو محسوس کیا جس میں وہ اس وقت مبتلا تھا۔ بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

"انہوں نے اپنی شاعری کو وقت کی پکار بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا"

اُن کی نظم "بھوکا ہے بنگال" نے پورے ہندوستان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ظہیر کاشمیری

ظہیر کاشمیری کی شاعری نے رومان سے انقلاب کی طرف ہی سفر نہیں کیا بلکہ اس کی شاعری سے ایک ایسے شخص کا اعتماد بھی جھلکتا ہے جس نے زندگی کا سفر ایک مخصوص نظریے کی روشنی میں طے کیا ہے۔ چنانچہ اُن کے ہاں رجائیت کا زاویہ نمایاں ہے۔ اس کا ٹمپو تیز اور خطابیہ لہجے میں گھن گرج موجود ہے۔ تاریخ اور فلسفے کے گہرے شعور نے اُسے فکرِ توانا عطا کی ہے۔

عارف عبدالمتین

عارف عبدالمتین کا شمار اُن ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے غریبی اور غیور مزاجی کا اعلان کیے بغیر ترقی پسند نظریات پر غیر متزلزل اعتماد کا اظہار کیا۔ عارف کی شاعری معنوی طور پر ایک مخصوص آئیڈئل کی تلاش سے تعبیر ہوتی ہے اور ان کے ہاں رجائیت کا خوش آئند پہلو نمایاں ہے۔ عارف کے شعری اسلوب پر بھاری بھرکم الفاظ کی دبیز تہ جمی ہوئی ہے۔ تاہم جب وہ عوام سے مخاطب ہوتے ہیں تو اپنے گمبھیر لہجے کو نغمۂ عوام بنانے کی کوشش کامیابی سے کرتے ہیں۔

جاں نثار اختر

جاں نثار اختر نے غربت اور امارت کے تضاد کو خوبی سے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

سلام مچھلی شہری

سلام مچھلی شہری اشتراکیت پسند شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور وہ وطن کو آتشیں نغمے سنانے اور برگ کو چنگاریوں سے رنگین بنانے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

اختر الایمان

اختر الایمان نے اُردو نظم کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ انہوں نے شاعری کو نئی فکری سنجیدگی سے آشنا کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

''اختر الایمان نئی بصیرت کا ضمیر ہیں۔''

معین احسن جذبی

معین احسن جذبی ابتدائی میں براعظم پاک و ہند کی روح میں بسی ہوئی یاس پسند فضا کے ترجمان تھے اور خارجی ماحول کی زبوں حالی پر اظہار جذبات کے لئے کبھی اشکوں اور آہوں کا سہارا لیتے اور کبھی غلامی کا پاپ کٹنے کی تمنا کرتے تھے، لیکن رکے رکے سے آنسو اور گھٹی گھٹی سی آہوں کی ترجمانی کا یہ سلسلہ تا دیر قائم نہیں رہتا۔ جذبی اس پاپ کے کٹنے کے لیے جنگ کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اپنی نظم ''دعوتِ جنگ'' میں مجاہدِ وطن کو خوں فشار تلوار کھینچ لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اُن کے کلام میں ظلم و استبداد کے خلاف بغاوت کی دبی دبی سی لہر ضرور پوشیدہ ہے۔

علی جواد زیدی

علی جواد زیدی اپنے اشعار سے انقلاب کی رفتار کو تیز تر کردینا چاہتے تھے۔

ترقی پسند تحریک نے سماج کے روایتی، فرسودہ نظامِ اقدار سے بغاوت کو آزاد نظم کا محرک قرار دیا ہے۔ نظم معاشرتی اور انفرادی زندگی میں تبدیلی کی آرزو اور نئے شعور کی روشنی میں اپنے عہد کی ترجمانی کے لیے جدید انقلابی شاعری کی بنیاد رکھی۔ ترقی پسندوں کے لیے ابتداء ہیئت میں تجربے کا مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا کیونکہ ادبی نقطۂ نظر مقصدی اور افادی ہونے کے سبب یہ اُن کے مقصد کی راہ میں حائل ہوسکتا تھا۔ تاہم بعد میں رفتہ رفتہ انہوں نے آزاد نظم کی ہیئت کو قبول کیا اور اس کے امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے ترقی پسند تحریک کی طرح تخلیق کار پر پابندیاں عائد کرنے کی بجائے اُسے اپنے طور پر محسوس کیے ہوئے تجربے کے مکمل اظہار کا موقع دیا اور اُردو کی شعری روایات میں پہلی بار تخلیق کار کے انفرادی تجربے کو اصولی اہمیت دی۔ تاہم اس انفرادی تجربے کے لیے ضروری تھا کہ یہ نیا اور منفرد ہونا چاہیے۔ چنانچہ حلقہ ہی کے زیرِ اثر ہیت اور موضوع دونوں اعتبار سے اُردو نظم میں دور رس تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

ن م راشدؔ اور میرؔاجی

اس سلسلے میں ن م راشدؔ اور میرؔاجی کے نام بے حد اہم ہیں۔ جنہوں نے آزادنظم کی ہیت میں معاشرت میں موجود انتشار اور بے یقینی کا فطری اور جمالیاتی اظہار کیا۔ بعد میں آنے والے بیشترنظم گوشعراء راشدؔ اور میرؔاجی کے حلقۂ اثر سے آزاد نہیں ہوسکے۔ تاہم نظم کے فنی طریق کار کے حوالے سے بعد کے شعراء راشدؔ اور میرؔاجی کے علامتی طریق کار سے زیادہ تمثیلی اور استعاراتی انداز اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۶۰ء کی دہائی میں "جدیدیت" کے نام سے اُردو نظم کا ایک اور رجحان سامنے

آیا۔ جس میں تجربے اور محسوسات کو شاعری کے مرکزی اصول کی حیثیت دی گئی اور اُسے موضوع کے بجائے ''فارم'' سے منسلک کیا گیا۔ اس نظریے کی رو سے شاعری زبان کے مخصوص طریق استعمال کا نام ہے اور یہ ایک شعوری اور ارادی عمل ہے جسے تخلیق کار محنت اور تنقیدی سوجھ بوجھ کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ ۷۰ء کی دہائی میں اُردو نظم ''انکشاف ذات'' کے رجحان کو لے کر آگے بڑھتی ہے جس میں شاعر خارجی دنیا سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہوئے ذات کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ تاہم خارجی دنیا سے اس کے رشتے کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ سماج کا کوئی آئیڈیل تصور نہیں بلکہ حالات کی جبریت کے تحت بنے بنائے سانچوں میں زندگی گزارنے کا رویہ ہے۔ نئی نظم کا مرکزی رجحان جدید زندگی میں نئے رشتوں کی تلاش و جستجو ہے جس میں خود اپنی ذات کی تلاش سب سے زیادہ معنویت کی حامل ہے۔

یہ تھا بیس ویں صدی میں نظم کا مختصر جائزہ۔ اب ہم حبیبؔ جونپوری کی نظم نگاری کی طرف آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حبیبؔ جونپوری کی نظم نگاری

حبیبؔ جونپوری کی مطبوعہ نظموں کی تعداد سولہ (۱۶) ہے۔ یہ نظمیں پابند ہیت میں ہیں۔ جن میں قطعہ بند، مسدس اور غزل کی ہیتیں شامل ہیں۔ زیادہ تر نظمیں غزل کی ہیت میں ہیں۔ ان کی اکثر نظموں میں واضح اور براہِ راست طرزِ اظہار اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں انہوں نے اپنے تجربات کو علامتی انداز میں بھی پیش کیا ہے۔

۱۳ نظمیں متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں جب کہ دو (۲) نظمیں شخصی منظومات کے ذیل میں آسکتی ہیں اور ایک نظم ہماری قومی زبان اُردو کے حوالے سے ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مفلس طالب علم

(جستجوئے علم میں باندھے ہوئے کس کر کمر)

۲۔ بیوہ کی خودکشی

(یہ اندھیری رات یہ ساری فضا سوئی ہوئی)

۳۔ نامعلوم حسرت

(میں ہوں کہ گھٹا جاتا ہوں دل ہے کہ حزیں ہے)

۴۔ شکستِ حُسن

(کھوئے ہوئے ہیں سرکو جھکائے ہوئے ہیں آپ)

۵۔ فرنگی

(تم تو خدمت کے جذبے سے سرشار تھے)

۶۔ عہدِ ماضی

(یاد ہے آغازِ اُلفت کا زمانہ یاد ہے)

۷۔ لاشیں

(صبر کیونکر ہو دیکھ کر لاشیں)

۸۔ کشمکش

(نہ جانے اب ترا دل بے قرار ہے کہ نہیں)

۹۔ آؤ گیت گائیں

(آؤ اُلفت کے گیت ہی گائیں)

۱۰۔ حسرتِ دیدار

(مرتا ہوں کاش پھر تجھے اِک بار دیکھ لوں)

۱۱۔ نوجوان ساتھی کی موت

(ہوگیا اشک فشاں آج کیوں یہ آسماں)

۱۲۔ جدائی

(تاکید ضبطِ غم کی نہ فرما کے جائیے)

۱۳۔ اُردو

(خطہ ارض پہ کیا شان ہے تیری اُردو)

۱۴۔ شاعر

(خاک کے ذرّوں کو تنویرِ نظر دیتا ہے وہ)

۱۵۔ میر انیسؔ

(عظمتِ اُردو کا جس نے رکھ لیا دل وہ انیسؔ)

۱۶۔ علامہ اقبالؔ

(باتوں میں تھی دلیل حوالہ سُخن میں تھا)

بیس ویں صدی کی صنعتی زندگی نے جہاں انسان کو سیاسی انتشار اور معاشی بدحالی سے دو چار کیا، وہاں ہر شے کو مادیت کے پیمانوں میں رکھ کر ذہنی اور جذباتی خلفشار کو بھی ہوا دی۔ اس صورتِ حال میں غیر فطری جذباتیت کا پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ لیکن حبیبؔ جونپوری اس صورتِ حال سے صاف بچ نکلتے ہیں اور اپنی داخلی روحانیت سے توانائی حاصل کر کے زندگی کی تلخیوں، پیچیدگیوں اور اُلجھنوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف زندگی کا شعور رکھتے ہیں بلکہ اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے وسیع سماج کی تبدیلیوں سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔ انہیں غالبؔ کی طرح غزل کی تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے اور اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعت درکار ہوتی ہے تو وہ نظم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ غزل کو ازکار رفتہ صنفِ سخن جان کر اس سے دست کش ہو جاتے ہیں بلکہ غزل میں موضوعات کے نئے تجربات کے ساتھ ساتھ وہ نظم میں ذرا کھل کر سامنے آتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی

اگرچہ نظیر اکبر آبادی نے اپنے ماحول میں ہونے والی زندگی کی تمام کیفیات

کا نقشہ اپنی نظموں میں کھینچ دیا تھا، لیکن نظم نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۳ء میں (جیسا کہ ہم باب کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں) انجمن پنجاب کے مشاعروں سے ہوا۔ مولانا آزاؔد اور حاؔلی نے نظموں کا رخ نیچرل شاعری کی جانب موڑ دیا۔ مگر بیس ویں صدی کے شعراء نے فطری شاعری میں رومانی اور سیاسی شاعری کا اضافہ کر دیا۔ چکبسؔت، اسمٰعیلؔ میرٹھی اور صفِ اصلاحِ قوم کی جانب قدم بڑھاتے رہے، لیکن جوشؔ، مجاؔز، اخترؔ شیرانی اور احساؔن دانش نے انقلابی نظموں کے علاوہ رومانی نظموں کو بہت عروج دیا۔ یہ حبیبؔ جونپوری کے ہم سفر بھی تھے اور اُن کی شاعری کا حبیبؔ جونپوری کی شاعری پر گہرا اثر بھی ہے۔

حبیبؔ جونپوری کی ابتدائی نظمیں رومانویت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان نظموں کا لہجہ شیریں اور انداز دل کش و دل نشیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اُن نظموں میں غنائیت اور موسیقی کی لہریں بھی موجزن ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

فرقت ہے کبھی وصل کبھی وصل ہے فرقت
ملنا بھی قیامت ہے نہ ملنا بھی قیامت

کیا جانے وہ قاتل ہے کہ قاتل ہے محبت
مقتول ہوں کس کا مجھے معلوم نہیں ہے

....

یہ کشمکشِ غم یہ دھڑکتا ہوا سینہ
ساحل یہ ابھی ہے ابھی موجوں میں سفینہ

آیا نہ ابھی تک مجھے جینے کا قرینہ
سچ یہ ہے جینا مجھے معلوم نہیں ہے

....

اُلفت کی شکایت ترا شکوہ نہیں پیارے
میں جانتا ہوں ظلم کسی کا نہیں پیارے

پوری ہو تمنا تو تمنا نہیں پیارے
بس اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہے

....

کھوئے ہوئے ہیں سر کو جھکائے ہوئے ہیں آپ
جیسے کہ بارِ عشق اُٹھائے ہوئے ہیں آپ
کس کو تلاش کرتی ہے بھٹکی ہوئی نگاہ
کس پر سکونِ قلب لٹائے ہوئے ہیں آپ

کس کے بھرے ہیں رنگ یہ قوسِ حیات میں
کس کو نفس نفس میں چھپائے ہوئے ہیں آپ

کیا مل گئیں حبیب سے آنکھیں خطا معاف
جیسے شکست عشق سے کھائے ہوئے ہیں آپ

کھٹک نے جس کی تری خود نمایاں لوٹیں
وہ تیر اب بھی کلیجے کے پار ہے کہ نہیں

وہ مے جو پی تھی کبھی آستانِ فطرت پر
کہو کچھ آج بھی اس کا خمار ہے کہ نہیں

بتا قسم ہے اسی عہدِ دل نشیں کی تجھے
ترے بھی قلب میں اگلا سا پیار ہے کہ نہیں

توہمات سے پھر دور کر حبیبؔ کو بھی
نظر ملا کے تشفی تو دے غریب کو بھی

....

حبیبؔ جونپوری کی یہ نظمیں نامعلوم حسرت، شکستِ حسن، عہدِ ماضی، کشمکش، حسرتِ دیدار، آؤ گیت گائیں، جدائی، رومانیت میں ڈوبی ہوئی نظمیں ہیں، ان میں ذاتی کیفیاتِ قلب کے ساتھ ساتھ زندگی کے کئی پہلوؤں کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ان میں رومان، حسن و عشق، ذاتی تجربات، واردات اور کیفیات ان نظموں کی اساس ہیں۔ فنی اور معنوی حوالے سے بھی یہ نظمیں بہت اہم ہیں۔ ان نظموں میں شاعر کا انفرادی احساس نمایاں ہے۔

رومانی شاعری میں عہدِ ماضی کی یاد کا بڑا دخل ہے۔ یہی یاد ماضی میں وہ کھلونا ہے جس سے شاعر کے دل کو تسکین ملتی ہے اور اس کی تنہائی کے لمحات بڑے حسین معلوم ہوتے ہیں۔ جب شاعر ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہے تو اس کے منہ سے اس کے اصلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے، جس میں محبت کی چاشنی عشقیہ انداز کا نکھار اور وارداتِ قلبی کا سچا اظہار ہوتا ہے، اب اس کی باتوں میں خلوص ہی خلوص اور اس کے جذبات میں اصلیت ہی اصلیت نظر آتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اپنے دامن میں نہ صرف خیالات کی سچائی بلکہ انداز کی دل نشینی اور رنگینی بھی لئے ہوئے ہیں۔

نہ جانے اب ترا دل بیقرار ہے کہ نہیں
وہ جستجو، وہ محبت، وہ پیار ہے کہ نہیں

نظر جمی ہے اسی طرح پردۂ در پر
اسی طرح سے مرا انتظار ہے کہ نہیں

نظر میں اب بھی ہے قیمت دل شکستہ کی
غریب عشق کا اب بھی وقار ہے کہ نہیں
تری اُمید پہ ٹھکرا رہا ہوں دنیا کو
تجھے بھی اپنے پر یہ اعتبار ہے کہ نہیں

....

رنگینیٔ جہاں میں اُلجھتی نہیں نگاہ
اللہ کس کو اپنا بنائے ہوئے ہیں آپ

کس کے لیے یہ آنکھوں میں آنسو، جگر میں درد
کس کا خیال دل سے لگائے ہوئے ہیں آپ

آنسو کے کانپتے ہوئے قطرے میں کون ہے
سہمی نظر میں کس کو چھپائے ہوئے ہیں آپ

یہ کس کی یاد سینے میں لیتی ہے چٹکیاں
یہ کس کی دھن میں خود کو بھلائے ہوئے ہیں آپ

....

ہر شخص جانتا ہے کہ ماضی کی کوکھ سے استعجاب، حیرت، غیر یقینی اور انجان پن جنم لیتے ہیں۔ ان اشعار میں ہم نے اس استعجاب و حیرت کو ملاحظہ کیا ہے، جس میں شاعر گرفتار ہے اور عالمِ تنہائی میں محبوب سے ہم کلام ہے۔ بظاہر انداز سوالیہ ہے، لیکن حقیقت میں وہ اپنے ماضی کی کہانی متکلم انداز میں پیش کر رہا ہے اور بتانا چاہتا ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود وہ اپنا عہدِ وفا نباہ رہا ہے۔عہدِ وفا کی پابندی ہو یا تہذیب انسانی کی پاس داری، حبیبؔ کے تمام کلام میں جاری و ساری ہے۔ جہاں جوشؔ کا تصورِ عشق و محبت رومانس سے نکل کر عیاشی کی فضا میں داخل ہوگیا، وہیں حبیبؔ جونپوری کے تصورِ عشق میں کوئی گراوٹ، کوئی ابتذال اور کوئی بازاری پن جنم نہ لے سکا۔

اُن کی دوسری نظم "عہدِ ماضی" کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ نظم حسرتؔ موہانی کی غزل "وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے" کے تتبع میں لکھی ہے۔ حسرتؔ کی طرح حبیبؔ جونپوری کا محبوب بھی ایک جیتا جاگتا، چلتا پھرتا، ہنستا بولتا،

خوش ناخوش ہونے والا انسانی پیکر میں شرم و حیا کا مجسم شاہکار ہے۔ جس سے ملنا، جس سے باتیں کرنا اور جس کی زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہونا شاعر کا آغازِ اُلفت میں مقصدِ حیات تھا۔

اب وہ دن بیت گئے، وہ زمانہ باقی نہ رہا، فقط عہدِ ماضی کی یادیں رہ گئی ہیں، جو شاعر کو خون کے آنسو رُلا رہی ہیں۔

یاد ہے آغازِ اُلفت کا زمانہ یاد ہے
ڈال کر بانہوں میں بانہیں مسکرانا یاد ہے

آگے بڑھ بڑھ کر پلٹنا اور پھر رُکنا میرا
اس طرح دل کا مچلنا، تلملانا یاد ہے

وہ مری بیتابیٔ دل سے تری بیتابیاں
وہ مرے شکووں پہ تیرا سر جھکانا یاد ہے

گر کبھی خلوت میں چھیڑا قصۂ شامِ فراق
مسکرا کر ٹال جانا یاد ہے

سوچ کر انجامِ اُلفت کچھ جھجکنا خود بخود
دم بہ دم گھبرا کے مجھ کو آزمانا یاد ہے

یاد جس کی خون کے آنسو رلائے گی حبیبؔ
وہ حکایت یاد ہے اور وہ فسانہ یاد ہے

حبیبؔ جونپوری نے ترقی پسند شعراء کی کج روی کو نہیں اپنایا۔ انہوں نے یہ شاعری کی قدیم روایات سے بغاوت کی، نہ فن کے تقاضوں سے گریز۔ ہاں ترقی پسند شعراء سے انہوں نے یہ اثر قبول کیا کہ انہوں نے کاروبار محبت میں وہ رازداری نہیں برتی جو ہمارے قدیم شعراء کا شیوہ تھا۔ بلکہ ”بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی“ اُن کے کلام میں کہیں کہیں مکالمے کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سے بے محابا باتیں کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

تری اُمید پہ ٹھکرا رہا ہوں دنیا کو
تجھے بھی اپنے پہ یہ اعتبار ہے کہ نہیں

بتا قسم ہے اسی عہدِ دل نشیں کی تجھے
ترے بھی قلب میں اگلا سا پیار ہے کہ نہیں

وہ مری پژمردنی سے تیرا ہو جانا اُداس
وہ مجھے بھولی اداؤں سے ہنسانا یاد ہے

وہ مرا جذبات سے گھبرا کے تجھ سے روٹھنا
آبدیدہ ہو کے وہ تیرا منانا یاد ہے

انہوں نے فراق و وصل کی تلخی و شیرینی کا مزہ چکھا تھا۔ اُن کے کلام میں وصل کی سرخوشی و سرمستی بھی ہے اور فراق کی بیقراری اور دل سوزی بھی۔ اس میں درد بھی ہے اور کسک بھی، تڑپ بھی ہے اور گداز بھی، عیشِ رفتہ کی یادیں بھی ہیں اور حال کی ویرانیاں اور اُداسیاں بھی۔

خم بہ خم زلفوں کا وہ چہرے پہ میرے لوٹنا
بھینی بھینی نکہتوں میں ڈوب جانا یاد ہے

سُرخیوں سے وہ جھلک اٹھنا رُخِ ضوریز سے
لیتے لیتے نام میرا جھینپ جانا یاد ہے

بے جھجک ملتے تھے مجھ سے پاس آتے تھے مرے
وہ گھڑی، وہ وقت، وہ دل کش زمانہ یاد ہے

یاد جس کی خون کے آنسو رلائے گی حبیبؔ
وہ حکایت یاد ہے اور وہ فسانہ یاد ہے

حبیبؔ جونپوری کے کلام میں جذبات کی بڑی حسین ترجمانی ہے۔ جس میں غم کی چاشنی، یاس کا گداز اور دل کی بیقراریاں ہیں۔ اخترؔ شیرانی کی غزل:

مرے چمن کی فضا تم کو یاد کرتی ہے
بہار اور اس کی ہوا تم کو یاد کرتی ہے

لگتا ہے اس کے تتبع میں حبیبؔ جونپوری نے یہ نظم کہی:

مرتا ہوں کاش پھر تجھے اک بار دیکھ لوں
پھر اپنے نجاتِ خفتہ کو بیدار دیکھ لوں
پھر آئے مسکراتا ہوا تو مرے قریب
پھر برق پاش آتشیں رخسار دیکھ لوں

پھر شوخی و حجاب میں پیدا ہو کشمکش
پھر اِک نہیں میں سینکڑوں اقرار دیکھ لوں

اخترؔ شیرانی کے یہ اشعار دیکھیں:

جفا کے ناز کی عادت سہی تمھیں لیکن
مری غریب وفا تم کو یاد کرتی ہے

ہے جس کی آرزو اخترؔ کو مدتوں سے مگر
ہوئی نہیں جو خطا، تم کو یاد کرتی ہے

حبیبؔ جونپوری کے یہ اشعار دیکھیں:

دل ٹکڑے ٹکڑے ہے خلشِ ناتمام سے
اس تیرِ نیم کش کو کبھی یار دیکھ لوں

مایوس ہو کے ٹوٹنے کو ہے دلِ حبیبؔ
کچھ اس دلِ حبیبؔ ہی پہ رحم کھا کے آ

یا حبیبؔ کہتے ہیں:

آ زندگی کے واسطے تجھ پر مروں گا میں
نقشِ قدم پہ آخری سجدہ کروں گا میں

آ اور حجابِ ناز کے پردے اُٹھا کے آ
دنیا کے انتظار کو رنگیں بنا کے آ

کبھی کبھی حبیبؔ جونپوری زمانے کے بدلتے ہوئے ڈھنگ سے گھبرا کر اپنے محبوب سے سوال کرنے لگتے ہیں کہ پتا نہیں اب وہ دل کا رشتہ استوار ہے کہ نہیں:

بچھڑ کے بھی وہی باقی ہے زعم اُلفت کا
خزاں میں بھی وہی کیفِ بہار ہے کہ نہیں

نظر میں اب بھی ہے قیمت دل شکستہ کی
غریب عشق کا اب بھی وقار ہے کہ نہیں

بدل رہا ہے زمانہ بری طرح کروٹ
نہ جانے رشتۂ دل استوار ہے کہ نہیں

اسی لیے حبیبؔ جونپوری اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ کاش تم پھر مجھے ملنے آؤ اور میرے گھر کے درو و دیوار چمک اُٹھیں اور میں خود کو مست، بے خود اور سرشار دیکھ سکوں۔ اسی لیے کہتے ہیں:

پھر ذرے ذرے میں وہی جلوے ہوں ضو فگن
پھر گھر کو اپنے مطلعِ انوار دیکھ لوں

پھر پرفشاں ہوں حدِ نظر سے تجلیاں
پھر دونی رونقِ در و دیوار دیکھ لوں

پھر تیری چشمِ مست سے برسے شرابِ عشق
پھر خود کو مست و بے خود و سرشار دیکھ لوں

مجازؔ کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا

حبیبؔ جونپوری کا یہ شعر دیکھیں:

آ اور حجابِ ناز کے پردے اٹھا کے آ
دنیا کے انتظار کو رنگیں بنا کے آ

حبیبؔ جونپوری کے کلام میں کہیں کہیں شاعرانہ مصوری کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ شاعری اور مصوری کا تعلق بڑا گہرا اور پرانا ہے۔ قدرتی مناظر کی عکاسی محبوب کا سراپا اور دوسری دلآویز چیزیں ہمیشہ سے ہماری شاعری میں منعکس ہوتی رہی ہیں۔ حبیبؔ جونپوری نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

مثلاً مندرجہ ذیل اشعار دیکھیں:

دل میں کسک، نگہ میں جھجک، تن میں ارتعاش
رنگینیوں میں آج نہائے ہوئے ہیں آپ

بوٹا سا قد، وہ بھولی سی صورت، بدن گداز
اُف کتنی دل فریبی چھپائے ہوئے ہیں آپ

....

کھا رہا ہے سینۂ زخمی میں دل یوں پیچ و تاب
اور اُمڈا پڑ رہا ہے رُخ سے طوفانِ شباب

لے رہی ہے کروٹوں پر کروٹیں با اضطرار
آگ پر پارہ ہے یا بستر پر جسمِ بے قرار

سو رہی اک آہ کر کے، رو کے اُٹھ بیٹھی کبھی
انگلیوں میں لے کے زلفِ خم بہ خم اینٹھی کبھی

....

سُرخیاں سی وہ جھلک اٹھنا رخِ ضو ریز سے
لیتے لیتے نام میرا جھینپ جانا یاد ہے

....

پھر شوخی و حجاب میں پیدا ہو کشمکش
پھر اک نہیں میں سینکڑوں اقرار دیکھ لوں

جس طرح آتشؔ، غالبؔ اور ناسخؔ کی شاعری میں ہمیں شاعرانہ مصوری ملتی ہے اور اُن کے اشعار میں مضمون سے قطعِ نظر اظہار کی بعض ایسی خصوصیات ملتی ہیں جو بغیر شاعرانہ ذہن کے ممکن نہیں۔ یوں تو قوتِ تخیل شاعری کے بنیادی لوازم میں سے اگر شاعر کے مشاہدات و تجربات کی توسیع نہیں اور اس کا تعلق زندگی سے کم ہے تو یہ تخیل بے راہ رو ہوسکتی ہے اور ایسے دور ازکار مضامین کی طرف لے جاتی ہے جو ناقابلِ فہم بھی ہوتے ہیں اور کیفیت سے معرا بھی۔ لیکن قوتِ تخیل اگر شاعر کے تجرباتِ زندگی سے ہم آہنگ ہوجائے تو شعر کو جیتی جاگتی تصویر بنا دیتی ہے اور شاعر جب یہ تصویر کھینچتا ہے تو نقش میں نقاش کا تخیل اور احساس ایک نئی زندگی بھر دیتا ہے۔ اب تصویر صرف خطوط اور رنگوں کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ منہ سے بولنے لگتی ہے۔ آتشؔ، غالبؔ، ناسخؔ اور انیسؔ کی شاعری اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور حبیبؔ جونپوری کی شاعری میں بھی یہ تصویر اس طرح نظر آتی ہے۔

سو رہے ہیں مست و بے خود گھر کے کل پیر و جواں
ہو گئی ہیں بند حسن و عشق کی سرگوشیاں

ہاں مگر اک سمت اک گوشے میں کوئی نوحہ گر
لے رہی ہے کروٹیں پیہم کلیجہ تھام کر

آنکھ میں آنسو بھرے ہیں دل میں پنہاں درد ہے
لگ گئی ہے چپ سی اک چہرے کی رنگت زرد ہے

سوگ کے کپڑوں میں نازک جسم کفنائے ہوئے
رو رہی ہے دل میں ارمانوں کو دفنائے ہوئے

عمر آمادہ نہیں مردہ پرستی کے لیے
بار ہے یہ زندہ میت دوشِ ہستی کے لیے

روکتی ہے لاکھ قابو دل پہ پاتی ہی نہیں
ہائے رے ظالم جوانی بس میں آتی ہی نہیں

تھرتھرا کر کرتی ہے جب سونے بستر پہ نظر
لے کے اک کروٹ پٹک دیتی ہے وہ تکیہ پہ سر

طلدوپہر کی چھاؤں سا دورِ شادمانی ہو گیا
پیاس بھی بجھنے نہ پائی ختم پانی ہو گیا

آ کے ہونٹوں پہ کبھی مایوس آہیں تھم گئیں
اور کبھی سونی کلائی پہ نگاہیں جم گئیں

حبیبؔ جونپوری کے کلام میں میر حسنؔ اور میر انیسؔ کی طرح واقعہ نگاری اور موجود ہے، جو مناظر پیش کیے ہیں، اُن کی تمام جزئیات کو بھی ایک ماہر فن کی

حیثیت سے پیش کیا ہے اور کہیں بھی فطری انداز سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار جو کہ شام بلکہ اندھیری رات کا منظر پیش کرتے ہیں:

یہ اندھیری رات، یہ ساری فضا سوئی ہوئی
پتی پتی منظر خاموش میں کھوئی ہوئی

موجزن ہے بحر ظلمت تیرگی کا جوش ہے
شام ہی سے آج قندیل فلک خاموش ہے

چند تارے ہیں تو بے نور پتھرائے ہوئے
جیسے باسی ہار میں ہوں پھول کملائے ہوئے

کھب گیا ہے یوں گھٹا میں چاندنی کا صاف رنگ
جس طرح مایوسیوں میں دب کے رہ جائے امنگ

جب چمک اٹھتی ہیں بادل میں مچلتی بجلیاں
رات کے سینے سے اٹھنے لگتا ہے گھٹ کر دھواں

امڈی ہے کالی گھٹا دنیا ڈبونے کے لیے
یا چلی ہے بال کھولے رانڈ رونے کے لیے

چھا رہا ہے اک سناٹا سا باغِ دہر پر
آنکھ جھپکا لی ہے نرگس نے اداسی دیکھ کر

اونگھ کر سر رکھ دیے ہیں خود گلوں نے خار پر
نیند سی منصور کو یاد آ گئی ہے دار پر

وہ بھیانک سی گھٹن اشجار پر چھائی ہے
ہر لچکتی شاخ اک ناگن ہے لہرائی ہوئی

آ گیا ہے سارا عالم خامشی کی لہر میں
سانس لینے کی صدا اٹھتی نہیں ہے شہر میں

جتنی ہے گنجان بستی اتنی ہی ویران ہے
ہر گلی خاموش ہے ہر راستہ سنسان ہے

تیرگی میں اونچے نیچے کل مکاں کھوئے ہوئے
ذرے ذرے مست ہیں سب بام و در سوئے ہوئے

لوٹ لی ہے رات نے سارے مکانوں کی بہار
چھپ گئے ہیں پردۂ ظلمت میں کل نقش و نگار

اک مکاں سے بھی مکیں کی کچھ خبر ملتی نہیں
چلمنیں اٹھتی نہیں، زنجیرِ در ہلتی نہیں

گھر کی چل پھر بند ہے ہنگامہ دربار بند
کھڑکیاں دروازے سارے روزنِ دیوار بند

ہاتھ بھالے پر ہے بھالا دوش پر رکھے ہوئے
اونگھتا ہے پاسبان زانو پہ سر رکھے ہوئے

حبیبؔ جونپوری کے کلام میں ایک بڑی خصوصیت فطرت کی نقاشی ہے اور فطرت کی نقاشی کے ساتھ ساتھ ان میں جذباتِ انسانی کی رنگ آمیزی بھی موجود ہے۔تشبیہ واستعارہ کا حسن بھی ان کی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے جو کہ ان کے مندرجہ بالا اشعار میں بھی جھلکتا ہے۔ مثلاً اندھیری رات، منظرِ خاموش، بحرِ ظلمت، تیرگی کا جوش، قندیلِ فلک، بے نور تھرائے ہوئے، باسی ہار کملائے ہوئے، رات کا سینہ، بال کھولے رانڈ، باغِ دہر، گوشِ بلبل، گل اور خار، منصور اور دار، ناگن کا لہرانا، پردۂ ظلمت، چلمنیں، زنجیرِ در، روزنِ دیوار، یہ تمام نادر تشبیہات واستعارات صرف ایک نظم میں موجود ہیں۔ ان کی تقریباً تمام نظموں میں یہ حسن موجود ہے۔ بیوہ کی خودکشی وہ نظم ہے جس میں جذبات کی روانی، اعلیٰ منظر نگاری، واقعات کا تسلسل،زبان کی دل کشی اور آخر میں قوم میں ایک جاہلانہ اور فرسودہ رسم جاری رہنے پر شدید طنز ہے۔اس نظم میں حبیبؔ جونپوری کی شاعری کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے ہیں۔ انھوں نے ''بیوہ کی پہلی رات'' کا جو دل دوز اور دل فگار منظر پیش کیا ہے،نظمیہ شاعری میں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ یہ نظم

عورت پر ہونے والے ظلم وستم اور ان معاشرتی رسم ورواج کا پتا دیتی ہے جنہوں نے حالؔی کو "چپ کی داد" لکھنے پر مجبور کیا۔ پچپاس اشعار پر مشتمل یہ نظم ایک بیوہ عورت، شکستہ جذبات اور معاشرے کی ستم ظریفیوں کی روداد اس طرح، اس انداز میں پیش کرتی ہے کہ پڑھتے ہوئے دل دہل جاتا ہے۔ کس طرح ساس، نندیں، بہن، بھائی اس کے ساتھ سلوک کرتے ہیں، یہ پڑھ کر انسان کا دل ضرور دکھتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

آرہے ہیں یاد پیہم ساس نندوں کے سلوک
اٹھ رہی ہے بیتاب مضطر دل میں ہوک

اپنی ماں بہنوں کا بھی آنکھیں چرانا یاد ہے
ایسی دنیا میں کسی کا چھوڑ جانا یاد ہے

باغباں تو قبر میں ہے کون اب دیکھے بہار
خود اسی کو تیر اس کے کرنے والے ہیں شکار

جب نظر آتا نہیں دیتا کوئی بیکس کا ساتھ
زہر کی شیشی کی جانب خود بخود بڑھتا ہے ہاتھ

دل تڑپ کر کہہ رہا ہے جلد اس دنیا کو چھوڑ
چوڑیاں توڑیں تو پھر زنجیرِ ہستی کو بھی توڑ

دم اگر نکلا تو کھوئی زندگی مل جائے گی
چاہے رونا، چاہے ہنسنا پھر نہ روکے گا کوئی

سوگ کھپ جائے گا تیرا موت کی آغوش میں
لب کشائی کا نہیں ڈر خلوتِ خاموش میں

حبیبؔ جونپوری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اُس مظلوم عورت کے جذبات کی عکاسی اس خوب صورتی سے کی ہے کہ اس ہنرمندی پر انہیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

نظموں میں قومی اور سیاسی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مولانا حالیؔ سے لے کر آج تک سینکڑوں شاعروں نے قوم کی بے حسی کا رونا رویا اور قوم کی اصلاح کی فکر کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ حبیبؔ جونپوری کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک ایسے دردمند اور پُر خلوص شاعر سے ملاقات ہوتی ہے، جسے قوم کے زوال اور پستی اور اخلاقی قدروں سے بے اعتنائی کا غم مضطرب اور پریشان کردیتا ہے۔ مولانا حالیؔ کو بھی یہی غم تھا، لیکن اُن کے سامنے جو قوم تھی وہ ہندوستان میں ساڑھے سات سو سال تک حکمرانی کرنے کے بعد تنزل کا شکار ہوئی تھی۔ حکمرانی جب غلامی میں بدل جاتی ہے تو خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر شکست و ریخت کا عمل جاری رہتا ہے۔ غلامی انسان کو مٹی میں رول دیتی ہے اور اس سے وہ تمام اقدار چھین لیتی ہے جن پر انسانیت کا مدار اور شرفِ انسانی کا انحصار ہوتا ہے۔ مولانا حالیؔ کے اصلاحی پروگرام میں قوم کی کھوئی عظمت کی بازیافت کے ساتھ ان اخلاقی اقدار کی بحالی بھی شامل تھی، جن سے پوری قوم محروم ہوچکی تھی۔ چنانچہ وہ مٹی میں گری پڑی قوم کو کبھی اس کی عظمتِ رفتہ یاد دلا کر اور کبھی احساسِ زیاں بیدار کرکے سربلند کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نظموں میں قوم

کے زوال کی نوحہ گری اور زخموں کی بخیہ گری دونوں موجود ہیں۔ حبیب جونپوری کی پیدائش ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ تحریکِ خلافت کے اختتام تک وہ پانچ سال کے ہو چکے تھے۔ اگرچہ اس کمسنی میں ملی اور سیاسی شعور ناپختہ رہا ہوگا۔ لیکن جگہ جگہ جلسوں کا انعقاد اور انگریزی دشمنی پر مبنی نعرے تو کان میں گئے ہوں گے۔ اپنے قیامِ کلکتہ کے زمانے میں انہوں نے بہت ہی نزدیک سے انگریزی حرکتوں اور ان کی چالوں کو دیکھا ہوگا۔ یہی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے ان کی شاہکار نظم ''فرنگی'' وجود میں آئی۔

اس نظم کے تین حصے ہیں۔ پہلے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ انگریز اپنے آپ کو خادمِ خلق کہتے تھے۔ لوگوں کی نکبت اور ناداری مٹانے اور قوم کی کشتی کو پار لگانے کا وعدہ کرتے تھے:

تم تو خدمت کے جذبے سے سرشار تھے
تم تو غربت مٹانے پہ تیار تھے
تم تو امن و اماں کے طرف دار تھے
تم تو کشور کشائی سے بیزار تھے
تم تو قوموں کے حق کے نگہ دار تھے
تم تو مجبور و بےبس کے غمخوار تھے
تم تو آقا تھے مالک تھے سردار تھے
تم تو قوموں کی کشتی کے پتوار تھے
تم تو حسنِ تدبر کے شاہکار تھے
تم تو ناچار بندوں پہ خونبار تھے
تم تو عظمت کے لشکر کے سالار تھے

تم تو گلہائے حکمت کی مہکار تھے

تم تو انسانیت کے پرستار تھے

دوسرے باب میں بتایا گیا ہے کہ جب انگریزوں کا عمل نزدیک سے دیکھا گیا تو یہ عقدہ کھلا کہ وہ مکر و فریب کے استاد، بدنوں کے خریدار، بدقماش، بدکار اور مسلمانوں کے خون کے طلبگار ہیں:

اب تمہارے عمل سے یہ عقدہ کھلا

تم حقیقت میں شاطر تھے مکار تھے

تم منافق تھے فاسق تھے بدکار تھے

تم عداوت کے پتلے تھے خونخوار تھے

تم بڑے شعبدہ باز ہشیار تھے

تم مسلمان کے خوں کے طلبگار تھے

تم شہیدوں کے دشمن تھے غدار تھے

تم ازل سے سیہ دل سیہ کار تھے

تم فدائے تماشائے ادبار تھے

تم اصالت میں رہزن تھے خرکار تھے

تم ہر اک مکر و فن میں گرفتار تھے

تم مثالِ فراعیں خطاکار تھے

تم برہنہ بدن کے خریدار تھے

تم مثالی سزا کے سزاوار تھے

ہم بتاتے ہیں جو کچھ ذرا دیکھ لو
اپنے کردار کا آئینہ دیکھ لو

آخری باب میں کہا گیا ہے کہ انگریز شدید سزا کے حق دار ہیں۔ کیونکہ اسلام کا بانکپن لوٹا ہے، گلوں سے اُن کی پھبن چھین لی ہے، زندگی کا چمن لوٹا ہے۔ پنجاب کا حسن، گنگا جمنا کی تہذیب، مقبروں کی ضیا اور میتوں کا کفن لوٹا ہے، سادات کی حشمت اور برہمنوں کی عظمت اور اہلِ مشرق کا فن، آدمی کا فن، مرد سے اس کی سطوت اور سرمایۂ حسنِ زن چھینا ہے۔ شہسواروں کے دل، بڑے بڑے سرماؤں کے تن اور تمام دنیا میں سب سے منفرد کرنے والا مسلمانوں کا رنگِ سخن چھین لیا ہے اور آخر یہ کہتے ہیں کہ یہ دو دن کی فتح پر خوش ہونا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اور تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو کہ ہمیشہ برائی کا ہوتا آیا ہے۔

تم نے لوٹا ہے اسلام کا بانکپن
آرزوؤں کا گل، زندگی کا چمن
رونقِ نازنیناں، گلوں کی پھبن
حسنِ پنجاب، تہذیبِ گنگ و جمن
مقبروں کی ضیا ،میتوں کا کفن
سیدوں کا حشم، عظمتِ برہمن
تم نے دفنا دیا اہلِ مشرق کا فن
جوہرِ آدمی، اعتزازِ وطن

سطوتِ مرد، سرمایۂ حسنِ زن
شہسواروں کے دل، سورماؤں کے تن
قلبِ بے باک، بازوئے شمشیر زن
ساری دنیا میں ممتاز رنگِ سخن
اپنی فتحِ دو روزہ پہ پھولے ہو کیوں
خبث باطن کا انجام بھولے ہو کیوں

آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اس نظم میں نہ چکبستؔ کی زبان کی تیزی ہے نہ جوشؔ کی سی للکار ہے بلکہ صاف اور ستھری زبان میں دلائل پیش کر کے انگریزوں کو سزا کا مستوجب ٹھہرا گیا ہے۔ اس نظم میں موسیقیت بھی ہے اور اس میں خوبصورت الفاظ و نادر تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اسلام کا بانکپن، آرزوؤں کا گل، زندگی کا چمن، رونقِ نازنیناں، گلوں کی پھبن، مقبروں کی ضیا، سیدوں کا حشم، عظمتِ برہمن، اہلِ مشرق کا فن، اعتزازِ وطن، سطوتِ مرد، شہسواروں کے دل، سورماؤں کے تن، قلبِ بے باک، بازوئے شمشیرو زن، ممتاز رنگِ سخن، یہ تمام کے تمام الفاظ وتشبیہات ایک منفرد حسن لئے ہوئے ہیں۔

زمانے کی گردش اور قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جو شخص عربی، فارسی اور اُردو زبانوں کی اعلیٰ اسناد رکھتا ہو، جو ضلع جالون میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کا اعلیٰ مدرس ہو، وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے درس و تدریس کا شعبہ چھوڑ کر (۴۲۔ ۱۹۴۱ء) میں کلکتے میں لیبر آفیسر بن جائے۔ پیشے کی یہ تبدیلی محکمۂ تعلیم کے ماتھے پر ایک بدنما داغ تھا، مگر حبیبؔ جونپوری کو اس سفر سے اور اس نوکری سے دو فائدے پہنچے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ برسوں کے بعد وامقؔ جونپوری سے راہ و رسم بڑھی، وامقؔ جونپوری وہ شاعر تھے جن کی نظم ''بھوکا ہے بنگال'' نے پورے ہندوستان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دوسرا

فائدہ یہ ہوا کہ انہیں بہت قریب سے انگریزوں کی عادات و سکنات، طرزِ جہاں بانی اور ہندوستانیوں کے ساتھ ظالمانہ اور معاندانہ سلوک دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اسی لیے اُنہوں نے اوپر پیش کی گئی نظم ''فرنگی'' کہی۔

بنگال کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور غربت کا تذکرہ وہ اکثر اپنے خطوط میں کیا کرتے تھے۔ پھر قحط کی وجہ سے مانک تلہ کے مسلمان بچوں کے بے گورو کفن لاشے دیکھ کر اُن کے ذہن سے اُن لاشوں کا تصور محو نہ ہوسکا۔ پھر جب ۱۹۴۶ء میں نوا کھالی میں چار سو مسلمان شہید کردیے گئے تو انہوں نے ''لاشیں'' کے عنوان سے ایک عجیب نظم کہی۔اس نظم میں صرف واقعات و حادثات کا تذکرہ نہیں، بلکہ اس میں لاشیں بطور استعارہ نظم کی گئی ہیں، انہوں نے مسلمان لاشوں کو مردہ تصور نہیں کیا، بلکہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے یہ سو رہی ہیں۔ اگرچہ لاشیں بے بصر ہیں، مگر یہی منزل کی راہوں کا تعین کریں گی۔ یہ معمولی مسلمانوں کی لاشیں نہیں ہیں، ان پر آسمان گریہ کرتا ہے اور کرنیں چوم کر گزرتی ہیں۔

صبر کیونکر ہو دیکھ کر لاشیں
جا بجا خون دربدر لاشیں

اپنی جنت الگ بسائیں گی
یہ مسلماں کی معتبر لاشیں

آسماں ان پہ خون روئے گا
یہ نہ سمجھو ہیں کم اثر لاشیں

دیکھ کر مہروش شہیدوں کو
کرنیں گزری ہیں چوم کر لاشیں

آرزوئے حصولِ مقصد میں
سو رہی ہیں زمین پہ لاشیں

آج اہلِ نظر نے پھر دیکھا
عرش پہ خون، فرش پہ لاشیں

یہ دکھائیں گی منزلوں کا نشاں
جن کو کہتے ہیں بے بصر لاشیں

آخری شعر میں شاعر مسلمانوں کو عزم و حوصلہ کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں حادثۂ کربلا سے مسلمان دھوپ اور اس دھوپ میں جلتی لاشوں کو دیکھتا چلا آیا ہے۔

دیکھتے آئے ہیں یونہی ہم لوگ
عمر بھر دھوپ، عمر بھر لاشیں

تمام دنیا میں شاعری کی بنیاد یا خیال ہے، یا جذبہ۔ خیال میں عقلی دلائل، منطق، فلسفہ اور جذبات میں خوشی و غم، غیظ و غصہ نفرت و محبت، عقیدت و عداوت شامل ہیں۔ عقلی دلائل و فلسفہ انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، لیکن جذبات میں اتار چڑھاؤ تو ممکن ہے، مگر جذبات نہ حضرت آدم کے دور میں تبدیل ہوئے، نہ آج

تبدیلی کی طرف مائل ہیں۔ اسی لیے جذبے کی سرشاری سدا بہار ہے، جبکہ خیال کی شاعری موسموں کے تغیر و تبدل کی طرح آج کچھ ہے، کل کچھ، حبیب جونپوری خیال آرائی اور خیال بندی کو ثانوی درجہ دیتے تھے اور جذبات نگاری کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ اُن کی صرف تین نظمیں "مفلس طالب علم"، "بیوہ کی خودکشی" اور "نوجوان ساتھی کی موت" ایسی ہیں جن میں جذبات کی الگ الگ دنیائیں آباد ہیں۔ "مفلس طالب علم" میں ایک ایسے طالب علم کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کے کپڑے بوسیدہ ہیں، جوتیاں پھٹی ہیں، جس کے پاس فیس ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں، جب وہ امیر طلباء کو دیکھتا ہے تو اس کی نگاہیں جھینپ جاتی ہیں، وہ سہما سہما کلاس میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ شاعر ایسے بچے کے خوفناک مستقبل کے بارے میں پریشان ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جب تک ملک سے مفلسی دور نہ ہوگی قوم اور ملک کی ترقی محال ہے۔ اس نظم کو دیکھیں:

جستجوئے علم میں باندھے ہوئے کس کر کمر
آ رہا ہے درسگہ کی سمت مفلس کا پسر

کچھ اڑا سا رنگ رُخ کا کچھ پریشاں سر کے بال
دل ہجومِ غم میں ڈوبا منحنی غمگین چال

انتہائے یاس میں گردن کو نہوڑائے ہوئے
جوشِ گریہ سے بوجھل ہونٹ تھرائے ہوئے

روز کے فاقوں نے یوں چوسا ہے رگ رگ کا لہو
اُٹھ نہیں سکتا دلِ مردہ سے بارِ آرزو

تھرتھراتا ہے وفورِ ضعف سے جسمِ نزار
چھوٹی پڑتی ہیں کتابیں ہاتھ سے بے اختیار

گل سے چہرے پر غبارِ مفلسی چھایا ہوا
جسمِ مردہ میلے کپڑوں میں کفنایا ہوا

ٹوپی کچھ چکٹی ہوئی، جوتی پھٹی، کرتہ پھٹا
کوٹ بھائی کا پرانا جس پہ دھبے جابجا

کالر اُدھڑا، کہنی مسکی، مونڈھے بھی مسکے ہوئے
آستیں ہاتھوں پہ ڈھلکی ہے، بٹن ٹوٹے ہوئے

جتنا ہوتا جا رہا ہے درسگہ سے متصل
پاؤں رکتے جا رہے ہیں، بیٹھتا جاتا ہے دل

فیس باقی ہے تو ایسا چور بجھتے دل میں ہے
مٹتی جاتی ہے چمک وہ بھی جو مستقبل میں ہے

جبر یہ کچھ مسکراتا رنج و غم ٹالے ہوئے
سیدھا درجے میں چلا جاتا ہے سر ڈالے ہوئے

چھچھے کرتے ہیں جب اسکول کے سب گلعذار
دیکھ لیتا ہے نگھیوں سے بھرت بار بار

اقتضائے سن سے اٹھی بھی تبسم کی لہر
ہائے قسمت بن گئی ہونٹوں تک آتے آتے زہر

چھیڑتے ہیں ساتھ کے لڑکے جو غمگیں دیکھ کر
مسکرا دیتا ہے لیکن جھینپ جاتی ہے نظر

یہ نظم صرف ایک طالب علم کی مفلسی اور غربت کا نقشہ ہی پیش نہیں کرتی بلکہ اس نظم میں ایک پورے عہد کا درد اور کرب سمٹ آیا ہے۔ یہ نظم فکری اور فنی اعتبار سے چالیس کی دہائی میں لکھی جانے والی اعلیٰ ترین نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ شدت تاثر اور موضوع کے حوالے سے یہ نظم نہ صرف ہندوستان کی اقتصادی صورتِ حال کو سامنے لاتی ہے بلکہ جبر اور استحصال کے شکنجے میں جکڑے ہوئے انسانوں کا نوحہ بھی ہے۔ آخری اشعار میں حبیبؔ جونپوری لکھتے ہیں:

مفلسی نے اس طرح کر دی ہے کچھ مٹی خراب
غیر تو کیا اپنے سائے سے بھی آتا ہے حجاب

پاس میں استاد کی بھی بدلی نظریں بھانپ کر
تلملا اٹھا ہے رہ جاتی ہمت کانپ کر

حوصلے کیا چھوڑے تن میں جان بھی باقی نہیں
مفلسی انسان کو انسان بھی رکھتی نہیں

بجھ گیا دل کھپ گئی جاں سعیِ زیبا کیا کرے
کوئی سمجھا دے مجھے پڑھ لکھ کے مردہ کیا کرے

اے حبیبؔ اندھی ہوا میں شمع جل سکتی نہیں
یہ زمینِ ہند ہے کروٹ بدل سکتی نہیں

اس نظم میں حبیبؔ جونپوری کا انداز خطیبانہ نہیں، مصلحانہ ہے۔ انہوں نے واقعات بیان کرکے پوری انسانیت کے شعور کو جھنجھوڑا ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کی نگاہ کسی ایک فرقے کے افعال و اعمال پر نہ تھی، بلکہ پوری انسانی برادری ان کی فکر کا محور تھی۔

ان کی ایک اور نظم "نوجوان ساتھی کی موت" ہے۔ اس نوجوان دوست کا نام سراج الحسن ولد فیاض حسین تھا۔ وہ جون پور کا رہنے والا شاعر بھی تھا اور مقرر بھی۔ اگرچہ اس میں علمی استعداد کم تھی، لیکن قدرت نے اُسے عزم و ہمت سے خوب نوازا تھا۔ حبیبؔ جونپوری خود ایک زبردست مقرر تھے، اس لیے دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ ایجی ٹیشن کے موقع پر اس نے ولبھ بھائی پنتھ وزیر اعلیٰ یو پی کے خلاف ایسی زبردست تقریر کی کہ لوگ وزیر اعلیٰ کی جان کے درپے ہوگئے۔ سراج الحسن کو گرفتار کرکے بنارس جیل میں رکھا گیا اور اتنی اذیت پہنچائی گئی کہ جب وہ قید سے رہا ہوکر گھر آیا تو اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا عین عالمِ شباب میں انتقال

وگیا۔ نظم کیا ہے، اسی دوست کا نوحہ ہے، جس میں شاعری کم ہے، جذبات کی شدت زیادہ ہے۔ اسی شخصی نوحے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں کردار نگاری کا بڑا ملکہ تھا۔

وہ نظم مندرجہ ذیل ہے:

ہو گیا ہے اشک افشاں آج کیوں یہ آسماں
مجھ کو بدلا سا نظر آتا ہے کیوں رنگِ جہاں

تھماتی ہے فضا اور خوں بداماں ہے اماں
خاک اُڑاتی ہے ہوا سر دھن رہی ہیں آندھیاں

زندگی میں کیا کمی آئی کہ گھبراتا ہے دل
یاالٰہی یک بیک کیوں بیٹھتا جاتا ہے دل

نوجوانانِ چمن کے رُخ سے ہے حسرت عیاں
قمریاں ماتم کناں ہیں بلبلیں گریہ کناں

سبزہ خوابیدہ بھی لیتا نہیں انگڑائیاں
یاالٰہی کیا ہوا گریاں ہے ہر پیر و جواں

کون چھوٹا کس کے غم میں گل گریباں چاک ہے
خاک ملتی کس کی خاطر نرگسِ بے باک ہے

میرے استعجاب و حسرت پر یہ کلیوں نے کہا
رنگِ محفل مرنے والا ساتھ اپنے لے گیا

سونی محفل ہو گئی ہے حسرتوں کا خوں ہوا
اس لیے ہے آہ و زاری نالہ و شیون بکا

صبر کا دامن نہ کیوں پھر ہاتھ سے چھٹنے لگے
دل کی دنیا سامنے آنکھوں کے جب لٹنے لگے

یہ نظم بھی دل کش اور منفرد تشبیہات لئے ہوئے ہے۔

حبیبؔ جونپوری کو اپنے استاد آرزوؔ لکھنوی سے بڑی عقیدت اور ان کے دل میں اپنے استاد کا بڑا احترام تھا۔ اس لیے آرزوؔ لکھنوی کے انتقال پر انہوں نے ایک نایاب نظم کہی تھی۔ اس کی ہیت سولہ رکنی تھی اور آخری شعر میں استاد ہی کی غزل کا مقطع بھی رکھ دیا تھا، لیکن افسوس اب ہمیں یہ نظم دستیاب نہیں ہو سکی۔ اس کا مقطع یہ ہے:

آرزو آزرو کیا ہوا کیا ہوا کچھ کہو
کچھ کہو چپ ہو کیوں چپ ہو کیوں
منہ فق، زرد رُخ، چشمِ تر، خشک لب
آگ بولو کہو کس چمن میں لگی

حبیبؔ جونپوری کو میر انیسؔ سے الفت، علامہ اقبالؔ سے عقیدت اور عابد علی عابدؔ سے چشمک تھی، لیکن جب اُن کے والد کے انتقال کے چند ماہ بعد عابد علی عابدؔ کا انتقال ہوا تو انہوں نے ان کے سانحۂ ارتحال پر ایک قطعہ کہا، جس سے اندازہ ہوتا ہے

کہ وہ عابد علی عابدؔ کو ایک اہم شاعر تسلیم کرتے تھے۔ قطعہ یہ ہے:

درد کی ٹیسوں نے دل کو کر لیا آماجگاہ
دل تو ٹوٹا تھا مرا پہلے ہی والد کے بغیر

حسرتِ نظارگی کچھ مضمحل سی ہو گئی
اُٹھ گیا لطفِ سخن گوئی بھی عابد کے بغیر

۱۹۷۴ء میں میر انیسؔ کی صد سالہ برسی کا اہتمام ہوا۔ اس سلسلے میں لاہور میں بیادِ انیسؔ ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں حبیبؔ جونپوری نے انیسؔ پر ایک نظم پڑھی۔ اس چھوٹی سی سات شعر کی نظم میں انہوں نے انیسؔ کی بارہ صفات گنائی ہیں:

۱۔ عظمتِ اُردو کا دل رکھ لیا

۲۔ شاعری کو رنگِ کامل عطا کیا

۳۔ تا عمر مرثیہ گوئی میں مستغرق رہا

۴۔ شعر اس کے دل پر خود نازل ہوتا تھا

۵۔ دنیا کو ایک نیا رنگِ ثنا خوانی دیا

۶۔ ہر پرانے اسلوب کو باطل کر دیا

۷۔ خدا سے جو مانگا اُسے ملا

۸۔ وہ دنیا کا سائل نہ بنا

۹۔ لفظوں اور حرفوں کو ترنم اور مزا دیا

۱۰۔ عیوبِ شعر زائل کر دیئے

۱۱۔ جدت کے خصائل اپنائے

۱۲۔ کربلا کی داستاں سے درد کی منزل طے کی

نظم مندرجہ ذیل ہے:

عظمتِ اُردو کا جس نے رکھ لیا دل وہ انیسؔ
شاعری کو دے گیا جو رنگِ کامل وہ انیسؔ

عمر بھر مرثیہ گوئی میں مستغرق رہا
جس کے دل پر شعر خود ہوتا تھا نازل وہ انیسؔ

شاعروں کو اک نیا رنگِ ثنا خوانی دیا
کر دیا جس نے ہر اک اسلوب باطل وہ انیسؔ

جو کیا اس نے طلب اس کے خدا نے دے دیا
جو ہوا دنیا میں دنیا کا نہ سائل وہ انیسؔ

دے کے لفظوں کو ترنم سا حرفِ سادہ کو مزا
کر دیے جس نے عیوبِ شعر زائل وہ انیسؔ

جو گزرگاہِ آبِ وجد پر چلے وہ اور ہیں
جس نے اپنائے ہیں جدت کے خصائل وہ انیسؔ

خانۂ دل میں بسا کر کربلا کی داستاں
جس نے طے کی درد کی ہر ایک منزل وہ انیسؔ

وحیدؔالحسن ہاشمی اس نظم کے متعلق رقمطراز ہیں:

''میرے پاس انیسؔ پر متعدد طویل نظمیں اور مسدس ہیں۔ میں اس نظم کا اُن سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا، لیکن پوری دیانت سے تحریر کر رہا ہوں کہ جو ایجاز و اختصار، معنویت کے ساتھ اس نظم میں موجود ہیں، وہ اپنا الگ حسن رکھتے ہیں''

حبیبؔ جونپوری کو علامہ اقبالؔ سے بھی بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ اس لیے انہوں نے باقاعدہ ''علامہ اقبالؔ'' کے عنوان سے ایک نظم کہی اور اس میں انہوں نے علامہ کے فنِ شاعری اور ملتِ اسلامیہ سے اُن کے لگاؤ اور حسنِ عقیدت کے بارے میں نہایت آسان اور عام فہم زبان میں اپنا مافی الضمیر پیش کیا ہے۔ نظم یہ ہے:

باتوں میں تھی دلیل، حوالہ سخن میں تھا
تو تھا تو گفتگو کا مزا انجمن میں تھا

قرآن کی فضا میں پلا تھا ترا شعور
اسلام کا مزاج بانکپن میں تھا

دلدادۂ علومِ فرنگی تھا دل ترا
لیکن خیال خطۂ ارضِ وطن میں تھا

جہلِ خزاں کا دور گلوں سے تھا دور دور
جب تک ترا وجود فضائے چمن میں تھا

لکھی وہ داستانِ غمِ دجلہ و فرات
چکھا وہ ذائقہ بھی جو گنگ و جمن میں تھا

سارا سمٹ کے آگیا تیرے کلام میں
جتنا بھی حسنِ لالہ و سرو و سمن میں تھا

اب اس سے بڑھ کے بس میں ترے تھا بھی کچھ نہیں
ملت کو دے دیا وہ لہو جو بدن میں تھا

راہِ عمل دکھاتا رہا قوم کو مگر
تو مطمئن تھا دل ترا رنج و محن میں تھا

ہر دم مدینہ و نجف و کربلا کی فکر
تیرا کہاں جواب محبت کے فن میں تھا

''اُردو'' اور ''شاعر'' دو الگ قبیلے کی نظمیں ہیں۔ نظم ''اُردو'' کو محاسنِ اُردو کہنا چاہیے، اس نظم میں ان افراد کے اسمائے گرامی بھی آئے ہیں جنہوں نے اُردو زبان کو کچھ دیا ہے۔ پروفیسر حامد حسن نے اپنی کتاب ''داستانِ تاریخِ اُردو'' میں تحریر کیا ہے کہ اُردو کا

لفظ ''تھا'' پہلی بار اشرف جہانگیر سمنانی نے ساتویں صدی میں اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے۔ شعرائے قدیم و جدید نے اپنی تخلیق سے اُردو کو جو نعمتیں بخشیں، ان کا ذکر اس نظم میں بڑے عمدہ پیرائے میں کیا گیا ہے۔

نظم یہ ہے:

خطۂ ارض پہ کیا شان ہے تیری اُردو
تو مری زیست کا ارمان ہے میری اُردو

تجھ کو بخشا گیا دنیا میں معلّٰی کا خطاب
تو وہ جوہر ہے کہ تیرا نہیں دنیا میں جواب

گلشنِ دہر میں موجود ہے خوشبو کی طرح
تو صحرائے خیالات میں آہو کی طرح

تیری عظمت کوئی اشرف کی زباں سے پوچھے
نفسِ مضمون ترا خسرو کے بیاں سے پوچھے

یوں تو کہنے کو وطن ہے ترا یہ برصغیر
مگر اے لیلیٰ جاں تیرا ہر اک دل ہے اسیر

تجھ پہ نازاں تھی قلب کے جذبات کی رو
کبھی دلی تو کبھی لکھنؤ پہنچی تری ضو

تجھ کو اعزاز عجب شاہجہاں نے بخشا
لطفِ شائستگی سوداؔ کی زباں نے بخشا

آ گیا دل میں ترے میر تقی میرؔ کا سوز
دے گیا درد کی لذت تجھے دلگیرؔ کا سوز

مومن و ذوق کے افکار تجھے راس آئے
ذہنِ غالبؔ کے خیالات ترے پاس آئے

آ گیا ترے کفِ دست میں عالم کا ضمیر
کر گئے تجھ کو سرافراز انیسؔ اور دبیرؔ

داغؔ نے تجھ کو دیئے عشق کے انداز نئے
فکرِ اقبالؔ سے کیا کیا نہ ملے راز نئے

جوشؔ کی شعلہ بیانی نے تجھے دی وسعت
آرزوؔ کی ہمہ دانی نے تجھے دی وقعت

کر گیا تجھ کو بلند آلِ رضاؔ کا اسلوب
دے گیا لہجۂ توفیقؔ کا دھیما اسلوب

آخری شعر میں زبان اُردو کا ایک ایسا حُسن بیان کیا ہے جس کی طرف کم شاعر نے توجہ دی۔ اسی ایک شعر سے حبیبؔ جونپوری کے تخیل کی سادگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، کہتے ہیں:

شادی و غم میں تجھے یاد کیا کرتے ہیں
تیری آواز میں فریاد کیا کرتے ہیں

"شاعر" کے محاسن، اس کے لہجے اس کے انداز اور اس کی بلندیٔ فکر پر متعدد شعراء نے نظمیں لکھی ہیں۔ خاص طور سے علامہ اقبالؔ نے شاعر کو "دیدۂ بینائے قوم" کہا ہے۔ اس نظم میں کل نو اشعار ہیں اور شاعر کی دس صفتیں بیان کی گئی ہیں:

ا۔ شاعر انسان تو انسان ذاتِ خاکی کو نظر کی روشنی بخشتا ہے۔

۲۔ وہ چاہے تو برگِ گل میں لوہے کی طاقت دے دے۔

۳۔ اس کا تخیل ظلمتِ شب کو سحر کی تجلی بانٹتا ہے۔

۴۔ جب عالم کی تباہی کی سازش ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے وہی اس سازش کو بے نقاب کرتا ہے۔

۵۔ جب ظلم جمہوریت کا گلا کاٹنے کے لیے بڑھتا ہے تو شاعر بے گناہ عوام کی مدد کرتا ہے۔

۶۔ شاعر حسنِ فطرت کا عاشق ہے۔ اگر فطرت اس سے سر طلب کرے تو وہ سر کٹانے پر تیار رہتا ہے۔

۷۔ شاعر خود تہی دامان ہے، مگر اپنے اخلاص سے تہذیب انسانی کا دامن بھر دیتا ہے۔

۸۔ وہ تھکی ہوئی انسانیت کو ذوقِ سفر بخشتا ہے۔

۹۔ شاعر کو خدا نے عشق کی طاقت دی ہے، جس کے زور سے وہ لوہے کو موم کر دیتا ہے۔

۱۰۔ شاعر اپنی قوت ادراک سے موت کو تسخیر کر لیتا ہے اور پھر لوگوں کو جینے کا ہنر دیتا ہے۔

نظم یہ ہے:

خاک کے ذروں کو تنویرِ نظر دیتا ہے وہ
پھول کی پتی کو لوہے کا جگر دیتا ہے وہ

جب اُسے مہمیز کرتی ہے تخیل کی ادا
ظلمتِ شب کو تجلی سحر دیتا ہے وہ

سازشِ بربادیِ عالم جہاں جب بھی ہوئی
ساری دنیا جاگ جاتی ہے خبر دیتا ہے وہ

جب رگِ جمہوریت کو کاٹنے بڑھتا ہے ظلم
بے گناہی صبر کرتی ہے اثر دیتا ہے وہ

اس قدر فطرت کے حسنِ دلربا پر ہے فدا
طالبِ سر ہو اگر فطرت تو سر دیتا ہے وہ

خود تہی دامن سہی لیکن زرِ اخلاص سے
دامنِ تہذیب انسانی کو بھر دیتا ہے وہ

عظمتِ آدم سے کر کے منضبط اپنا سخن
غم زدوں کو جرأتِ ذوقِ سفر دیتا ہے وہ

موت کو تسخیر کر کے قوتِ ادراک سے
مردنی چہروں کو جینے کا ہنر دیتا ہے وہ

قلبِ شاعر کو ملی ہیں عشق کی سب برکتیں
عشق ہی سے قلبِ آہن موم کر دیتا ہے وہ

حبیبؔ جونپوری نے جمہوریت، تضادِ فکر، ابلیس کی قیل و قال، نیا دور، نفسِ مطمئنہ، رسولِ امن، سرکار پھر سرکار ہے اور نجانے کتنی نظمیں تخلیق کیں، لیکن افسوس آج ان نظموں کا ایک مصرع بھی دستیاب نہیں۔ مقالہ نگار کو وحیدؔ الحسن ہاشمی اور حبیبؔ جونپوری کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر اختر ہاشمی نے بتایا کہ لاہور اور کراچی کے چند حضرات ان کی غزلیں اور نظمیں نقل کرنے کے لیے ان سے مانگ کر لے گئے۔ لیکن اصل مسودہ آج تک واپس نہ کیا۔

وحیدؔ الحسن ہاشمی صاحب حبیبؔ جونپوری کی نظموں کے متعلق رقمطراز ہیں:

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ مرحوم کی نظموں میں نہ گھن گرج ہے نہ للکار، نہ طوفانوں کا جوش وخروش ہے، نہ انقلاب انقلاب کا نعرہ، مگر ایک ایسی شیریں اور نرم لے

ہے جو اپنی نزاکت اور میانہ روی سے قلوب دو عالم کو تسخیر کر لیتی ہے"

"یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد ہونے کے ناتے ان کا تعلق خاص غزل سے ہونا چاہیے تھا۔لیکن ان کی متعدد نظمیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو خوبی اور حسن ان کی نظموں میں ہے، وہ غزلوں میں موجود نہیں۔ میں انہیں بنیادی طور پر نظم کا شاعر اس لیے کہتا ہوں کہ ان کی نظموں میں تغزل بھی ہے اور مرثیت بھی، غزل سے انہوں نے لہجہ لیا اور مرثیے سے سوز و گداز، اس کے علاوہ غزل کا شاعر قصیدہ نگار ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ غزل میں ایجاز و اختصار اور ایمائیت ہوتی ہے جبکہ قصیدہ وسعت اور تشریح چاہتا ہے۔ مرحوم بہترین قصیدہ نگار اسی لیے ہیں کہ ان میں نظم نگاری کا ملکہ بدرجۂ اتم موجود ہے"

حبیبؔ جونپوری کی نظموں کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ ان کی وہ نظمیں جو اپنے دامن میں اجتماعی طرزِ احساس لیے ہوئے ہیں زیادہ اثر انگیز ہیں کیونکہ ان کے مشاہدے کی وسیع کائنات ان نظموں میں سمٹ آئی ہے۔

حبیبؔ جونپوری کی نظمیں اُردو کے شعری ادب میں ایک خوبصورت اضافہ بھی ہیں اور حبیبؔ جونپوری کے شاعرانہ کمال کی مستند دستاویز بھی۔ یہ صاحبانِ ذوق کے لیے ایسا تحفہ ہیں جسے دلوں میں سجا کے رکھا جائے گا کیونکہ ژرف نگاہ شاعر، حبیبؔ جونپوری نے اپنے ماحول کی باریکیوں کا سراغ کامیابی سے پایا بھی ہے اور دنیا کو ان سے روشناس بھی کرایا ہے، مگر شعر کی زبان میں۔

حبیبؔ جونپوری کی نظموں سے ایک اور بات سامنے آتی ہے کہ وہ ایک مشاق شاعر ہیں۔ ان کا کلام شاعری کے اسالیب اور سخن سازی کے سبب سے نہیں بلکہ موضوعات کے تنوع، طرزِ بیان کی ندرت اور فکر و فن کی پختہ کاری کے سبب قبولیتِ عام کا درجہ پائے گا۔

☆☆☆☆☆

قصیدہ

قصیدہ، مفہوم اور پس منظر

اردو کے تقریباً سبھی اصناف سخن کے نام عربی ہیں۔ قصیدہ بھی انہیں میں سے ایک ہے لیکن قصیدہ صرف نام ہی کی حد تک عربی کا خوشہ چیں نہیں ہے بلکہ عروضی ہیئت اور مواد و مضامین کے اعتبار سے بھی عربی روایات کا حامل ہے۔

جدید نسیم اللغات میں قصیدہ کی تعریف یوں ہے:

"قصیدہ (ع۔ مذ) وہ ہم قافیہ نظم جس میں کسی کی تعریف برائی کی جائے اور اس کے اشعار سترہ سے زائد ہوں"۔

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں قصیدہ کے معنی یہ درج ہیں:

"قصیدہ کے لغوی معنی ہیں (الف) قصد شدہ (ب) سطبر یعنی دل دار گودایا گاڑھا مغز۔"

علی جواز زیدی قصیدہ کی تعریف میں رقمطراز ہیں:

"لغوی اعتبار سے قصیدہ کے دو معنی ہوسکتے ہیں اگر قصد، (باب ضرب) سے مشتق (مفعول) قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے، قصد یا ارادہ کیا ہوا، اور اگر قصد، (باب کرم) سے مشتق (فاعل) مانا جائے تو اس معنی "موٹا گاڑھا یا غلیظ" قرار پائیں گے۔"

شمیم احمد نے قصیدے لے کے مفہوم اور اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''گاڑھا مغز''۔ اس صنف سخن پر اس لفظ کا اطلاق اس لیے کیا جاتا ہے کہ یہ اپنے نادر و بلند پرشکوہ مضامین کی وجہ سے تمام اصناف سخن میں فوقیت رکھتی ہے اس لیے اصناف سخن میں وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں مغز کو حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے مغز سخن تصور کرتے ہوئے قصیدہ کا نام دیا گیا ہے۔'' (۴)

اصطلاحی معنوں میں قصیدہ صنف سخن ہوگی جو بالقصد اور بالارادہ وجود میں آئے یا پھر وہ صنف جس کے مضامین سننے اور پڑھنے والوں کو اسی طرح مرغوب ہوں جیسے مغز غلیظ وفربہ، قصیدہ ان ہی مفاہیم پر حاوی ہے۔ قصیدہ اپنی ہیت کے اعتبار سے غزل سے مشابہ ہے لیکن اپنے موضوعات اور مضامین کے حوالے سے غزل سے مختلف ہے کیونکہ اس میں مدح یا ہجو، وعظ ونصیحت، زم و بزم، عرفان و اخلاق بھی کچھ بیان ہوتا رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر:

''اصطلاحاً قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرع اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں اور جس میں مدح یا ذم، نصیحت و موعظمت یا مختلف کیفیات و حالات وغیرہ کا بیان ہو۔''

قصیدہ اردو میں براہ راست عربی سے نہیں بلکہ فارسی کے توسط سے آیا ہے اور اردو کے قصیدہ گو شعرا نے قصیدہ نگاری میں بالعموم فارسی شعراء ہی کی تقلید کی ہے۔ اور اردو شاعری کے آغاز کے وقت فارسی قصیدہ بڑی حد تک مدح کی تنگنائے میں محصور ہو چکا تھا۔ فارسی نمونوں کی تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدے کو سرکاری درباری صنف سمجھ لیا گیا۔ اور اس طرح قصیدہ اور مدح لازم و ملزوم ہوگئے اور ایک زمانہ وہ آیا جب تقریباً ہر اردو شاعر کچھ قصیدے ضرور کہنا پڑتے تھے۔ اگر ایک طرف مال دنیا کی تمنا میں امرائے

وقت کی مدح کی جاتی تھی تو دوسری طرف بزرگان دین کی شان میں بھی قصیدے کہے جاتے تھے جن کا مقصد حصول ثواب ہوتا تھا۔ قصیدہ گوئی کا ایک بڑا محرک یہ بھی تھا کہ قصیدے میں شاعر کو اپنی قادر الکلامی دکھانے کا موقع ملتا تھا۔ ہجو بھی قصیدے کا ایک موضوع رہی ہے اور کبھی کبھی بعض دوسرے موضوعات بھی شامل ہوگئے۔ چونکہ قصیدہ درباروں سے وابستہ ہوچکا تھا اس لیے درباری تصنات و تکلفات، ندرت مضمون، جدت تخیل، الفاظ کا شکوہ، تراکیب کا طمطراق، تشبیہات و استعارات کی ندرت، مبالغہ کا زور، اسلوب و اوزان کا طنطنہ قصیدہ گوئی کے لوازم سمجھے گئے۔ حتیٰ کہ درباری شعرا کی پیشہ ورانہ رقابتوں کی بدولت تکلف قصیدہ گوئی کی بنیادی خصوصیت بن گیا۔ بادشاہوں اور امراء کی مدح میں جو قصائد لکھے جاتے تھے ان کا مقصد چونکہ جلب زر ہوتا تھا اس لیے حقیقی جذبات ان میں مشکل ہی سے دخل پاسکتے تھے۔ قصائد میں وقت کی سیاسی اور سماجی تصویر کشی بھی کی گئی اور معدد اردو قصیدے اس لحاظ سے بھی ایک اہمیت کے حامل بن گئے کہ ان سے اس زمانے کی سیاسی اور سماجی حالات پر بھی روشنی پڑتی تھی جس زمانے میں یہ قصیدے کہے گئے تھے۔

1857ء کے بعد جب ہماری زندگی کے بھی شعبے متاثر ہوئے تو اردو ادب اور اس کی جملہ اصناف نظم و نثر نے بھی مثبت اثرات قبول کیے۔ اردو شاعری کی صنف قصیدہ پر بھی اس کا کافی ردعمل ہوا۔ 1857ء تک ہندوستان میں بالعموم دینداری اور مذہبی عقائد کا زور تھا۔ بادشاہت کے سلسلے میں بھی (برائے نام ہی سہی) قائم تھے اور نوابین و حکام کی بھی کثرت تھی۔ لہٰذا ایسے ماحول میں قصیدہ گوئی کا فروغ پانا فطری امر تھا۔ اس کی ترقی کا ایک بدیہی سبب یہ بھی تھا کہ لوگوں کے پاس کافی تھا وہ مشرقی علوم سے (جن کا قصیدہ گوئی میں بڑا نام ہے) اچھی طرح واقف تھے۔ اور اظہار علم وفضل کے لیے قصیدے سے بڑھ کر اور کوئی میدان نہ تھا 1857ء کے بعد بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر:

''مغربی علوم کی ترویج و اشاعت نے تشکیک اور لامذہبیت کو بھی جنم دیا۔ جس کی وجہ سے مذہبی اعتقادات بھی متزلزل ہونے لگے۔ چنانچہ مذہبی عقائد کا شدو مد بھی ختم ہونے لگا۔'' (٦)

اس کے علاوہ ابھی تک قصیدے کی بنیاد عموی طور پر بے جا ''مبالغہ آرائی'' پر تھی سودا ذوق اور غالب کے یہاں اس کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں بدلتے ہوئے سیاسی و معاشی اور معاشرتی حالات کے تحت نیز مغربی علوم کے زیر اثر اب حقیقت نگاری کا چلن عام ہوا لہٰذا لوگ قصیدہ گوئی سے احتراز کرنے لگے۔ وقت کی کمی اور تفکرات کی زیادتی نے شاعروں سے ذہنی یکسوئی اور تخیل کی جولانیاں چھین لیں، اب فرصت کے وہ دن رات کہاں جن میں کوئی تصور جاناں کئے بیٹھا رہے۔ بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ نوابین خود انگریزوں کے دست نگر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لے دے کے گورنر جنرل، وائسرائے اور ریزیڈنٹ ہی رہ گئے جن کی جھوٹی تعریف کر کے ہندوستان شعراء اپنا کام نکالنے لگے۔ اور جب درباریوں اور درباری ماحول کا خاتمہ ہوا تو آہستہ آہستہ قصیدے کو بھی ایک متروک اور مردہ صنف سخن قرار دے دیا گیا۔

قصیدہ ہیت کے لحاظ سے اردو فارسی اور عربی شاعری کی ایک صنف سخن ہے۔ لیکن فارسی شاعری میں قصیدے کی ہیت کو امراء و سلاطین کی مدح و ستائش کے لیے اس کثرت سے استعمال کیا گیا کہ قصیدہ مدح کا مترادف سمجھا جانے لگا۔ قصیدے کی ہیت میں حسب ذیل امور لائق توجہ ہیں:

١۔ قصیدے کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

٢۔ قصیدے کے باقی اشعار میں مصرع ہائے ثانیہ میں قافیہ ہوتا ہے یعنی مصرع ہائے ثانی غزل کی طرح مطلع کے مصرعوں سے ہم قافیہ ہوتے ہیں مصرع ہائے اولیٰ میں

قافیہ کا ہونا لازم نہیں۔

۳۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد کم از کم پندرہ ہونا چاہیے۔ یہ حد بعض حضرات نے سترہ بعض نے بیں، بعض نے اکیس اور بعض نے پچیس مقرر کی ہے۔

۴۔ قصیدے کے اشعار کی زیادہ سے زیادہ تعداد پوری قطعیت کے ساتھ معین تو نہیں تاہم بعض حضرات نے ایک سو سترہ تک محدود کیا ہے۔

۵۔ قصیدے کے لیے کسی خاص وزن کی شرط نہیں البتہ ناقدین نے ایسں اوزان کو جن میں شکوہ طنطنہ کا بہتر اظہار ہو سکے مدحیہ قصیدے کے لیے موزوں قرار دیا ہے۔

۶۔ فنی اعتبار سے مدحیہ قصیدے کا ڈھانچہ حسب ذیل چار ارکان یا اجزاء سے ترتیب پاتا ہے۔

(الف) تشبیب:۔ اسے نسیب بھی کہتے ہیں۔ تشبیب کے لیے عشق و جوانی کے مضامین کی قید نہ رہی لیکن قصیدے کی تمہید کا یہ اصطلاحی نام برقرار رہا۔ بعض ناقدین نے تشبیب اور نسیب میں یہ فرق قرار دیا ہے کہ نسیب محض اسماً عشق و محبت کے کوائف کا بیان ہے۔ اور تشبیب واقعی بیتے ہوئے کوائف اور نیاز و ناز کے ان واقعات کی تصویر کشی ہے جن سے شاعر شخصاً متاثر ہوا ہے۔

(ب) گریز:۔ تشبیب کے بعد گریز کا مرحلہ آتا ہے یعنی بے ساختہ انداز میں ممدوح کا ذکر چھیڑنے کا مرحلہ۔ اس میں ممدوح کی تعریف کی جاتی ہے۔

(ج) (مدح):۔ یہ قصیدے کا تیسرا مرحلہ ہے۔ اس میں ممدوح کی تعریف کی جاتی ہے۔

(د) دعا:۔ قصیدے کا چوتھا اور آخری حصہ دعا ہے جس میں شاعر ممدوح کی

درازی عمر کامیابی و کامرانی، صحت و سلامتی اور عز و جاہ کی ترقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔

بعض مدحیہ قصائد میں شاعر مدح کے بعد اور دعا سے پہلے (یا دعا ہی کے ضمن میں) ممدوح سے کوئی چیز طلب کرتا ہے یا اس کی نگاہ التفات کا طالب ہوتا ہے۔ اسے حسن طلب کہتے ہیں تاہم حسن طلب قصیدے کا کوئی لازمی جزو نہیں۔

اردو قصیدے کا آغاز و ارتقاء

اردو قصیدے کا آغاز مذہب اور تصوف کی آغوش میں ہوا لہٰذا یہاں باہمی مطابقت اور مالی منفعت کی فضا تقریباً مفقود تھی یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں کوئی خاص حیثیت حاصل نہ کر سکا۔

دکن میں قلی قطب شاہ کے بعد جن قصیدہ نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں ان میں نصرتی غواصی اور شاہی قابل ذکر ہیں دکن کے آخری دور میں ولی دکن اور سراج اورنگ آبادی کے نام بے حد اہم ہیں بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

"ولی کے ہاں قصیدے کے تمام تر خوبیاں ائی جاتی ہیں۔"

"شمالی ہند میں جس شاعر نے اردو قصیدے کو اعتبار بخشا وہ مرزا محمد رفیع سودا (1706ء، 1771ء) ہیں جن کے سامنے کسی دوسرے قصیدہ نگار کا چراغ نہ جل سکا مصحفی نے سودا کو قصیدہ نگارہ میں نقش اول قرار دیا ہے۔

سودا کے ہم عصر قصیدہ نگاروں میں میر تقی میر، میر حسن، قائم چاند پوری اور اشرف علی فغاں کے نام آتے ہیں۔ سودا اور ان کے معاصرین کا زمانہ 1708ء سے 1808ء تک کے طویل عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سو برس کی مدت میں اردو قصیدے کی مختلف شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

میر و سودا کے بعد انشا، مصحفی اور جرات کا زمانہ آتا ہے۔ ان تینوں شعراء کی زیادہ تر توجہ غزل کی طرف رہی تاہم انھوں نے قصائد بھی لکھے۔

بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دہلی میں ذوق، مومن اور غالب نے قصائد لکھے ان میں ذوق نے قصیدہ نگاری میں وہ کمال حاصل کیا۔ کہ "خاقانی ہند" عہدئے تمام محققین اور تنقید نگاروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سودا کے بعد اگر کوئی صحیح معنوں میں قصیدہ نگار پیدا ہوا ہے تو وہ ذوق ہی تھے۔ ذوق (1895ء...... 1854ء) نے قصیدے کو درباری مداحی تک محدود رکھا۔ ذوق نے اپنے قصائد میں سودا سے کہیں صاف اور رواں دواں زبان استعمال کی ہے لیکن فکر و جذبے، ذاتی مشاہدے اور جوش و خروش کی جیسی فراوانی سودا کے ہاں موجود ہے ذوق کے قصائد اس سے محروم ہیں۔

مومن کے قصائد پر بہت کم توجہ دی گئی ہے ظہیر احمد صدیقی نے مومن کے قصائد کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"ان کے قصائد سے قطع نظر کرنا سخت ناانصافی ہے کہ اگر کہا جائے کہ سودا اور ذوق کے بعد مومن کے قصائد کے بلحاظ فن سب سے بڑھ کر ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔"

غالب کی جدت پسند طبیعت نے روایتی قسم کی قصیدہ نگاری کو پسند نہیں کیا ان کا انداز بیان ہی اور ہے۔ کلیم الدین احمد غالب کی قصیدہ نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں:

"غالب نے بالکل نیا راستہ نکالا ہے جو قصیدہ کے رسمی محاسن میں ان کے یہاں نام و نشان نہیں۔ وہ طمطراق نہیں، وہ بلند آہنگی نہیں جسے قصید کا لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔ غالب نامانوس، ثقیل، بھدی زبان میں شعر نہیں لکھتے وہ تو باتیں کرتے ہیں زبان صاف ستھری ہے لہجہ وہی ہے جو عام بات چیت میں استعمال ہوتا ہے۔"

الغرض انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو قصائد نے حیرت انگیز ترقی کی اور اس میں گوناگوں اور مصنوع و موضوعات پیش ہوئے، مثلاً

منیر شکوہ آبادی نے اس میں "شہر آشوب" کا جزو شامل کیا اور نظم طباطبائی نے عہد قدیم کی اسلامی لڑائیوں کو قصیدے کا موضوع بنایا اس طرح قصائد کا دامن ہر طرح سے وسیع ہوتا گیا درباری قصائد اپنی ڈگر پر چلتے رہے جبکہ دیگر موضوعات پر لکھے گئے قصائد فکر اور ہیت دونوں اعتبار سے حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

حبیب جونپوری کا عہد اور اردو قصائد

گزشتہ صفحات میں قصیدہ نگاری پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اردو قصیدے نے ہیت اور موضوع کے اعتبار سے کئی رنگ بدلے۔ بیسویں صدی میں جدید اردو شاعری کی بنیاد حقیقت نگاری اور افادیت پر رکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس تحریک کے علمبرداروں نے قصیدے کو بھی حقیقت نگاری اور افادیت سے ہمکنار کرنے کی طرف توجہ دی۔ حبیب جونپوری کے عہد میں ان کے جن ہم عصر قصیدہ نگاروں نے نئی تبدیلیوں کو قبول کیا ان میں صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، خبیر لکھنوی، محشر لکھنوی اور آرزو لکھنوی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں یہ وہ شعراء ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاروں میں جدید طرز کو متعارف کرایا اور اپنے عہد کے مسائل و معاملات کو قصیدے کا موضوع بنایا۔ آرزو لکھنوی تو حبیب جونپوری کے استاد بھی تھے۔

صفی، سید علی نقی لکھنوی: بیسویں صدی کے مشہور اساتذہ میں سے تھے اپنی نظموں اور غزلوں کے لیے تو مشہور تھے ہی اپنے دور کی قصیدہ گوئی میں بھی مقام بلند حاصل تھا اس دور میں صفی عزیز اور محشر قصیدہ گوئی کے عناصر ثلاثہ شمار کیے جاتے تھے۔ صفی نے بہت سے قصائد کہے ان میں سے کچھ مسدس اور مخمس کی شکل میں بھی ہیں۔ صفی نے قصیدہ نگاری کے میدان میں طرز ادا کے اعتبار سے کئی جدتیں پیدا کی ہیں نظم کا بیانیہ انداز، تسلسل، مضامین کا تنوع اور بیان کا وقار ان کے قصائد کے امتیازی نشانات ہیں۔

مدح میں مبالغہ بے جا کے عام رجحان کے برعکس صفی نے اپنے قصائد میں سیرت نگاری کی اور لفاظی سے زیادہ حقائق و معارف پر زور دیا۔

عزیز، مرزا محمد ہادی لکھنوی: ان کے قصائد کا پہلا مجموعہ "قصائد عزیز" کے نام سے 1914ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مزید اضافے کے ساتھ "صحیفہ ولد" نامی مجموعہ ایک سے زیادہ مرتبہ شائع ہو چکا ہے کچھ قصائد اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں اور غیر مطبوعہ مستزاد ہیں۔ "صحیفہ ولد" میں بھی پچاس سے زیادہ قصیدے ہیں۔ ادبی وزن و مرتبہ کے اعتبار سے عزیز لکھنوی کا شمار اردو کے سودا ذوق جیسے عظیم قصیدہ نگاروں میں ہونا چاہیے۔ اگر اردو کے تین چار قصیدہ گو بھی چنے جائیں تو عزیز کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا۔

ایک خصوصیت جو عزیز کو دوسرے بزرگ قصیدہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ انھوں نے قصیدہ نگاری کو صرف مدح رسول و اہل بیت تک محدود رکھا۔ بقول ابو اللیث صدیقی:

"ان کے قصیدے درباری رنگ سے محفوظ اور خلوص عقیدت پر مبنی ہیں"۔

یہاں "درباری رنگ" کا تعلق صرف مدح گستری سے ہے ورنہ تشبیب کے معاملے میں درباری اور غیر درباری کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ عزیز کے عقیدے بنیادی طور پر روایت سے وابستہ ہونے باوجود 'جدت' اور اختراع کا ایک بے نظیر نمونہ ہیں۔ روایت و جدت کے اسی امتزاج کے باعث عزیز کی قصیدہ گوئی کا خاص مقام ہے۔

قصیدے کی اصلی پرکھ تشبیب سے ہوتی ہے عزیز کی تشبیبوں میں بہاریہ، حکیمانہ اخلاقی اور عاشقانہ سبھی طرح کے مضامین درج ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر زور آہنگ تغزل پر دیا گیا ہے جو قدیم عربی قصائد کی یاد دلاتا ہے، عزیز عربی منتہی متھی تھے اور بے حد کثیر مطالعہ اس لیے اگر یہ آہنگ تغزل عربی کے زیر اثر اختیار کیا ہو جائے عجب نہیں ہے اور

عزیز نے تغزل کو قصیدے کے آہنگ میں اس طرح سمودیا ہے کہ یہی ان کا امتیازی کارنامہ بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں مکالمہ، موازنہ، نفسیاتی محاکات، سراپا، بیان منازلِ عشق، ذکر حسیناں سبھی سے کام لیا ہے، اور اظہار خیال کے کتنے ہی گوشے نکالے ہیں نعت میں معراج ان کا مخصوص موضوع تھا، اور کئی قصائد میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس دور کے رواج کے مطابق ساقی ناموں پر بھی خاصا زور طبع صرف کیا ہے۔ اخلاقی وعلمی مضامین بھی نظم کیے ہیں۔ علمیت کا وقار اور فنکارانہ سنجیدگی ان کے قصائد کا امتیازی نشان ہے۔

خبیر، سید فراز حسین لکھنوی

اپنے دور کے مشہور مرثیہ گو اور دبستان رہبر کے نمائندے تھے۔ اگرچہ مرثیوں کے علاوہ دوسرے اصناف سخن مثلاً غزل، سلام، رباعی اور قصائد وغیرہ کا بھی کافی ذخیرہ چھوڑا ہے نمونہ کلام یہ ہے:

پلا ساقی وہ ساغر بادہ سر جوش عشرت کا
کہ دل ٹھہرے ذرا مجھے تو گرفتار محبت کا

محبت کو نظام خلق کا رکن رکیں سمجھو
محبت عافیت خانہ ہے اہل فقر و دولت کا

سوائے آرزوئے دوست ہر شے سے ہے مستغنی
محبت کرنے والے کو مزا ہے بادشاہت کا

محبت کیوں نہ پھر اپنی گراں قدری پہ نازاں ہو
اسے ہم وزن سمجھے ہیں نبی اجر رسالت کا

محشر (مولوی) معصوم لکھنوی

لکھنؤ سے "تحفہ مشاق" کے نام سے ماہانہ رسالہ نکالتے تھے۔ مرزا محمد تقی بیگ عرف مچھو بیگ عاشق لکھنوی کے شاگرد تھے سال نو کی آمد کے موقع پر 38 شعروں کا ایک قصیدہ لکھا جو "تحفہ عشاق" میں چھپا۔ نمونہ کلام

اٹھا جھومتا ابر مستانہ وار
مبارک ہو ساقی پھر آئی بہار

عجب فیض باد بہاری کا ہے
زمیں سبز رنگ آسماں سبزہ زار

شگوفوں کی ہے اک طرح سے نمو
حسینوں کے جو من پہ جیسے بہار

خدا کے کرم سے یہ وہ فصل ہے
ہوئے زاہد خشک بھی بادہ خوار

وہ سب زہد و تقویٰ دھری رہ گیا
ہوئے آکے صحبت میں یاروں کے یار

اٹھا جام مے، دے برانڈی انڈیل
پلا پھول ساقی میں تیرے نثار

نئے ساز و سامان نئے رنگ ڈھنگ

نئے سارے جو بن نئے سب نکھار

آرزو سید انور حسین لکھنوی

آرزو نے اپنی شاعری کی ابتداء محمد و آل محمد کے ذکر خیر سے کی تھی۔ جس کی سعادت انھیں مرثیے عہد کر حاصل ہوئی تھی قصیدہ نگاری نے انھیں دوبارہ، پہلے سکھیں زیادہ فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ اہل بیت سے والہانہ عقیدت کے اظہار کا موقع فراہم کیا ڈاکٹر سید مجاہد حسین حسینی لکھتے ہیں:

"راقم اسطور نے آرزو کو بمبئی میں کئی بار مختلف مقامات پر قصیدہ خوانی میں مصروف دیکھا ہے۔ وہ بغیر ترنم کے تحت اللفظ پڑھتے تھے لیکن مضامین کی ندرت، زبان کی لطافت اور خوانندگی سامعین کو مسحور کر دیتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کم و بیش قصیدہ خوانی کی پندرہ محفلوں میں، میں نے انھیں سنا تھا"۔

قصیدہ گوئی کے ساتھ بیجا مبالغہ آرائی اور حصول مدعا کا کچھ ایسا رشتہ قائم کر دیا گیا ہے کہ آرزو کے کہے ہوئے قصیدوں کو قصیدے کے بجائے "منقبت" کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ اگرچہ ان کے یہاں قصیدے کے تمام ادبی وفنی لوازم کا التزام و احترام موجود ہے۔ آرزو کے بیشتر قصائد حضرت علی علیہ السلام کی منقبت میں ہے۔ انھیں حضرت علی علیہ السلام سے عشق تھا اس لیے حتی المقدور وہ شاید ہی کبھی 13 رجب (تاریخ ولادت حضرت علی علیہ السلام) کی محفل مقاصدہ سے غیر غیر حاضر رہے ہوں۔

ان کا ایک قصیدہ مرزا غالب کی مشہور زمین۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشق نہیں

ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

میں ہے سب سے پہلا تاثر جو اس قصیدے کو پڑھ کر قائم ہوتا ہے یہ ہے کہ ان کی نظر قافیہ پیمائی کے بجائے مضمون آفرینی پر رہتی ہے فلسفیانہ تفکر، مشاہدہ کائنات، اور تاریخی واقعات کا پس منظر ان کی تشبیب کا جوہر ہے۔ ملاحظہ ہو:

وہ بھی اک شکل کہ اس آئنہ خانے میں نہیں
خود نما کون ہے پھر، حسن اگر ہے خود بیں

دیکھ کر وحدت کثرت کا سمویا ہوا رنگ
یہ تھکتی ہوئی نظریں کہیں جمتی ہی نہیں

ہے کہیں جلوہ گر رنگ میں گم، وحدت ذات
کہیں ہر رنگ میں یکتائی حسن و تزئین

چلتی پھرتی ہوئی پرچھائیاں سی چار طرف
پر کہیں پیش نظر پھر نہ مکاں ہے نہ مکیں

قرب قوسین کا خلوت کدہ بھی پر اسرار
کہ بجز عاشق و معشوق جہاں کوئی نہیں

حبیب جونپوری کے چند معاصر قصیدہ نگاروں کے ہاں کوئی ایک رجحان نہیں تھا تاہم ایک بات طے ہے کہ یہ دور زیادہ تر مذہبی قصائد کا دور ہے اور تقریباً قصیدہ نگاروں کے ہاں مذہبی اثرات نمایاں ہیں اس دور میں شعراء کے لیے کوئی دوسرا ملجا و ماویٰ نہیں رہ

گیا تھا اور نہ وہ ہمہ وقتی طور پر کیسی دربار سے منسلک تھے آنحضورﷺ کے یوم ولادت خلفائے راشدین کے یوم پیدائش خصوصاً حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے آئمہ کرام کے ایام ولادت کے موقع پر ہونے والی محافل کے لیے قصیدے کہے جاتے تھے۔ چونکہ ان قصائد کے ممدوح شخصی اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے ارفع و اعلیٰ ہیں، اس لیے ان کی مدح میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اظہار عقیدت کے سلسلے میں حضرت علی، حضرت امام حسین علیہ السلام اور دیگر آئمہ کرام کی شان میں بعض مبالغہ آرائیاں کھٹکتی ہیں لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں اس سلسلے میں علی جواد زیدی رقمطراز ہیں:

''مذہبی قصائد مبالغہ و غلو سے خالی نہیں ہیں۔ ان میں روایت پسندی کا رجحان بھی عام ہے۔ اکثر قصائد میں خوش عقیدگی کی والہیت بھی نہیں ہے لیکن جہاں والہیت ہے وہاں شروع حدود سے تجاوز کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں کبھی نبوت کو الوہیت کے اوصاف کا حامل سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہی حال منقبت کا ہے کہ امامت و خلافت کے ڈانڈے نبوت سے ملا دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ ایسی بھی مدح دیکھنے میں آئی ہے جس میں شان سے بڑھا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں ایسے قصیدہ گو ہیں (اکثریت انہیں کی ہے) جنھوں نے قرآن و حدیث کی پیروی کی ہے وہاں ایسے بھی ہیں جنھوں نے صحیح واقعات سے انحراف کیا ہے یا ان پر شاعری اور خوش عقیدگی کا رنگ و روغن چڑھا دیا ہے''۔

حبیب جونپوری کی قصیدہ نگاری

لکھنؤ میں غزل کے علاوہ قصیدوں اور مرثیوں کا بھی بڑا شہرہ تھا۔ حبیب جونپوری نے چھ سال کی قلیل مدت میں اپنے استاد آرزو لکھنوی کے زیر تربیت اپنے مخصوص ترنم کی وجہ سے غزل میں اچھا خاصا نام پیدا کرلیا تھا لیکن 1936ء تک ان کا کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔

1935ء میں حبیب جونپوری کے والد کا تبادلہ جون پور سے مچھلی شہر ہو گیا۔

1936ء میں اختر حسین سروش مچھلی شہری وحید الحسن ہاشمی کو انگریزی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ جناب سروش اور ان کے برادر خرد تیر اور حسین جوش غزل اور قصیدے میں ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے تیسری شعبان 1936ء میں ولادت امام حسین کے سلسلے میں ایک عالیشان محفل کا انعقاد کیا۔ اور دور دراز سے دعوت دی۔ یہ محفل محلہ سید واڑہ کے امام باڑے میں ہوئی ابتدا میں وحید الحسن ہاشمی نے اپنے والد صفا الہ آبادی سے پانچ اشعار لے کر پڑھے تھے گیارہ بجے رات کو حبیب جونپوری نے ایک قطعہ اور اکیس استعارہ کا اقصیدہ پڑھا اس کے بعد محفل کا ہر آدمی لہک لہک کر داد دے رہا تھا۔ قطعہ جو کہ بار بار پڑھا گیا وہ یہ تھا۔

لہو سے سارے زمانے کو لالہ زار کریں
حسین آئیں تو اسلام استوار کریں
تھپیڑے کھائے گی کشتی تو کون روکے گا
نبی سے کہہ دو نواسے کا انتظار کریں

وحید الحسن ہاشمی اس قصیدے کے مطلع کے بارے میں کہتے ہیں

''قصیدے کا مطلع کا دورا مصرع ذہن میں رہ گیا اب نہ پائے گا زمانہ کوئی رہبر ایسا''۔ (۱۴)

''حبیب جونپوری نے کل چودہ قصیدے کہے تھے لیکن ہمیں کلیات حبیب سے ان کے آٹھ قصائد ملے ہیں۔

جن میں 1936ء کا مذکور قصیدہ نہیں ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ استاد کی اصلاح کے بغیر تھا۔ اس لیے حبیب جونپوری نے اسے کسی جگہ پھر نہ پڑھا۔ نہ بیاض میں محفوظ کیا''۔ (۱۵)

حبیب جونپوری کے قیام لکھنو کے زمانے میں جلالؔ، نظم طباطبائی، محشرؔ، صفیؔ، عزیزؔ اور آرزو کی قصیدہ گوئی کا عام چرچا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ عزیزؔ محشر اور صفی سے حبیب جونپوری ملاقاتیں بھی کر چکے تھے۔ اور اکثر اپنی گفتگو میں عزیزؔ کی قادر الکلامی کا تذکرہ بھی کرتے تھے۔ اور انہی کے کلام سے مرعوب تھے۔

حبیب جونپوری کے تمام قصائد اہل بیت کی شان میں ہیں صرف ایک قصیدہ واقعہ غدیر کے حوالے سے ہے قصائد کی مجموعی تعداد (جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے) آٹھ ہے چار قصائد حضرت علی کی شان اقدس کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت امام حسن کی مدح میں ہے۔ ایک قصیدہ امام حسین کی فضیلت یں ہے۔ ایک قصیدہ صاحب العصر حضرت امام مہدی کی مدح میں ہے۔ ذیل میں ان قصائد کے موضوعات اور مصرعہ ہائے اولی پیش خدمت ہیں۔

۱۔ قصیدہ در مدح حیدر کرار

(بشر سے کیا ثنا ممکن ہو داماد پیغمبر کی)

۲۔ قصیدہ در مدح حضرت علی

(تا بہ خلوت گہہ وحدت کھینچے جانے والے)

۳۔ قصیدہ در مدح علی عقدہ کشا

(ہٹی ظلمت عروس صبح نکلی بے حجابانہ)

۴۔ قصیدہ در مدح ساقی کوثر حضرت علی

(صدقے ترے سرمستِ اندازِ خود آرائی)

۵۔ جشنِ غدیر

(پیام موت اس جانب ادھر وعدہ ہے وصلت کا)

۶۔ قصیدہ در مدح امام حسن

(فضا اچھی نہیں معلوم ہوتی آج صحرا کی)

۷۔ قصیدہ در مدح امام حسین

(ابھی آغاز الفت ہے ابھی کچھ عہد و پیماں ہے)

۸۔ قصیدہ در مدح امام زمانہ

(یہ اچھا کھیل ہے آفت زدوں کا دل دکھا دینا)

حبیب جونپوری کے یہ آٹھوں قصیدے آئمہ طاہرین کی مدح میں ہیں اس لیے اہم ترین بات یہ سامنے آتی ہے کہ انھوں نے دنیوی صلوں کی ملک میں بھی کسی حکمران، نواب یا منصب دار کی مدح نہیں کی بلکہ آل رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدح کے علاوہ ان کا قلم کسی کی تعریف و توصیف کے لیے چلتا ہی نہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے قصائد میں مدح برائے حصول دنیا کا قصد نہیں بلکہ مقصود داخلی عقیدت و معرفت کا اظہار اور فراہمی زاد آخرت ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک شعر سے محبت و مروت کے دریا ابلتے نظر آتے ہیں نہ خیالات میں رکاکت ہے نہ تخیل میں ابتذال ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاک ہستیوں کا تذکرہ پاک فضا میں کیا جا رہا ہے۔ یہ قصائد طویل نہیں نہ ان میں ممدوح کی سیرت و صورت کی تفصیل ہے اشارے اور کنائے میں وہ تمام باتیں کہی گئی ہیں جو سامعین کے قلوب کو معطر اور ان کے ذہنوں کو کشادہ کردیں۔

حبیب جونپوری کے زیادہ تر قصائد خلیفۃ المسلمین، امام المتقین، حضرت علیؑ کی منقبت میں ہیں حبیب جونپوری کو حضرت علی سے عشق تھا۔ مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کے علاوہ آپ کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا داماد، حسنین کے والد نیز خیبر و خندق اور بدر وحنین کا فاتح ہونے کا فخر بھی حاصل تھا۔ عقیدہ اثنا عشری کے مطابق آپ گیارہ اماموں

کے باپ بھی تھے۔ آپ کی عصمت، نجابت، عبادت، علم پرہیزگاری، سیاست، سخاوت حلم اور شجاعت کا حبیب جونپوری کے دل پر خاص اثر تھا۔ ہر مشکل میں وہ مشکل کشاء علی سے مدد مانگتے ہیں جیسا کہ قصیدہ در مدح علی "عقیدہ کشا" کے ایک شعر میں کہتے ہیں

حبیب زار مشکل سی بھی مشکل نہ گھبراؤ
علی عقیدہ کشا ہیں سہل ہے عقدے کا کھل جانا

کلیات حبیب میں (۱۳۹)

اور دوسرے قصیدے "در مدح حضرت علی" میں حبیب جونپوری کہتے ہیں:

آخرش زینت اصلاب رہے گا کب تک
چھپ کے بگڑے ہوئے کاموں کو بنانے والے

(اکلیات حبیب۔ ص ۱۴۱)

حبیب جونپوری کے قصیدوں کی تشبیب میں غزل کا عنصر کارفرما ہے یہی سبب ہے کہ زبان میں مٹھاس اور لہجے میں دھیما پن آگیا ہے۔ عزیز لکھنوی کو سودا اور ذوق انداز پسند تھا۔ لیکن حبیب جونپوری کا رجحان میرؔ اور غالبؔ کے قصائد سے متاثر ہے ان کے قصیدے "قصیدہ در مدح امام حسین" کی تشبیب ملاحظہ ہو۔

ابھی آغاز الفت ہے ابھی کچھ عہد و پیماں ہے
جو نبھ جائے تو جانو منہ سے کہہ دینا تو آساں ہے

کٹا کر کربلائے عشق میں سرمایہ ہستی
چلا ہوں سر کٹانے یوں کہ خود قاتل بھی گریاں ہے

جوانی لا کے پیغام اجل خود مجھ پر روتی ہے
اجل اب دیکھ کر صورت میری خود ہی پریشان ہے

عروس مرگ کا شائق بنا تو شاہ دل اپنا
برائے رونمائی پاس نقد جان بیجاں ہے

یہ بکھرے بال آنکھیں سرخ چہرہ خاک آلودہ
ابھی زندہ ہوں میں پھر کس کے ماتم کا یہ ساماں ہے

نہ جانے کیسی بے چینی ہے میری روح بے کل ہے
کہ قاتل چپ کھڑا ہے خنجر قاتل پشیماں ہے

ارے او آنے والے تربت دل ہر قدم پر ہے
سنبھل کر پاؤں رکھنا دیکھنا گور غریباں سے

سفینہ حسرتوں کا ڈوبتا ہے آج خشکی میں
جہاں پانی کی موجیں ہیں نہ دریا ہے نہ طوفاں ہے

(کلیات حبیب۔ ص ۱۴۸۔ ۱۴۹)

حبیب جونپوری کے ایک قصیدے ''قصیدہ در مدح علی مقدہ کشا'' کی تشبیب

"صبح کے منظر" سے شروع ہوتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہٹی ظلمت عروسِ صبح نکلی بے حجابانہ
برائے راہداری مل گیا سورج کو پروانہ

ہٹا کر شب کا گھونگھٹ روئے بانو سحر دیکھا
جوانانِ چمن نے دے کے پر اخلاص نذرانہ

چلے بستر سے اٹھ کر اہل دیں شوق عبادت میں
مسلمان جانب مسجد برہمن سوئے بت خانہ

(کلیات حبیب۔ ص ۱۳۷)

حبیب جونپوری کے دو قصیدوں ("قصیدہ در مدح ساقی کوثر حضرت علیؓ" اور قصیدہ در مدح حیدر کرار) کی تشبیب براہ راست مدح سے شروع ہوتی ہے اشعار ملاحظہ ہوں:

صدقے ترے سرمستِ انداز خود آرائی
ہاں ہاں اسی صورت سے پھر اور اک انگڑائی

بھینچے ہے نہیں تیرے جن جن کی قضا آئی
ہاں کہہ گئے دکھا ان کو اعجاز مسیحائی

اک وہ ہیں کہ کل، عالم جن کا ہے تماشائی
اک ہم ہیں کہ مونس جس کی شب تنہائی

خود کھل گیا وہ دیکھو قفلِ درِ زنداں بھی
وحشت میں اسیروں نے زنجیر جو کھڑکائی

(کلیات حبیب۔ ص۱۳۲)

بشر سے کیا ثنا ممکن ہو داماد پیمبر کی
جمال ایزدی کا آئینہ ہے ذات حیدر کی

علی کا نور حق ہے عالم پر یہ روشن ہے
موید مرے دعوے کی حدیثیں ہیں پیمبر کی

یہ شمع حسن خالق مختلف فانوس میں آئی
بنے کون و مکاں قندیل اک مصباح انور کی

کبھی پیشانی آدم میں چمکا یہ بصد عزت
یہی وہ امر رب تھا جو نیا تھا روح پیکر کی

سفینہ بن کے طوفاں سے نکالا نوح کو اس نے
وگرنہ کیا بچا لیتیں انہیں موجیں سمندر کی

نکالا چاہ سے یوسف کو بھی جبل متین بن کر
بچائی جاں علی کے عشق نے اس حسن پیکر کی

کبھی نمرود کا آتش کدہ گل کر دیا اس نے
کبھی مفلوج کر دی خودسری فرعون کے سر کی

کبھی داؤد کی رگ رگ میں نغمہ بن کے یہ دوڑا
بنایا ہے موم لوہے کو خبر لو باب خیبر کی

(کلیات حبیب۔ ص ۱۳۵)

قصیدوں میں گریز کی منزل انتہائی مشکل ہے۔ اس مقام پر عام شعراء کے قدم ڈگمگا گئے ہیں لیکن حبیب جونپوری نے اس میدان کو اس خوبی سے سر کیا ہے کہ ان کی عظمت شاعری کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ اور ان کے اس جوہر کی داد دینا پڑتی ہے اس لیے "قصیدہ در مدح امام حسینؑ" میں تشبیب کے آخری شعری کے بعد گریز ملاحظہ فرمایئے۔

کہاں تک اے حبیب زار ذکر غم خبر بھی ہے
پھر آئی تیری شعباں کہ ہر وادی گلستاں ہے

(کلیات حبیب۔ ص ۱۳۹)

امام حسنؑ کے ایک قصیدے میں بہار یہ تشبیب ہے اشعار ملاحظہ ہوں:

اچھی نہیں معلوم ہوتی آج صحرا کی
بہار جانفزا نے آئے وحشت اور پیدا کی

ابھرنا کیا مرا میں تو غریق بحر حسرت ہوں
نہیں آسان آزادی گرفتار تمنا کی

احبا ہو گئے رخصت لحد میں چھوڑ کر تنہا
سر تربیت مری حسرت مجھے تا حشر رویا کی

وہ جن کی محفلیں معمور تھیں اسباب راحت سے
کفن کے واسطے اغیار نے چادر مہیا کی

جنہیں افشاں کے ذرے بار تھے حدِ نزاکت پر
انہیں کے جسم پر دیکھو پڑی ہے خاک صحرائی

وہ عالم ہو کا ہر جانب وہ سناٹا سا تربت میں
جہاں ہیبت سے خود شمع لحد بھی جھلملا پائی

نہ اتنا تھا کوئی تربت پہ دو آنسو بہا دیتا
فقط اک رونے والی شمع مدفن تھی جو رویا کی

وہ نقشہ ہوں مٹوں گا میں نہ دنیا کے مٹانے سے
وہ قطرہ ہوں فنا ہو کر بنوں گا موج دریا کی

جگہ جس دل میں پائی اس نے دشمن ہو گیا اس کا
زمانہ اس کا شیدا ہے مگر ہر شخص ہے شاکی

نکالا خلد سے آدم کو اور دنیا میں پھر بھیجا
بنائی بھی بگاڑی بھی جہاں تصویر حوا کی

اسی نے حکم دے کر انبیاء سے کعبہ بنوایا
اسی نے پھر ضیائے نفسِ پیغمبر ہویدا کی

مجھے لکھنا جو تھی مدحت حسن کے روئے زیبا کی
سیاہی اپنی اپنی آنکھ کی حوروں سے یکجا کی

دوات خلد لائے جب ملک تحریرِ مدحت کو
قلم بن کر چلی افلاک سے اک شاخ طوبیٰ کی

بہار آئی نہ کھولا بابِ زنداں ہائے ظالم نے
قفس میں غم رسیدہ بلبل ناشاد تڑپا کی

غشی طاری ہوئی جب سے نہ مجھ کو ہوش پھر آیا
گلاب جنت الفردوس لا کے حور چھڑکا کی

یونہی کیا کم تھی صحن باغ میں نزہت کہ اس پر بھی
نگاہ نرگس شہلا بڑی حیرت سے دیکھا کی

خزاں کی فوج کو دے کر شکستِ فاش گلشن پر
ہوا وہ حکمراں جن کی قبا ہے سبز دیبا کی

نگار باغ نے پہنا ہے شاہانہ لباس نو
مبارک ہو جوانی پھر پلٹ آئی زلیخا کی

(کلیات حبیب۔ ص۱۳۵۔ ۱۳۶)

اس قصیدے میں آخری شعر کے بعد یوں گریز کیا ہے۔

چلو سیر چمن کو تم حبیب زار سنتے ہیں
گلوں نے بزم میلاد حسن گلشن میں برپا کی

حضرت علی کے ایک قصیدے (قصیدہ در مدح علی مقدہ کشا) میں بارہ اشعار پر مشتمل ایک غزل ہے اس کا آخری شعر اور گریز کا شعر یوں ہے:

نہ کھلنے سے جو قفل در نہ مل سکتا ہو پیمانہ
چلو ٹکرا کے سر ہی شق کریں دیوار میخانہ

ہو مشکل تو بلالیں فاطمہ کو کھول دیں آکر
ہمارے میکدے کو جیسے حیدرہ کا زچہ خانہ

(کلیات حبیب۔ ص۱۳۸)

قصیدے کے اصل مقصد ممدوح کی مدح سرائی ہے۔ قدیم شعراء مدح کرتے ہوئے زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے۔ اور تعریف و توصیف اس انداز سے کرتے تے کہ سامعت ششدرو حیران ہوجاتی تھی۔ چونکہ مبالغہ ایک دل پسند صفت تھی۔ اس

لیے ہر شاعر مدح میں ایسی مبالغہ آرائی کرتا تھا۔ کہ دل و زبان سے واہ نکلنے کی بجائے ہنسی آجاتی تھی۔ حبیب جونپوری کے کلام میں مبالغے کا عنصر ناپید ہے۔ ان کے مدحیہ اشعار صاف شفاف رواں دواں اور اصلیت سے نزدیک تر ہیں مدح میں جہاں کہیں مبالغہ یا انہونی بات نظر آتی ہے وہ حضور رسالت مآب یا آئمہ طاہرین کے اقوال ہیں شاعر نے اپنی طرف سے ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کیا۔

حضرت علی کی مدح میں کہے گئے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جب شوق عبادت میں واں بنت اسد آئیں
ہنستی ہوئی کعبے کی دیوار نظر آئی

کعبے ہی میں بچے کے تیور کے اشارے ہیں
کچھ بڑھ کے کرے گا یہ کونین پہ دارائی

ہاتھوں کو جھٹکتا ہے رہ رہ کے ہمکتا ہے
اصنام کو تکتا ہے لے لے کہ یہ انگڑائی

آغوش میں احمد نے جس دم لیا بھائی کو
ملتی ہوئی صورت سے تصویر نظر آئی

مسجد سے نظر جس کی افلاک کے پردوں تک
جبریل کو دیکھ آئیں اللہ رے بینائی

اے احمد لاثانی کیا چاہیے اب تم کو
زہرا سی ملی بیٹی حیدر سا ملا بھائی

قدیم قصیدہ نگاروں نے اپنے قصیدوں میں تلمیحات سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے کبھی رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی حدیث اور آئمہ کے اقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے شعروں میں نہایت چابکدستی اور فنکاری سے تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً حضور کی ایک مشہور حدیث ہے کہ ''میں اور علی دونوں ایک ہی نور سے ہیں'' اسی کے ذیل میں حضرت علی کا ایک قول ملتا ہے کہ ''میں نے تمام انبیاء کی پوشیدہ طور پر مدد کی ہے'' ان اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے حبیب جونپوری نے حضرت علی کی مدح میں اس قسم کے اشعار کہے ہیں:

علی کا نور نورِ حق ہے عالم پر یہ روشن ہے
موید میرے دعوے کی حدیثیں ہیں پیمبر کی

یہ شمع حسن خالص مختلف فانوس میں آئی
بنے کون مکاں قندیل اک مصباح انور کی

کبھی پیشانی آدم میں چمکا یہ بصد عزت
یہی وہ امر رب تھا جو بنا تھا روح پیکر کی

سفینہ بن کے طوفاں سے نکالا نوح کو اس نے
بچائی جاں علی کے عشق نے اس حسن پیکر کی

کبھی غرور کا آتش کدہ گل کردیا اس نے
کبھی مفلوج کردی خودسری فرعون کے سر کی

کبھی داؤ کی رگ رگ میں نغمہ بن کے یہ دوڑا
بنایا موم لوہے کو خبر لو بابِ خیبر کی

ہوئے خاموش سب نغمے چہ عبرانی چہ سریانی
صدا کعبے میں دی حیدر نے جب اللہ اکبر کی

(کلیات حبیب۔ ص ۱۳۵۔ ۱۳۶)

پروفیسر عبدالکریم خالد حبیب جونپوری کے قصائد کے متعلق رقمطراز ہیں:

"ان کے قصائد مزہبی معتقدات کو نمایاں کرتے ہیں۔ حضرت علی، حضرت امام حسن حضرت امام حسین اور حضرت امام زمانہ کی مدح میں لکھے گئے قصائد جوش محبت اور عقیدت سے پر ہیں اور ان عظیم ہستیوں سے شاعر کی والہانہ وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔" (۱۶)

حبیب جونپوریؒ کے قصائد کو پڑھ کر جو سب سے پہلا تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی نظر قافیہ پیمائی کے بجائے مضمون آفرینی پر رہتی ہے۔ فلسفیانہ تفکر، مشاہدہ کائنات اور تاریخی واقعات کا پس منظر ان کے قصائد کی تشبیب کا جوہر ہے حبیب جونپوری اپنے قصائد میں اپنے جان لیوا حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں

مجھے تو شرم لاحق ہے مگر دنیا یہ کہتی ہے
نبی کے لاڈلے تیرا حبیب اب تک پریشاں ہے

یا ایک اور قصیدے میں یوں کہتے ہیں:

عریضہ ہے کہ دفتر حسرتوں کا پیش ہے مولد
کریم النفس ہو سائل کو حاجت سے سوا دینا

انھیں آئمہ طاہرین سے کیونکہ بے پناہ عشق تھا۔ اس لیے ان کی زیارت کا بھی بے حد ارمان حبیب جونپوری کے دل میں تھا جیسا کہ ہر مومن کے دل میں ہوتا ہے ارمان اور خواہش ان کے قصائد میں جگہ جگہ نظر آتی ہے مثلاً ان کے مختلف قصائد کے مختلف اشعار دیکھیے

امام عصر ہو لازم ہے اب جلوہ دکھا دینا
جو غش آجائے مجھ کو اپنے دامن کو ہوا دینا

مری طینت کا ہر اک ذرہ مشتاق زیارت ہے
حجاب غیب کے ساکن رخ روشن دکھا دینا

دل مداح آیا ہے عریضہ لے کے تا ساحل
تمھیں سوچو تمھیں لازم ہے کیا اس کا صلہ دینا

بھٹکتا پھر رہا ہو سامرہ میں جب یہ دیوانہ
حبیب زار کو مولد در دولت دکھا دینا

(کلیات حبیب۔ ص۱۳۶)

بلا لو اپنے روضے پر حبیب زار کو مولا
یہی ہے آرزو اک عمر سے اس مدح گستر کی

(کلیات حبیب۔ ص ۱۳۶)

شکوہ الفاظ اور زور بیان کے نمونے حسب ذیل ہیں۔

صدقے ترے سر مست انداز خود آرائی
ہاں ہاں اسی صورت سے پھر اک انگڑائی

کہنے سے نہیں تیرے جن جن کی قضا آئی
ہاں عہد کے دکھا ان کو اعجاز مسیحائی

تاخیر نہیں زیبا وقت کرم ساقی
خم خانہ وحدت سے دے ساغر صہبائی

موسیٰ کا ید بیضا جاں بخش دم عیسیٰ
کعبے میں ہوا پیدا خود دیکھو لیں عیسائی

(کلیات حبیب۔ ص ۱۳۲۔۱۳۳)

یہ شمع حسن خالق مختلف فانوس میں آئی
بنے کون مکاں قندیل اک مصباح انور کی

سفینہ بن کے طوفاں سے نکالا نوح کو اس نے
وگرنہ کیا بچا لیتیں انہیں موجیں سمندر کی

(کلیات حبیب۔ص ۱۳۵)

ہٹی ظلمت عروسِ صبح نکلی بے حجابانہ
برائے راہداری مل گیا سورج کو پروانہ

ہٹا کر شب کا گھونگھٹ روئے بانوئے سحر دیکھا
جوانانِ چمن نے دے کے پر اخلاص نذرانہ

(کلیات حبیب۔ص ۱۳۷)

تا بہ خلوت گہ وحدت گئے جانے والے
پھر بھی پردے میں رہے حسن چھپانے والے

مطمئن کردیا یُعطیکَ فَترضیٰ کہہ کر
یونہی روٹھے کو مناتے ہیں منانے والے

(کلیات حبیب۔ص ۱۴۰)

کبھی تھا علم خلاق جہاں میں میکدہ جس کا
کبھی معنی کن بن کر ہوا محبوب قدرت کا

بجم میں، علم کے دریا میں، جنت میں رہا برسوں
بچے اولاد آدم بن گیا منشا شرافت کا

کیا آتشکدہ گلزار جس کے ایک چھینٹے نے
بنے لقماں بنا ہر قطرہ جس کا درس حکمت کا

(کلیات حبیب۔ ص ۱۴۳)

حبیب جونپوری کے قصائد میں ساقی نامے کے بھی نمونے مل جاتے ہیں۔

سلامت میکدہ موقع نہیں اظہار حاجت کا
خدا رکھے تجھے ساقی پلا دے جام الفت کا

وہ مے پینا پلانا قدرت حق جس کا منشا ہے
وہ مے کہتے ہیں جس کو باب علم وفضل وحکمت کا

جسے پیتے ہی خالق کی زباں سے کن ہوا جاری
جسے پیتے ہی پہنا نور نے ملبوس خلقت کا

وہ مے ہر قطرہ جس کا رحمتِ خلاق عالم ہے
وہ مے ہر جام جس کا قدرتی پیکر ہے عصمت کا

کبھی تھا علم خلاق جہاں میں میکدہ جس کا
کبھی معنی کن بن کر ہوا محبوب قدرت کا

کیا آتشکدہ گلزار جس کے ایک چھینٹے نے
پیٔے لقمان بنا ہر قطرہ جس کا درس حکمت کا

یدِ موسیٰ ید بیضا بنا رونق سے جس سے کی
ایماں کو سلیقہ جس نے سکھلایا حکومت کا

دوبالا حسن یوسف ہوگیا جس سے کے چھینٹے سے
بنی جو آنکھ میں یعقوب کے سرمہ بصارت کا

یونہی موقع بہ موقع پیتے پیتے وقت وہ آیا
غدیر خم میں رندوں نے کہا صدقہ سخاوت کا

مرے ساقی لٹا دے آج اپنا میکدہ سارا
کہ رندوں کو تصدق چاہیے تیری خلافت کا

(کلیات حبیب۔ ص۱۴۳۔۱۴۳)

اک مژدہ جاں پرورہ جب لے کے بہار آئی
لی ساقی کوثر کے رندوں نے بھی انگڑائی

تا خیر نہیں زیبا ہے وقت کرم ساقی
خم خانہ وحدت سے دے ساغر صہبائی

تقدیر کی خوبی سے یا لطف الٰہی سے
لو اور پیو رندوں کعبے میں بہار آئی

(کلیات حبیب۔ ص۱۳۶)

کبھی بزم تو لد میں ہوا اس درجہ ضو افگن
کہ صورت دیکھنی مشکل ہوئی رندوں کو ساغر کی

(کلیات حبیب۔ ص۱۳۶)

نہ کھلنے سے جو قفل در نہ مل سکتا ہو پیمانہ
چلو ٹکرا کے سر ہی شق کریں دیوار میخانہ
ہو مشکل تو بلالیں فاطمہ کو کھول دیں آ کر
ہمارے میکدے کو جیسے حیدر کا زچہ خانہ

(کلیات حبیب۔ ص۱۳۸)

بہار آئی چمن میں جام مے ہاں ساقیا دینا
جو مے پیتے رہے ہیں اہل ایماں وہ پلا دینا

وہ مے نشے نے جس کے جزر و مد پیدا کیا دل میں
وہ مے آتا ہے قطرے کو جسے دریا بنا دینا

فرشتوں کو جھکایا جس نے آدم کی طرف وہ مے
کرشمہ جس کا ہے انسان کو قبلہ بنا دینا

مناسب کب ہے ساقی ایک اک ساغر پلا دینا
تجھی کو چاہیے ہے خم کے خم منہ سے لگا دینا

ولادت آخری معصوم کی ہے آج عالم میں
اگر کچھ بچ رہے انھوں نے غیروں کو پلا دینا

یہ دور آخری ہے اب نہ کوئی اور آئے گا
تجھے لازم ہے ساقی آج میخانہ لٹا دینا

(کلیات حبیب۔ ص ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲)

ایک زمانے میں ساقی ناموں کا بڑا زور تھا مرثیوں میں بھی ساقی ناموں نے رواج پایا۔

اگرچہ مذہبی قصیدوں اور مرثیوں میں یہ شراب شراب معرفت و مودت ہوتی۔ لیکن اس میں لوازم تمام مجازی میکدوں کے ہوتے بہت سے قصیدہ نگاروں نے ساقی ناموں پر زور قلم صرف کیا ہے اور اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔

حبیب جونپوری نے بھی اس روایت کو بخوبی نبھایا ہے اور اس کی مثالیں اوپر ہم اشعار میں دیکھ چکے ہیں اور انھوں نے اس شعر

بہار آئی چمن میں جام مے ہاں ساقیا دینا
جو مے پیتے رہے ہیں اہل ایماں وہ پلا دینا

میں اپنا موقف بیان کیا ہے کہ شراب وہ ہونی چاہیے جو کہ اہل ایماں پیتے ہیں اور وہ شراب جو کہ فرشتوں کو بھی جھکا دے۔ ہر شعر سے اللہ اس کے محبوب رسول خدا ور

چہاردہ معصومین سے محبت جھلکتی ہے اور وہ اسی محبت کو شراب کا نام دیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حبیب جونپوری کے قصائد میں تلاش مضمون، ردیف، کا حسن، قافیوں کی خوبصورتی، شکوہ الفاظ علوئے خیال، صنائع و بدائع علمی و معنوی کا مناسب استعمال نیز قصیدہ گوئی میں کام آنے والے تمام آداب پائے جاتے ہیں اور وہ ایک کامیاب قصیدہ گو قرار پاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مکتوب نگاری

مکتوب نگاری 'مفہوم' روایت اور ارتقا

اس سے پہلے کہ حبیبؔ جونپوری کے خطوط کے متعلق بات کی جائے، ہم خط یا مکتوب کی تعریف و مفہوم، پس منظر اور اُردو میں مکتوب نگاری کی روایت اور ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں:

فرہنگِ آصفیہ میں مکتوب کا مفہوم یوں ہے:

''مکتوب (ع۔ اسمِ مذکر) (i) لکھا ہوا، لکھا گیا، مرقوم، خط، چٹھی، مراسلہ (ii) خطوط کا طومار، یا ایک لمبا کاغذ۔

بہت سے اکٹھے خط جو لڑکوں کو پڑھانے کے واسطے جوڑ دیتے ہیں۔ ترسل''۔

مکتوب کے معنی خط اور مراسلہ کے بھی ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ جلد چہارم میں مراسلہ کے معنی یہ درج ہیں:

''مراسلہ (ع۔ اسمِ مذکر) برابر والے کا خط، چٹھی، نامہ، شقہ، رقعہ، پیغام، مراسلت (ع۔ اسمِ مؤنث) باہمی نامہ و پیغام، خط و کتابت، تحریرِ قانون، اطلاع نامہ، دستک، طلبی سمن۔''

فرہنگِ آصفیہ جلد دوم میں خط کے معنی یہ درج ہیں:

''خط، کتاب (ع۔ اسمِ مؤنث) مراسلت، چٹھی، پتری، لکھت، پڑھت''

جدید نسیم اللغات میں خط کے معنی یہ درج ہیں:

''خط (ع) نشان، (پڑنا کے ساتھ) ع جان صاحب

نہ پشاور کے برابر پڑے تلوار کا خط

نامہ مکتوب (آنا۔ بھیجنا، لکھنا، لکھانا) نیا سبزہ جو رخساروں پر اُگے ع رشک

بڑھ گئی خط سے زینتِ رُخِ یار

لکیر جس میں طول ہو، عرض و عمق نہ ہونا، مجازاً ہر لکیر، ہاتھ کی لکھائی، مراد خط، انداز تحریر، حجامت، وہ اصلاح جو داڑھی کتروانے کے بعد حجام سے بنوائی جاتی ہے۔ خط آنا (نکلنا) چٹھی آنا، سبزہ آغاز ہونا، رخساروں پر داڑھی نکلنا وغیرہ۔''

جدید نسیم اللغات میں مکتوب کے معنی یہ لکھے ہیں:

''مکتوب (ع۔ مذ) لکھا ہوا۔ خط، چٹھی، لمبا لکھا ہوا کاغذ۔''

مکتوب، خط یا مراسلہ وغیرہ یہ سب مفہوم ایک دوسرے کو پیغام دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ خطوط نویسی ایک فن ہے، رشید احمد صدیقی اس کے متعلق رقم طراز ہیں۔

''خطوط نویسی ہی ایسا فن ہے جس کی تعمیر میں اصل معنوں میں مضمر ہے۔ اک صورت خرابی۔''

خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے۔ جس طور پر محبت ہوجاتی ہے، کی نہیں جاتی۔ اسی طور پر خط بھی لکھا جاتا ہے۔ لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کے مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔

اسلوب یا اسٹائل کے بارے میں ڈاکٹر بوفان (1788-1707) نے کہا تھا کہ ''اسلوب خود انسان ہے''۔ یعنی اس میں انسان کی چھپی ہوئی شخصیت اور اس کے

ذہن کو پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ بات اسلوب کے لیے درست ہو یا نہ ہو، البتہ خطوط پر ضرور صادق آتی ہے۔ یہاں لکھنے والا بے تکلف ہوتا ہے اور خط میں اس کا جذباتی مد و جزر بھی پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ خط اور دوسرے قسم کے مضامین لکھنے والوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ خط لکھنے والا سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ دوستوں کی صحبت میں ہے اور اس کو کسی قسم کی بدگمانی یا خطرہ نہیں ہوتا۔ وہ وہی چیز لکھتا ہے جو اس کے دل سے نکلتی ہے اور براہِ راست نوکِ قلم سے برآمد ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگ اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر منظرِ عام پر آئے گی، اس کے حسن و قبیح یا عواقب پر ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑیں گے۔ اس لیے وہ دلی ولولوں کو بے اختیار نہیں ہونے دیتا اور جو کچھ لکھتا ہے اس کو دماغ کے جنتر سے نکالتا ہے اور دل کو ''پاسبانِ عقل'' کی معیت سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ اصلی خطوط اس قسم کی بدعنوانیوں سے مبرا ہوتے ہیں اور وہی شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

''خطوط، لکھنے والے کی سیرت کے اصلی خدوخال ہوتے ہیں۔ بہ شرطے کہ وہ بے لاگ لکھے گئے ہوں۔''

اسی طرح محمد وسیم انجم خطوط کے متعلق رقم طراز ہیں۔

''مکاتیب سے انسان کی نہایت دل چسپ اور ہمہ گیر شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہر انسان کے خطوط خصوصاً ایسے خطوط جو انگریزی کے مشہور شاعر پوپ کی طرح اس غرض سے نہ لکھے گئے ہوں کہ وہ کبھی شائع کیے جائیں گے۔ اس انسان کی شخصیت پر ایک ایسی روشنی ڈالتے ہیں جو کسی دوسرے ذریعے سے میسر نہیں آسکتی۔''

علامہ اقبالؔ خط بنام خان محمد نیاز الدین خان محررہ 19 اکتوبر 1912ء میں رقم طراز ہیں۔

''مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی

بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا جب انہوں نے میرے بعض خط ایک کتاب میں شائع کردیے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ کیوں کہ خطوط ہمیشہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کردیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کرسکتے ہیں، مگر اشاعت، ان کی نظر ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیے۔"

اقبالؔ کا یہ احساسِ تشویش تعجب انگیز نہیں، خطوط، بالعموم قلم برداشتہ اور عجلت میں لکھے جاتے ہیں، اس لیے اکثر مشاہیر نے انھیں پسند نہیں کیا کہ ان کے ہر نوع اور ہر طرح کے خطوط شائع کیے جائیں، مگر اہم بات یہ ہے کہ بسا اوقات یہی خطوط مشاہیر کی شخصیات کے مطالعے میں اہم ترین ماخذ ثابت ہوتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجے کے شعرا کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔"

اگرچہ مکتوب میں شخصیت کے اظہار اور ذاتی جذبات و احساسات کے شمول کی گنجائش ہر دوسری تحریر کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم یہ مسلّم ہے کہ خطوط یا مکتوب بنیادی طور پر ادب نہیں، بلکہ بعض خطوط اپنی خاص خوبیوں کی وجہ سے ادب کا درجہ پا جاتے ہیں اور بعض اوقات ادبِ عالیہ میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ خطوط کے موضوعات قطعاً نجی اور ذاتی بھی ہوسکتے ہیں، قومی اور عالم گیر بھی۔ ان خطوط کا محرک عداوت بھی ہوسکتی ہے، عقیدت و محبت بھی۔ کاتب اور مکتوب الیہ کا رشتہ رسمی اور کاروباری بھی ہوسکتا ہے اور اس کی جڑیں لکھنے والے کی ذات میں بہت گہری بھی ہوسکتی ہیں۔ خطوط کی ظاہری شکل و ہیئت کا کوئی بھی فارمولا تسلیم کرلیا جائے، لیکن ان کے مواد اور مشمولات کی نوعیت کاتب اور مکتوب الیہ کے رشتے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مکتوب نویسی کا آغاز و ارتقا

خطوط نویسی یا مکتوب نویسی کا آغاز اس زمانے سے ہوگیا ہوگا جب انسان نے رسم الخط ایجاد کیا اور لکھنا سیکھا۔ چناں چہ تقریباً تین ہزار سال قبل کی تین سو مٹی کی لوحیں ایسی نکلی ہیں جن پر مصر کے فراعنہ کے نام خط کندہ ہیں۔ یہ 1887ء میں سرنا (عراق) کے مقام پر کھدائی کے دوران دریافت ہوئیں۔

یونانی ادب میں خط کا تذکرہ ہومر کی ایلیڈ میں آیا ہے۔ مورخ، ہیروڈوٹس (Herodotus) کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ قدیم یونان میں خط و کتابت کا رواج تھا۔ بہت سے خطوط افلاطون (Plato)، ارسطو (Aristtle) اور ایپی کیورس (Aepic Urus) سے بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔ پلوٹارک (Plutarch) کے خطوط مشہور ہیں۔ لیکن یہ کمال اہلِ روم کا تھا کہ انہوں نے مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن بنادیا۔ یہاں تک کہ صدی قبل مسیح میں سسرو (Cicero) نے خط نویسی میں جو شہرت حاصل کی، اس کے سامنے اب بھی لوگ سرِ عقیدت خم کرتے ہیں۔ سسرو کے خطوط کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ متمدن طبقوں اور مغرب کے تقریباً تمام ممالک میں صدیوں لاطینی کا دور دورہ رہا اور لاطینی میں سسرو کے خطوط اسلوبِ خط نویسی کا بہترین نمونہ ہیں اور سینیکا بزرگ (Seneca The Elder) کے مکتوبات قابلِ ذکر ہیں۔ لاطینی میں ہوریس (Horace) نے منظوم خط لکھنے کی روایت قائم کی۔ ملکہ الزبتھ کے زمانے تک انگریزوں کی آپس میں لاطینی ہی میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ ملٹن اور کرامویل کے عہد تک سائنس اور علمِ سیاست کی زبان لاطینی رہی۔

چودھویں صدی تک نہ تو انگریزوں کو متحدہ قومیت کا احساس ہوا، اور نہ مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انگریزی دربار پر فرانسیسی زبان کا تسلط رہا۔ یہی نہیں بلکہ بچوں کو ابتدا ہی سے فرنچ بولنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور فرانسیسی جاننا عالی نسبی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ جنگِ صد سال کے بعد انگریزوں میں روحِ ملت بیدار ہوئی اور انہوں نے اپنی مادری زبان کو قوم کی زبان قرار دیا۔ انگریزی زبان والپول، ڈاکٹر سموئیل جانسن، لارڈ چیسٹر فیلڈ، ولیم کوپر، چارلیس لیمب، کیٹس شیلے، برنز، براؤننگ، الزبتھ بیرٹ براؤننگ، جارج برنارڈشاہ، جیرلڈ، اسٹونسن اور کارلائل خطوط نویسی کے امام مانے جاتے ہیں۔ فرانسیسی ادب میں نپولین، والٹیر، وکٹر ہیوگواوگائی موپاساں کے خطوط ادب کے شہ پارے ہیں۔

عربی میں خط لکھنا ایک پیشہ تھااور اس پیشے کو اختیار کرنے والے کو کاتب کہا جاتا تھا۔ اسلام کا ظہور ہوا تو اس فن نے اور ترقی کی۔ بنو امیہ بن عباس کے عہد میں اس فن نے اور بھی ترقی کی۔ اس میں مہارت حاصل کرنے والوں کے لیے بہت سی کتابیں اور نمونے کے خطوط لکھے گئے۔ ابوبکر خوارزمی کے رسائل، مقامات، بدیع الزمان الہمدانی اور ابومحمد القاسم الحریری کی مقاماتِ حریری، تصنیف ہوئیں۔ خطوط نویسی کے آداب اور اس کی تاریخ پر ابوالعباس شہاب الدین القلقشندی کی صبح الاعشی جیسی ضخیم کتابیں بھی وجود میں آ گئیں۔ آہستہ آہستہ فن بدایع اور صنائع لفظی و معنوی کو فروغ ہوا، اور تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجازِ مرسل، ابہام توریہ کی بے شمار صورتیں سامنے آئیں۔ اس کا نتیجہ یہ تو ہوا کہ ہیئت کی بہت سی شکلیں اختراع ہوگئیں، مگر مواد اور معنویت کی طرف توجہ ہٹ گئی۔

فارسی ادبیات میں بھی فنِ انشا کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مامون الرشید کے زمانے سے ہی فارسی زبان کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ جب ہلاکو خان نے دولتِ عباسیہ کا خاتمہ کردیا تو عربی کا وقار بھی ختم ہوگیااور فارسی انشا کو فروغ پانے کا موقع مل گیا۔ عہدِ وسطیٰ میں فنِ مکتوب نگاری پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

مرزا محمد قتیل بھی ایک بہت بڑا انشا پرداز گزرا ہے۔ فارسی خطوط نویسی کو رسمی اور کاروباری مقاصد کے علاوہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ صوفیہ نے اپنے شاگردوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے خطوط لکھے یا فلسفہ و تصوف کے مسائل کی تشریح و تعبیر ان خطوط میں کی گئی۔ جیسے حکیم سنائی، شرف الدین یحییٰ منیری، سید اشرف جہانگیر سمنانی، سید محمد مکی (صحائفِ سلوک) اور شاہ ولی اللہ کے مکتوبات ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے خطوط سے وہ کام لیا جو آج کل اخباروں سے لیا جاتا ہے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی کے مکتوبات تصوف کے علمی اور نظری مسائل پر ہیں جو اپنے مریدوں کو تعلیم دینے کی غرض سے مدون ہوئے۔ ان میں رشید الدین فضل اللہ کے مکاتیب کا مجموعہ "منشاتِ رشیدی" اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کے خطوط "رقعاتِ جامی" مکتوباتی ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔ عہدِ اکبری کے امرا میں ابوالفضل علامی نے خطوط لکھے۔ جو برسوں تک مدارس کے نصاب میں داخل رہے ہیں۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں مکتوبات کے سینکڑوں مجموعے وجود میں آگئے تھے۔ منیر لاہوری کی "انشائے منیر"، چندر برہمن کی "چمن اور منشاتِ برہمن"، انشائے مادھورام" اور سید نثار علی بخاری بریلوی کی تالیف "انشائے دلکشا" اس قبیل کی چند نمایاں کتابیں ہیں۔ ملوک اور سلاطین میں اورنگ زیب عالمگیر کے رقعات کئی مجموعوں کی صورت میں مدون ہوئے۔ تاریخی اور سیاسی قدر و قیمت کے علاوہ ان خطوط کا ادبی رتبہ بھی بہت بلند ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ کے خطوط کا مرزا غالبؔ کے خطوط کے فارسی رقعات "پنج آہنگ" ہندوستان میں نثری اسلوب کے امکانات کا نمونہ ہیں۔ اُردو کے شعرا متقدمین میں کسی ایک کا بھی خط نہیں ملتا۔ انہوں نے لکھے بھی کم ہوں گے اور ان کے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام بھی نہیں کیا گیا۔

انیس ویں صدی کے نصف اوّل تک خانگی خطوط بھی فارسی میں لکھنے کا چلن تھا اور یہ علم و فضل کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔

☆☆☆☆☆

اُردو میں مکتوب نویسی

اُردو میں جو خطوط لکھے گئے، ان میں رجب علی بیگ سرور کے مکتوبات ہیں، وہ مسجع و مقفیٰ اور پُرتکلف اُردو میں ہیں۔ جہاں لفظوں کے جنگل میں معانی روپوش ہو جاتے ہیں۔ سربرآوردہ ممتاز اُردو شعرا میں سب سے پہلے مرزا اسد اللہ خان غالبؔ نے اُردو میں باقاعدہ خطوط نویسی کی طرح ڈالی۔ غالبؔ کو جہاں اور بہت سی باتوں میں نمایاں خصوصیت حاصل ہے، وہاں ایک یہ بھی ہے اور کسی سے کم نہیں ہے کہ جس چیز کو انہوں نے اپنے لیے "تنگ" قرار دیا تھا، اس میں ایسے "نقش ہائے رنگ رنگ" پیدا کیے جو آج بھی بے مثل ہیں اور خطوط نویسی کے جدید ترین اصولِ تنقید پر صحیح اُترتے ہیں۔ غالبؔ نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ خط نویسی کا اوّلین اور شاید بہترین معیار یہی ہے۔ غالبؔ کے خطوط کا سب سے زبردست راز یہ ہے کہ انہوں نے رقعات میں اپنی سیرت اور اپنے ماحول کی ادنیٰ جزئیات کو بھی اصلی رنگ میں بغیر کسی تصنع یا آمیزش کے پیش کیا ہے اور اس امر کی کہیں کوشش نہیں کی کہ وہ بہترین شاعر، مفکر یا معلم کے رنگ میں نظر آئیں اور ان کی ظرافت، بذلہ سنجی، بے تکلفی، وسیع المشربی، شاگردوں سے الفت، بڑوں اور بزرگوں سے عقیدت، چھوٹوں پر شفقت ہر جگہ نمایاں ہے۔ زمانے نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انہوں نے زمانے کو کس طرح برتا۔ اس کے بعض نہایت دل نشین نمونے ملتے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی جس چیز نے ان رقعات کو لازوال بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا لکھنے والا غالبؔ اور صرف غالبؔ ہو سکتا ہے۔ غالبؔ

کے خطوط کا مجموعہ ''عودِ ہندی'' کے نام سے شائع ہوا۔

اُردو میں آسان اور سائنٹفک نثر کی بنیاد سرسیّد احمد خان نے رکھی تھی۔ انہوں نے اُردو نثر کو عام فہم بنانے اور علمی زبان کا رتبہ دینے کے لیے جو کوششیں کیں، اسے باقاعدہ ایک تحریک کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم سرسید کے خطوط کے متعلق رقم طراز ہیں۔

''وہ ایک زود نویس مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی قابلِ توجہ ہیں۔ غالباً وہ اُردو ادب میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ذاتی حالات وضروریات سے زیادہ قومی، ملکی، سیاسی اور تہذیبی مسائل کو اپنے خطوط کا موضوع بنایا اور یہ مسائل اس طرح ان کے ذاتی حالات میں شیر وشکر ہوگئے کہ انہیں علیحدہ کرنا مشکل ہے۔''

اس سلسلے میں اہم ترین کڑی سرسید کے وہ خطوط ہیں جو سمندر پار سے نواب محسن الملک کو لکھے گئے۔ ان خطوط میں انگلستان کی ترقی وتہذیب کا ذکر ہے۔ ہندوستان کی مفلسی اور جہالت کا ماتم ہے اور اپنے مستقبل کے منصوبوں کا ذکر ہے۔ ان خطوط میں تاثیر، شگفتہ ظرافت اور خوب صورت انشا سے نہیں بلکہ خصوص اور دردمندی سے پیدا ہوتی ہے۔ سرسید نے خطوط میں طنز کے حربوں سے بھی کام لیا ہے۔ کہیں کہیں ظرافت کی چاشنی بھی ہے، لیکن ہر جگہ ایک سنجیدہ مقصد پوشیدہ ہے۔ کہیں وہ دل کی بھڑاس بھی نکالتے ہیں، لیکن اس میں تلخی کے بجائے طنزیہ انداز میں دلائل کے انبار لگادیتے ہیں اور پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ علمی اور تمدنی مسائل زیرِ بحث آجاتے ہیں اور انھی نکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح ان خطوں کی ایک علمی حیثیت بھی ہے، لیکن ان کی سب سے بڑی حیثیت ایک مخلص اور بے ریا انسان کی زندگی اور اس کے مشن کی وضاحت کی ہے۔

مفتی صدر الدین آزردہ، غالبؔ کے ہم عصروں میں سے تھے، وہ اپنے وقت کے جید عالم، مفتی اور شاعر تھے۔ انہوں نے نوابینِ رام پور کے نام جو خطوط لکھے وہ عرض

ومعروضات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر پر فارسی طرزِ انشا کا اثر ہے۔

واجد علی شاہ:

1856ء میں سلطنتِ اودھ کا الحاق انگریزی حکومت سے ہوگیا اور جانِ عالم واجد علی شاہ مٹیا برج کلکتہ بھیج دیے گئے۔ کچھ بیگمات ساتھ گئیں اور کچھ یہیں رہ گئیں۔ اس جدائی میں بیگمات نے شاہ کو جو خطوط لکھے، ان کا موضوع ظاہر ہے ہجر و مفارقت ہی ہوسکتا تھا۔ بہت سی تبدیلیوں کے باوجود اس وقت لکھنؤ فسانۂ عجائب کے اثر سے آزاد نہیں تھا۔ واجد علی شاہ اور بیگمات کے خطوط کی زبان بھی مقفیٰ اور پُرتکلف ہے۔ بلاشبہ تکلف اور تصنع کے باوجود ان کی مکاتیب میں لطفِ بیاں اور چاشنیِ زباں ہے۔ ادبی حیثیت کے ساتھ ان کی تاریخی حیثیت بھی ہے۔ یہ اپنے عہد کے مزاج کے آئینہ دار ہیں۔

محسن الملک اور وقار الملک سرسید کے خاص رفقائے کار تھے۔ ان کے یہاں بھی وہی جدت پائی جاتی ہے اور اس حد تک کہ کسی جگہ بھی ان کی فضا نہیں بدلتی۔ ان کا لب ولہجہ اور مدّعا ایک ہی ہے۔ انیس ویں صدی کی تعلیمی جدوجہد، تہذیبی تبدیلیاں اور سماجی حالات اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط جدید طرزِ انشا پردازی اور سنجیدہ و پختہ تحریر کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ محسن الملک نے اصل تفسیرِ قرآن پر جو خط سرسید اور دوسرے دوستوں کو لکھے، وہ کمال لیاقت اور زبردست بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔ ان خطوط میں ادبیت کی چاشنی نے زورِ بیاں پیدا کردیا ہے۔

الطاف حسین حالؔی، سرسید کے خیالات کے بہت بڑے مبلغ اور ان کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے والے تھے۔ ان کے مکاتیب کا لب ولہجہ بھی قومی اور ملی زیادہ ہے۔ ذاتی حالات اور گھریلو معاملات کا ذکر ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ لیکن موضوع کی ہم آہنگی کے سبب حالؔی کے خط بھی سرسید کے خطوط کے زمرے میں آتے ہیں۔ حالؔی نے اپنے عزیز

اور رشتے داروں کو خطوط لکھے ہیں۔ بنی نوع انسان سے ہم دردی اور مسلمانوں کی خدمت ان کے یہاں بمنزلہ عبادت کے ہے۔ حالیؔ، سرسید ہی کی طرح قوم کی بدحالی کا ماتم کرتے ہیں۔ برائیوں اور بدعنوانیوں کو بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ جہالت، تعصب اور بے حسی پر آنسو بہاتے ہیں، لیکن اظہار مدعا میں سرسید کی طرح جوش و خروش اور غیض و غضب کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ ہر حال میں توازن کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں اپنے معاصرین کے مقابلے میں نرمی اور اعتدال زیادہ ہے۔

مولوی نذیر احمد:

مولوی نذیر احمد ناول نگاری کے ساتھ اُردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انہوں نے ملازمِ سرکار کی حیثیت سے بہت مصروف زندگی گزاری۔ معاملاتِ خانگی اور کاروبار و تجارت میں دل چسپی لی۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''موعظہ حسنہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ تمام خطوط نذیر احمد نے اپنے بیٹے کے نام لکھے۔ جن کا مقصد علم کی فضیلت اور دنیوی معاملاتِ زندگی کے نشیب و فراز بتانا تھا۔ دراصل نذیر احمد ان خطوط میں اپنے مزاج، اُفتادِ طبع اور اسلوب کے اعتبار سے پوری طرح ظاہر ہوئے ہیں۔ مراسلت کے پیرایہ میں واعظانہ رنگ اور تربیتی رنگ ظاہر ہوا ہے۔ ان مکاتیب کا مرکزی خیال نفع، نقصان، اچھائی، برائی، ناپ تول، دور اندیشی اور اغراض و مقاصد پر مبنی ہے۔ یہی ان خطوط کا مدعا ہے۔

محمد حسین آزادؔ:

محمد حسین آزادؔ کی تصانیف اُردو ادب کی دنیا میں اہم ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلوبِ نگارش کا بانکپن ''دربارِ اکبری'' اور ''نیرنگِ خیال'' میں دکھایا ہے۔ خطوط کو انہوں

نے زیادہ قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ فقط ضرورت سے مجبور ہوکر چند لوگوں کو خطوط لکھے ہیں، لیکن ان کے خطوط کا مجموعہ پھر بھی بڑا پُرلطف اور کارآمد ہے۔ ان کے خطوط میں مکالمہ کا انداز پایا جاتا ہے۔ موثر، آسان اور چھوٹے چھوٹے فقرات جو آسانی سے سمجھ میں آجائیں، پائے جاتے ہیں۔ ان کے خطوط کی غالبؔ کے خطوط سے بہت مشابہت ہے۔ زمانہ بھی دونوں کا قریب قریب تھا۔ دل بھی دونوں کے سلطنتِ اسلامی کے انقلاب نے مجروح کردیے تھے۔ اس لیے جب وہ کچھ لکھتے تھے، چوٹ کھایا ہوا دل، دوچار قطرے خون کے عبارت میں ملا دیتا تھا۔ جس سے پڑھنے والا محو ہوجاتا تھا۔ ان کے خطوط میں زمانہ کی شکایت، شاگردوں کے گلے اور اپنی قلندرانہ طبیعت و بے نیازی کا ذکر ہے۔ اپنی تکلیفات کا بیان ہے اور بہ قول ان کے برابر خطوط چلے آرہے ہیں کہ فرمایئے "دربار اکبری" کا کیا حال ہے؟ "قند پارسی" کا کیا حال ہے۔ لیکچروں کا کیا حال ہے، یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزادؔ کا کیا حال ہے۔

شبلی نعمانی:

شبلی نعمانی اُردو کے عناصرِ خمسہ میں بہ حیثیت مکتوب نگاری بہت اہم ہیں۔ ان کے مکتوبات نے اُردو کی ادبی تاریخ میں ایک اچھے اسلوبِ نگارش کا اضافہ کیا۔ ان کے ہاں ایسے خطوط بھی ہیں جو ذاتی جذبات اور شوقِ ملاقات سے مجبور ہوکر لکھے گئے۔ یہ کاروباری خط نہیں بلکہ ذوقِ نظر کے آئینہ دار ہیں۔ ایجاز و اختصار نے ان خطوط کو اور بھی دل چسپ بنادیا ہے۔ ان کے خطوط میں تصنع اور تکلف کم اور صداقتِ شعری پورے طور پر نمایاں ہے۔ ان میں انسانی جبلت اور شاعرانہ شرافت کو ایک دوسرے کے متوازن رکھا گیا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی:

اکبر الٰہ آبادی قدیم خیالات کے دل دادہ، صوفیوں کے معتقد اور مشرقی تہذیب کے پرستار تھے۔ مشرق سے محبت ان کے نزدیک بمنزلہ مذہب کے تھی۔ اس لیے مغربی تہذیب کی "برکات" کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے معتقدوں، مدّاحوں اور ہم مذاق اصحابِ علم کے نام خاصی تعداد میں خطوط لکھے ہیں۔ عزیزو، دوستوں اور خودداروں سے مراسلت کی ہے، ان کی رہبری کی ہے۔ انہیں مشورے دیے ہیں، کتابوں اور شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ مذہب کی اہمیت، زندگی سے اس کا تعلق، عالمِ اسلام کا اضطراب، مسلمانوں کی غفلت، اپنی ذات، اپنی بیماریاں، کم زوری، نقاہت، غرض خط کا زندگی سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے، وہ جس طرح جذبات وکوائف کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ سب باتیں اکبر کے خطوط میں ملتی ہیں اور وہ بھی صاف اور سادہ زبان میں۔ برمحل القاب و آداب اور روانی سے اپنے خیالات کا اظہار جابجا اشعار کا استعمال اور اس سے اپنے مقصد اور مدّعا کا اظہار کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی وغیرہ بھی اپنے خطوط میں آسان اور علمی نثر لکھتے ہیں۔ مولانا عبدالکلام آزاد نے "غبارِ خاطر" لکھ کر اس علمی نثر کو ادبی رنگ و آہنگ بھی دے دیا ہے اور یہ کتاب اُردو نثر میں ایک سنگِ میل بن گئی۔ نیاز فتح پوری نے مولانا آزاد کے اسلوب سے توانائی اور شبلی کے اندازِ بیاں سے شگفتگی حاصل کی ہے، ان کے خطوط "مکتوباتِ نیاز" دو جلدوں میں شائع ہوئے تھے، جن میں اکثر کے مکتوب الیہ یا فرضی ہیں یا غیر معلوم ہیں۔

دل چسپ خطوط لکھنے والوں میں چودھری محمد علی ردولوی (گویا دبستان کھل گیا) غالب کی روایت کے شاید آخری امین تھے۔ امیر مینائی نے اپنے خطوط میں القاب میں

نیا رنگ پیدا کیا۔ مرزا داغ کے خطوط کا مجموعہ "انشا کے داغ" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ خطوط نواب رام پور، نظام دکن، نواب وقار الملک، شاگردوں اور دوستوں کے نام ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے بھی خطوط لکھے۔ وہ بھی قابلِ توجہ ہیں۔ عبدالحلیم شرر، ریاض خیر آبادی کے خطوط بھی اہم ہیں۔ مزید جلال لکھنوی، سید احمد دہلوی، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولانا غلام قادر گرامی، وحید الدین سلیم، عبدالرحمٰن بجنوری، حکیم عبدالحیٔ اور چکبست لکھنوی کا خط بنامِ لالہ سری رام کسی نہ کسی پہلو سے قابلِ توجہ ہیں۔

غالب کے بعد علامہ اقبال اُردو کے دوسرے عظیم اور اہم شاعر ہیں، جن کی مقبولیت ہمہ گیر ہے، ان کے لکھے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار خطوط اب تک دریافت ہو چکے ہیں۔ سید مظفر حسین برنی ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"انہوں نے اپنی چالیس سال سے زائد مدت پر پھیلی ہوئی ادبی زندگی میں اس سے بہت زیادہ خطوط لکھے ہیں۔ جن میں بہت سے ضائع ہو گئے اور کچھ اب بھی کسی گوشۂ گم نامی میں پڑے ہوں گے اور اِکا دُکا ہر سال منظرِ عام پر آ کر اس ذخیرہ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔"

ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے لندن سے 1934ء میں مولانا سلیمان ندوی کو ایک خط لکھا تھا، اس میں انہوں نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے خطوط کے متعلق چند مختلف النوع امور پر اپنے افکار کا اظہار یوں کیا ہے۔

1۔ وہ علمی میدان میں فرزانِ قوم کو ترغیب دیتے ہیں کہ حصول کی خاطر انہیں سمتِ راست کی طرف قدم بڑھانا چاہیے اور اسے محض ڈگری کے حصول کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

2۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تعلیمی درس گاہوں میں "اسلامیات" کو

بھی دیگر مضامین کی طرح اہم اور گراں قدر تصور کرنا چاہیے۔ وہ اس سلسلے میں چند تجاویز بھی پیش کرتے ہیں جو بلاشبہ قابل عمل اور لائق تقلید ہیں۔

یہ تو تھا مختصراً جائزہ مکتوبہ نگاری کا اب ہم حبیبؔ جونپوری کی مکتوب نگاری کی طرف آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حبیبؔ جونپوری کی مکتوب نگاری

حبیبؔ جونپوری کے غیر مطبوعہ مکتوب جو انہوں نے یونس نشاط کے نام لکھے ہیں، ہمیں دستیاب ہوئے ہیں۔ یونس نشاط صاحب حبیبؔ جونپوری کی ایک عزیز اور محبوب ترین شاگردہ جمال پروین وارثی کے شوہر نام دار ہیں۔ یہ خطوط نجی قسم کے ہیں۔ لیکن کچھ نمایاں پہلوؤں کی وجہ سے ہم انہیں زیرِ بحث لانا ضروری سمجھتے ہیں۔

ان کے خطوط میں زندگی کے مختلف معاشرتی مسائل، مذہبی نکات اور فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔

حجابِ نسواں،

والدین کا احترام،

مرد کی عورت پر فضیلت،

شوہر اور بیوی کے تعلقات،

قیامت کیا ہے؟

زندگی دراصل کیا ہے؟

شریعت کے اصولوں پر چلنا،

انہیں زندگی میں کیا کیا مشکلات اٹھانا پڑیں،

ان سب پر ان کے خطوط کے ذریعے روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں

نے زندگی میں کس طرح جدوجہد کی اور اپنی منزل تک پہنچے، ان سب کا ذکر ان کے خطوط میں موجود ہے۔

حبیبؔ جونپوری نے ذاتی تعلقات اور حالات کے پردے میں بڑے اہم موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان میں زندگی اپنی پیچیدگیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں حوصلہ شکن حالات میں زندہ رہنے کا وسیلہ بھی ہے، بیان کی شوخی بھی۔ انہوں نے ذاتی حالات و ضروریات اور قومی اور تہذیبی مسائل کو اپنے خطوط کا موضوع بنایا اور یہ مسائل اس طرح ان کے ذاتی حالات میں شیر و شکر ہو گئے کہ انہیں علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں عزیزوں کی پریشانی میں ان کا غم غلط کرنے کی کوشش کی ہے، گھریلو مسائل سے دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں چھوٹے چھوٹے فقرے، مؤثر، آسان اور سمجھ میں آنے والے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ فارسی اور عربی الفاظ و محاورات کا استعمال کیا ہے، مختلف شعرا کے مختلف اشعار کو اپنے خطوط میں استعمال کیا ہے۔

ہمارے شاعروں اور مصنفوں نے جو خطوط لکھے، ان میں لوگ مقصد اور مدّعا کے علاوہ اور بہت کچھ بھی تلاش کرتے ہیں۔ ان میں کہیں کام یابی ہوتی ہے اور کسی جگہ مایوسی۔ خط لکھنا ایک فن ہے، بلکہ مشکل فن۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بہت سے لوگوں کے خط پڑھتے ہیں، لیکن لذت اور تسکین ہمیں ان خطوط میں ملتی ہے جنہیں مکتوب نگار نے اپنے خونِ جگر سے لکھا ہو۔ حبیبؔ جونپوری کے خطوط پڑھ کر ایک عالم اور مفکر کے خطوط کا تاثر اُبھرتا ہے اور ان میں ناقدانہ اظہارِ رائے ملتا ہے۔

اب ہم حبیبؔ جونپوری کے خطوط میں جن موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، ان کو مندرجہ ذیل موضوعات میں تقسیم کر کے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

1۔ زندگی کیا ہے؟

2۔ قیامت کیا ہے؟

3۔ پردہ کیوں اہم ہے؟

4۔ حجابِ نسواں اور ہمارے نظامِ تعلیم کی خامیاں

5۔ شریعت کے قوانین

6۔ والدین کے کیا حقوق ہیں؟

7۔ بیوی کے کیا حقوق ہیں؟

8۔ عورت کیا ہے؟

9۔ عورت کے فرائض کیا ہیں؟

10۔ انسان کی حقیقت کیا ہے؟

11۔ انسان کے دو مربی کون کون سے ہیں؟

12۔ قدیم روایات کیا ہیں؟

13۔ برائی کیا ہے؟

14۔ انسان کو آزادیِ رائے کا حق ہونا،

15۔ وفا کیا ہے؟

16۔ دن اور رات کیوں بنائے گئے ہیں؟

17۔ جہدِ مسلسل کا کامیابی کی کنجی ہونا،

18۔ دنیا کیا ہے؟

19۔ حق بات کو ہر حال میں کہنا،

20۔ محبت کیا ہے؟

حبیبؔ جونپوری کے نزدیک تکلیف کا پہنچنا، پریشانی کا بڑھنا، اضطراب میں اضافہ ہونا، الجھن دوگنی ہوجانا ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اپنے مکتوب بنامِ یونس نشاط محررہ 25/12/1971 میں لکھتے ہیں۔

1۔ زندگی کیا ہے؟

"رنج وغم، خوشی و شادمانی کی آمیزش زندگی کے ناقابلِ تردید حقائق ہیں۔ جن سے چشم پوشی یا مصلحت، خود فراموشی کا سنگِ میل بن سکتا ہے۔ جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سماجی، معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کو جنم دے سکتا ہے۔ اس لیے زندگی کے ان دو بنیادی مسائل کو حاصلِ حیات سمجھنا چاہیے، اگر ہر خواہش عملی جامہ پہن لے، ہر آرزو راہِ عمل پر گامزن ہوجائے، ہر تمنا پوری ہوجائے، ہر ارمان اپنے نکلنے کی راہ متعین کرلے، ہر مودت بغیر امتحان سند حاصل کرلے، ہر الفت رشتۂ یک جہتی میں بغیر قصد منسلک ہو جائے، ہر محبت بغیر کڑی شرطوں کے اپنا روپ دھارنے میں کام یاب ہوجائے تو پھر دنیا اور جنت میں فرق کیا رہے گا۔ خود داری اور اَنا کے اثمار کس شجر سے وجود میں آئیں گے اور یہ جذبات کہاں سے جنم لیں گے جس کا اظہار زبانِ اقبالؔ سے ہوتا رہا ہے، سرسید اور حالیؔ و اکبرؔ جس کے نقیب تھے۔"

2۔ قیامت کیا ہے؟

قیامت ایک حقیقت ہے، شاعروں، ادیبوں، دانش وروں، مفکروں، غرض یہ کہ سب قیامت کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ حبیبؔ جونپوری کا بھی قیامت کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہے۔ یونس نشاط نے انہیں خط لکھا تھا، اس کے جواب میں انہوں نے قیامت کے متعلق اپنے نظریات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

"آپ نے ابتدا میں زندگی اور عمر کا قضیہ چھیڑ دیا اور قیامت کا ذکرِ خیر بھی آ گیا۔ جو بزبانِ حال حرماں نصیبی کا رونا رو رہی ہے۔" ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس

محفل میں ہے۔" ہاں تو قیامت ٹوٹنا، قیامت توڑنا، قیامت ڈھانا وغیرہ محاورات کسی کے رعنائی رخ کے قصہ خواں ہیں، اس لیے ہر محفل میں اس کا ذکر آ ہی جاتا ہے... بیٹے، قیامت کسی کے مصحفِ عارض کا عکس نہیں بلکہ غم کا مرقع، اضطراب کی تصویر کا نام ہے۔ وہ قیامت جو مذہبی دائرے میں ہے، یوم الجزا ہے، وہ ہمارے قدرت و اختیار سے باہر ہے۔ وہ شانِ کریمی کا مظہر اور وصل کا یومِ موعود ہے۔ اس کی خواہش کسے نہیں۔ لہٰذا ذکرِ قیامت اسی خواہشِ دیرینہ کا اظہار ہے۔"

3۔ پردہ کیوں اہم اور ضروری ہے؟

حبیبؔ جونپوری پردے کے بہت بڑے حامی تھے۔ اس کو خواتین کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ اپنے ایک خط (محررہ 7/1/1972 ص ٥) میں لکھتے ہیں۔

"پردہ ایک بابرکت چیز ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ تین شاہد عادل میرے اس دعوے کی بین دلیل ہیں، یعنی عقل، مذہب اور تجربات۔ آئے دن کے واقعات، گزرنے والے حادثات، ہمیں اس امر کا درس دیتے ہیں کہ جو چیز بہتر اور عزیز ترین ہوتی ہے یا مفید اور کارآمد ہوتی ہے، انسان فطرتاً اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی حفاظت کا بہتر سے بہتر انتظام و انصرام کرتا ہے۔ آپ نے کسی کو دولت و سرمایہ کو راہ گزر پر پھینکتے ہوئے یا اس کی حفاظت سے لاپروا ہوتے ہوئے نہیں پایا ہوگا۔ بلکہ اسے چشمِ مردم افراطِ خانہ کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنے کی سعی میں مشغول پایا ہوگا۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ لہٰذا عقل نے یہ فیصلہ کر دیا کہ عزیز ترین، پسندیدہ، مفید اور کارآمد اشیا کا چھپانا عقلاً درست ہے۔ جب یہ عقلی فیصلہ دماغی نکتہ سمجھ میں آ گیا تو اس امر کا فیصلہ بھی ہو جائے کہ آیا عورت عزیز ترین متاعِ حیات ہے یا نہیں۔ اس کے لیے صرف یہ لکھ دینا کافی ہے کہ عزت و ناموس ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرہ کی ایک اہم کڑی ہے، جس کی حرمت قائم رکھنے کے لیے جان دے دینا بھی بائیں ہاتھ کا کام ہے، لہٰذا

عزیز ترین ہونا ثابت ہوا خواہ وہ عورت ماں کے روپ میں ہو یا بہن کے یا بیوی کے... اس لیے اس سے زیادہ عزیز ترین سرمایۂ حیات اور کون ذات ہو سکتی ہے۔ اس لیے اسے چھپانا، اس کی حفاظت کرنا، ہر عقل مند انسان کا فرض ہے۔ اسی کا نام پردہ ہے۔ جہاں تک اخلاقی حیثیت کا تعلق ہے، اس کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عورت کی فطرت (خود سپردگی) ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے۔ شادی، بیاہ، یہ رسوم و قواعد اسی بنیاد پر قائم کیے گئے ہیں، ورنہ اجنبی مرد اور عورت ایک دوسرے سے اتنا زیادہ گھل مل سکتے ہیں کہ ایک جان دو قالب ہو جائیں۔ عورت کا یہی جذبہ وہاں کام آتا ہے اور دنیا کی آبادی کا سبب بنتا ہے۔ شریعت نے اس کے لیے جائز و ناجائز، حلال و حرام کی اصلاح معین کر دی اور راہ کا تعین کر دیا گیا، گویا یہ جذبہ اس راہ سے حاصل کیا جائے تو جائز و حلال ہے اور اگر یہ جذبہ دوسری راہ سے حاصل کیا جائے تو ناجائز اور حرام ہے۔ اس کا ثمرہ حرامی ہے۔ یہ زنا کاری ہے۔ عیاشی ہے۔ مقصد یہ ہوا کہ عورت کا یہ فطری جذبہ ہے۔ تقاضائے اخلاق یہ ہے کہ راہ معین سے اس کا حصول ہو، پھر جب مرد اور عورت بے حجابانہ ملیں گے تو آگ اور پھوس اکٹھا ہو جائیں گے۔ لہٰذا آگ اسے خاکستر بنا دے گی۔ اس لیے کہ دونوں فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہیں۔ اس صورت میں عورت جتنا مرد سے دور رہے گی، اتنا ہی بہتر ہے، اگر ماحول میں ایسا نہ ہو، راہیں محدود ہوں تو گناہ کے خطرات معدوم تو نہیں ہوں گے، لیکن کم ضرور ہو جائیں گے۔ لہٰذا اخلاقی حقیقت سے بھی پردہ ضروری ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ امر واضح ہے کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ اس کی تائید کرتی ہیں، تجربات بھی یہی بتاتے ہیں۔''

جب حبیب جونپوری پردے کی بات کرتے ہیں تو وہاں یہ بھی بتاتے ہیں کہ امیر طبقے میں عورت کی خود سپردگی خریدنے کا رجحان ملتا ہے اور جہاں غربت زیادہ ہے تو

وہاں خود سپردگی کو بیچا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"دولت مند طبقے کو ایسا خطرناک ماحول زیادہ ملتا ہے، لہٰذا وہاں یہ غلاظت زیادہ ہے، جہاں غربت ہے، وہاں یہ خود سپردگی خریدی جاتی ہے۔ لہٰذا امارت و غربت دونوں مسلسل اس کی زد میں ہیں۔ البتہ امارت و غربت کے درمیانی طبقے میں یہ غلاظت کم ہے، لیکن جب یہ طبقہ امارت و غربت کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا حشر اور دردناک ہوتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک بلکہ ہر عقلِ سلیم رکھنے والے کے نزدیک پردہ ایک رحمت ہے اور جس قدر سختی سے اس کی پابندی کی جائے، اتنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ گھر میں بیٹھنے والی عورتیں یا باہر گھومنے والے مرد جو لاأبالی یا لطف کے متلاشی۔ اپنے کو بزعمِ خود مضبوط کردار کا سمجھنے والے، آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیتے ہیں اور عورتیں اس گندے ماحول سے ناواقف ہوتی ہیں، خاص کر ہمارے زمانے کی عورتیں جو پرانے ماحول میں آنکھ کھولے ہوئے ہیں... صرف برقع پہن لینا ہی پردہ نہیں ہے، میں نے لاہور کی 25 سالہ زندگی میں کوٹھیوں، بنگلوں، مکانوں، جھونپڑوں، اسکولوں، کالجوں، مسجدوں، خانقاہوں کا بہ نظرِ عمیق بہت قریب سے تجربہ کیا ہے۔ میں ٹیوشن کے سلسلے میں یہاں جاتا رہا ہوں اور ان آنکھوں سے اس غلاظت کے ڈھیر کو دیکھا ہے۔ اس لیے بے حجابی اور پردہ کا ذکر آتا ہے تو کانپ جاتا ہوں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس سلسلے میں شرعی اصول و قواعد دوررس فوائد کے حامل ہیں۔"

یہاں جہاں پردے کے متعلق انہوں نے عقلی دلائل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہاں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان کا دنیا سے رابطہ کس قدر زیادہ تھا۔ لوگوں سے میل جول کتنا زیادہ تھا۔ ان کی نظر معاشرے کے ہر فرد اور ہر طبقے پر تھی۔ وہ معاشرتی اونچ نیچ کو سمجھتے تھے اور پھر انہوں نے بڑی مفکرانہ اور بڑے عالمانہ انداز میں اپنے مؤقف کا اظہار کیا ہے۔

4۔ حجابِ نسواں اور ہمارے نظامِ تعلیم کی خامیاں

حبیب جونپوری نے حجابِ نسواں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہمارے تعلیمی ڈھانچے پر بھی روشنی ڈالی ہے اور آزادی کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ کفر و ضلالت کی داعی ہوتی ہے۔ اس لیے آزادی بھی ایک حد تک ہونی چاہیے اور حبیب جونپوری اس سلسلے میں اپنے ایک خط میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

"پرانی سوسائٹی نے عورتوں کو حجابِ نسواں کی تعلیم کے جوہر سے بھی کنارہ کش کردیا تھا۔ رفتہ رفتہ زمانے نے کروٹ لی اور عورت نے تعلیم کے میدان میں قدم رکھا۔ لوگوں نے حالات کے تقاضے کو دیکھا، لیکن ضروریات کو نہیں پرکھا۔ یہی وہ بنیادی خامی تھی جس نے ہزاروں معاشرتی برائیوں کو جنم دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انگریزوں نے سو سال ہمارے ملک پر حکومت کی، اس نے تعلیمی ڈھانچے کو اس انداز سے ڈھالا کہ یہاں ہر تعلیم یافتہ نوجوان اس کے بنائے ہوئے اصول و قواعد کا حامل بن سکے اور اس مشین کا ایک کارگر پرزہ بن سکے جو دیارِ غیر سے تیار کر کے یہاں بھیجی جاتی ہے۔ انگریز اپنے مقصد میں کامیاب رہا، یا ناکام، یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہم تو اس بنیادی غلطی کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں جو خود ہماری لائی ہوئی ہے اور درپردہ انگریزی حکومت اس کی داعی ہوئی۔ جب پاک و ہند کے نوجوان اس تعلیمی سانچے میں ڈھلنے لگے جو انگریزوں نے بنائے تھے تو ان کا ماحول اور معاشرہ بھی ایک نئی جاذبیت کے ساتھ اُبھرا، اور ہمارا جذباتی نوجوان مستقبل سے بے نیاز ہوکر ان دل آویزیوں میں ایسا اُلجھا کہ سر اور دھڑ کی بازی لگا بیٹھا۔ وہ اپنی بیویوں کو لے کر ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے کا متمنی نظر آیا۔ اس تمنا کے حصول کا ذریعہ تعلیم اور صرف تعلیم نظر آیا۔ لہٰذا نوجوانانِ وطن نے جدوجہد شروع کردی۔ بہنوں کو تعلیم کی خوبیوں سے آگاہ کر کے اپنا ہم خیال بنالیا۔ یوں ایک سے دو بنے اور ہر گھر میں انقلابِ عظیم برپا ہوگیا۔ ماں باپ سر پر

ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے اور مجبور محض بن کر نتائج کے منتظر ہو گئے۔ اس انقلاب نے ان کے اعضا شل کر دیے۔ ان کی غور و فکر کی راہیں مسدود ہو گئیں اور وہ حیرت کی تصویر بن گئے... کاش یہ تعلیم کے علم بردار نوجوان اس نکتہ کو یاد رکھتے کہ عورت اور مرد کی ہیئت، ذمے داری، ساخت، ضروریات وغیرہ میں فرق ہے۔ لہٰذا وہ تعلیمی ڈھانچہ جو انگریزوں نے مردوں کے لیے بنایا تھا، عورتوں کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے گا۔ لہٰذا عورتوں کے لیے ایسے تعلیمی ڈھانچے کی ضرورت ہے جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ مثلاً گھریلو ذمے داریاں، بچوں کی تعلیم و تربیت، معاشرے اور ماحول کی عظمتوں کا احترام وغیرہ۔ کاش ایسا کر لیا جاتا اور ان کے لیے علیحدہ تعلیمی ڈھانچہ تیار کر لیا جاتا تو آج یہ کیفیت نہ ہوتی۔ بلکہ دنیا جہنم کے بجائے جنت بن جاتی۔ اچھے خیالات کی امین ہوتی اور آج کا ماحول دل چسپ اور کارآمد بن جاتا، لیکن بدقسمتی سے لڑکیوں کو بھی وہی کتاب پڑھنی پڑی، انہیں مضامین کو اپنانا پڑا جو مردوں کو مرد بنانے کے لیے تیار کیے گئے تھے، خواہ وہ بزدل ہوں یا بہادر۔ بہرحال جوہر مردانہ کے قیام کا زیادہ عنصر ان میں شامل تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ یعنی عورتیں بھی مردوں کی فطرت کی امنگوں کو دبا کر جذبات کی غلام بن گئیں اور مردوں کے دوش بہ دوش چلنے میں فخر محسوس کرنے لگیں اور کلبوں کی جان، محفلوں کی شمع ضرور بنیں، لیکن گھر کی زینت، بچوں کی تربیت کی ضامن نہ بن سکیں۔ یہی بنیادی غلطی آج ہمارے معاشرے کی بربادی، ماحول کی تباہی، تمدن کی خودکشی کا سبب بن گئی۔"

حبیبؔ جونپوری نے اپنے خط میں تفصیلاً نظامِ تعلیم کی بنیادی غلطی کی طرف نشان دہی کی ہے۔ اس کے بعد وہ اس بات کا بھی رونا روتے ہیں کہ ہماری 32 سالہ کوششوں کا ثمرہ ابھی تک نظروں کے سامنے آیا ہے۔ وہ ابتدائی راہوں سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ ضرورت ہے کہ وقت کے تقاضے کے مطابق تیزی سے اس طرف قدم بڑھایا

جائے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے متعلق بتاتے ہیں کہ میں کیا کچھ کر رہا ہوں۔ لکھتے ہیں۔

"اس سلسلے میں مجھے جو کچھ کرنا چاہیے، میں کر رہا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ میں نے تعلیم کے وزیر، گورنروں اور دوسری انجمنوں سے رابطہ قائم کر رکھا ہے... قلم چلتا رہتا ہے اور مختلف، متنوع زاویے اور خیالات سامنے آتے رہتے ہیں جن پر تبادلۂ خیال کی نئی نئی راہیں پیدا ہورہی ہیں اور ہم اس منزل پر پُرامید ہیں کہ شاید موجودہ تعلیمی پالیسی جس کا اعلان پندرہ فروری 1972ء کو ہو رہا ہے، اس بنیادی غلطی کا حل تلاش کر سکے۔"

اس خط میں پندرہ فروری 1972ء میں ہونے والی تعلیمی پالیسی کا بھی ذکر کیا ہے۔

5۔ شریعت کے قوانین کیوں اہم ہیں؟

حبیبؔ جونپوری کا گھرانہ مذہبی رسومات و عقائد کا پیروکار تھا۔ وہ خود بھی اس کی عملی تفسیر بننے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی لیے انہوں نے گیت بھی لکھے تو اپنے اسی مذہبی ناموس کی خاطر۔ اپنا نام گیت کے حوالے سے کسی کے سامنے نہیں آنے دیا۔ انہوں نے شریعت کے قوانین کو ہمیشہ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے مفید اور کارآمد سمجھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا اور آخرت میں کامیابی صرف تب ہی ممکن ہے جب شریعت کے اصولوں پر کاربند رہا جائے۔ لکھتے ہیں۔

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسانی فلاح میں شریعتی اصول و قواعد دوررس فوائد کے حامل ہیں۔"

6۔ والدین کے کیا حقوق ہیں؟

حبیبؔ جونپوری کے نزدیک والدین کا احترام بہت ضروری اور اہم ہے۔

انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے والدین کی عزت کرے۔ احادیث نبویؐ اور خود کلام اللہ اس بات کا شاہد ہے کہ والدین کا احترام کتنا ضروری ہے۔ حبیب جونپوری اپنے ایک خط میں یونس نشاط کو اس طرح والدین کے حقوق کے متعلق بتاتے ہیں، کہتے ہیں:

''والدین جو ایک مربی کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہیے (یہ بات آپ کو سمجھ لینی چاہیے) قرآن کے مطابق اہل و عیال کے نان و نفقہ کو فرض قرار دے دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ تہدید بھی ہے کہ اتنا زیادہ اس طرف مائل نہ ہو جاؤ کہ حقوق العباد اور حقوق اللہ سے روگردانی کے مرتکب بن جاؤ، لیکن والدین کے ساتھ بڑھاپے میں احسان و سلوک کا ذکر چھ مقام پر تاکیدی حیثیت سے آیا ہے، اس سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اللہ کی نظر میں والدین کا مرتبہ کیا ہے۔ اس صورت میں جب اولاد نافرمانی کرے، اُن کے جذبات کیا ہوتے ہیں، اُن کے احساسات کے دھارے کون سا رُخ اختیار کرتے ہیں...... والدین کے اُن جذبات و احساسات کا آپ کو ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے، تاکہ بدگمانیاں پیدا نہ ہوں اور دل و دماغ کسی بحران کا شکار بن کر قوتِ مدافعت سے محروم نہ ہو جائیں۔ یہی وہ راہ ہے جب آپ کے مستقبل کو تابناک بنا سکتی ہے اور آپ کے ارادوں کو حقیقت کا لباس پہنا سکتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ یہ نکتہ ایک کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔ رکاوٹیں راہ کا روڑا نہیں بن پاتیں، اس لیے قدم اُٹھانے سے پہلے اس زریں نکتہ کو بنیاد بنا لیجیے تاکہ سکون منجر بہ اضطراب نہ ہو۔ ماں باپ دولت کے بھوکے نہیں ہوتے، ہاں عزت کے مستحق ضرور ہوتے ہیں۔ بیٹے سے ہر چیز لے لینے میں اُن کو عار نہیں ہوتی بلکہ خوشی کا سبب بنتا ہے، لیکن بہو کے ہاتھوں لینے میں اُن کی اَنا پر تازیانہ پڑتا ہے، یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ برائی نہیں، اس لیے اس نازک مرحلے کو ہمیشہ ذہن میں رکھیے۔ اس لیے کہ بہ ظاہر یہ کوئی قابلِ اعتنا نہیں، لیکن علمِ نفسیات میں اس کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ بوعلی سینا کا خیال ہے کہ گھریلو زندگی کی تباہی کا یہ سنگِ بنیاد

ہے۔ سقراط نے اُسے بربادی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ ذی مقراطیس اسے حیاتِ انسانی کی خودکشی کے مترادف گردانتا ہے۔ اس لیے تجربات کی روشنی میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ اس سے کسی وقت، کسی لمحہ بے اعتنائی برتنا اپنے آپ کو مصیبتوں میں مبتلا کرنا ہے۔"

7۔ بیوی کے حقوق کیا ہیں؟

حبیبؔ جونپوری نے جہاں والدین کے حقوق کے متعلق اپنے نظریات و خیالات کا اظہار کیا ہے، وہاں بیوی کے حقوق کے متعلق بھی روشنی ڈالی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ بیوی اور والدین کے درمیان ایک توازن ہونا چاہیے، جس سے زندگی بہترین گزر سکتی ہے، مندرجہ بالا خط میں جہاں والدین کے حقوق کی بات کی ہے، اس سے آگے بیوی کے حقوق کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور پہلو بھی ہے، اُسے نظر انداز کرنا بھی الم ناک بن سکتا ہے، یعنی نیا ساتھی جو زندگی کی رعنائیوں میں چمک دمک پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے، یعنی بیوی جو ماں باپ، بھائی بہنوں، دوست احباب کی قربانی دے کر اس امید پر شریکِ حیات بنی ہے کہ ان قربانیوں کے صلے میں مجھے یہ ثمر ملا ہے، لہٰذا اُسے میری اُلجھنوں کا مداوا بننا چاہیے تاکہ جن محبتوں کو میں ٹھکرا کر آئی ہوں اس کا آئینہ دار بن سکے۔ حقیقت میں مرد یہیں آکر مرد بنتا ہے، اس لیے کہ میرے نزدیک مردانگی کا جوہر یہیں سے کھلتا ہے۔

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارکؔ بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

آئینِ مردانگی اور اصولِ انسانیت یہی ہے کہ دونوں (والدین اور بیوی) مطمئن رہیں اور کسی کو شکایت نہ ہو۔ یہ صرف آپ کی سوجھ بوجھ پر منحصر ہے۔ والدین ہوں یا بیوی، دونوں کا مقصد ایک ہے، یعنی توجہ۔ بیٹے کی حیثیت سے یا شوہر کی حیثیت

سے اور وہ اس کا اندازہ مختلف پیمانوں سے کرتے ہیں اور جب تک دونوں کو اس امر کا یقین ہوتا رہتا ہے کہ توجہ ہماری طرف ہے، وہ مطمئن رہتے ہیں اور جب اس میں کمی محسوس کرتے ہیں تو ان کی خودی پر ضرب لگتی ہے، ان کی انا مجروح ہوجاتی ہے۔ بس یہی وہ منزل ہے جہاں سے فتنہ و فساد سر اُبھارنے لگتے ہیں اور گھر افراتفری کا نقشہ پیش کرنے لگتا ہے۔ طعن و تشنیع کے تیر چلنے لگتے ہیں۔ طنز کی اس تیر بارانی میں سینہ چھلنی ہوجاتا ہے اور پریشانی بڑھنے لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد غلط فیصلہ کر بیٹھتا ہے اور بنیادی نکتے کو فراموش کر کے کسی ایک طرف جھکاؤ پیدا کرلیتا ہے۔ چوں کہ نیا ساتھی نئے نئے انداز کا حامل ہوتا ہے، اس لیے زیادہ تر اس طرف جھکاؤ ہوجاتا ہے اور والدین سے دامن کش ہوجاتا ہے۔ والدین یہ سمجھتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ میرا بیٹا منحرف ہوجائے۔ اس میں ضرور بہو کی شرارت ہے۔ حالاں کہ حقیقت سے اس خیال کا دور کا بھی رشتہ نہیں ہوتا، ذاتی طور پر یہ بیٹے کا اضطرابی ردعمل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہو تو بیوی، ساس سسر کو مجرم بنالیتی ہے۔ بہرحال فتنہ و فساد کے راستے کھل جاتے ہیں اور گھر جنگ کا میدان بن جاتا ہے، جس کا نتیجہ ہول ناک ہی نہیں، کرب ناک بھی ہوتا ہے، اس لیے دونوں میں توازن رکھنا چاہیے۔"

8۔ عورت کیا ہے؟

حبیبؔ جونپوری کے نزدیک عورت ایک بے حد عزیز ترین متاعِ حیات ہے۔ اس لیے کہتے ہیں:

"عورت ایک نازک آبگینہ ہے۔ احساسات کی روح، محبت کا گنجینہ، نفرت کا سرچشمہ، معصومیت کا پیکر، حسن کا چربہ، نزاکت کا آئینہ، تخیل کی اُٹھان، حجاب بے حجابی، عروسِ کائنات، غرض متضاد طبیعت کی مالک ہے۔ آگ ہے، پانی ہے، مومِ خام ہے، فولاد ہے۔

تیری یہ نازک سی ہستی مجمعِ اضداد ہے

تصور میں رنگ، تخیل میں نور، توہم میں انتشار، زندگی میں رونق، جذبات میں زیر و بم، رنگینیِ خواب، دل کشی و جذب کا مجسمہ، عورت صرف عورت کی ذات ہے۔ جس کے سامنے دولت و سرمایہ، تاج وتختِ فقیری و شاہی سب ہیچ ہیں، پھر اس سے زیادہ عزیز ترین مایۂ حیات اور کون ذات ہو سکتی ہے۔"

9۔ عورت کے فرائض کیا ہیں؟

جہاں حبیبؔ جونپوری نے عورت کو متاعِ حیات کہا ہے،وہاں عورت کے فرائض پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کرنا، گھریلو ذمے داریوں کو پورا کرنا، معاشرے اور ماحول کی عظمتوں کا احترام کرنا، یہ عورت کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کلبوں کی زینت بنے، شمعِ محفل بنے اور گھر کی زینت نہ بنے۔ بچوں کی تربیت کی ضامن نہ بنے۔ لکھتے ہیں:

"گھریلو ذمے داریاں نبھانا، بچوں کی تعلیم و تربیت کرنا، معاشرے اور ماحول کی عظمتوں کا احترام کرنا عورت پر فرض اور واجب ہے۔"

10۔ انسان کی حقیقت کیا ہے؟

حبیبؔ جونپوری نے جہاں اپنے خطوط میں دوسرے امور پر اظہار خیال کیا ہے، وہاں انسان کی حقیقت کے متعلق بھی بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ تخلیقی حیثیت سے ہم کیا ہیں؟ اور ہمارے وجود میں کون کون سی اشیا شامل ہیں اور ان کا تقاضا کیا ہے۔ یہ امر ثابت ہے کہ قدرت نے پہلے دو مرکز بنائے۔ زمین اور آسمان، پھر ان میں رشتہ وحدت کا استوار کردیا یعنی جب تک دونوں مقام کی اشیا یک جا نہ ہوں، شے کا وجود نہ ہو۔ عملی حیثیت سے یوں سمجھیے کہ زمین کو کسان جوتتا ہے، بوتا ہے، لیکن آسمانی جزو یعنی پانی جب تک اس کا شریک نہیں بنتا

غلہ روئیدہ نہیں ہوتا۔ جب دونوں طاقتیں مجتمع ہوتی ہیں تو قوتِ نمو پیدا ہوتی ہے اور وہ زمین کی چھاتی کو چیر کر اپنا سر باہر نکالتا ہے۔ یہی تخلیقی اصول انسان کی خلقت میں بھی مضمر ہے۔ انسانی جسم حصہٗ ارض ہے۔ یہ اس وقت تک بے کار ہے جب تک آسمانی جزو اس کا شریک نہ ہو جائے یعنی روح، جب دونوں کا اشتراک ہوتا ہے تو آنکھیں دیکھنے لگتی ہیں، کان سننے لگتے ہیں، طاقتِ گویائی آتی ہے۔ حرکت و سکون کا فلسفہ جنم لیتا ہے، دماغ و عقل کی کارفرمائی کا میدان وسیع ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جسم اور روح کے مجموعے کا نام انسان ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف پلٹتی ہے۔

جسم قبر کے حوالے ہو جاتا ہے اور روح اپنے مرکز کی طرف صعود کر جاتی ہے۔"

11۔ انسان کے دو مربی کون کون سے ہیں؟

انسان کی تخلیقی حیثیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حبیبؔ جونپوری انسان کے دو مربی کون کون سے ہیں، اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ مندرجہ بالا خط میں ہی آگے لکھتے ہیں:

"جب انسان دو جزو کا مجموعہ قرار پایا تو قدرت نے اس کے دو مربی بنائے، ایک جسم کا مربی، جسے ماں باپ کہتے ہیں، دوسرا روح کا مربی جسے استاد کہتے ہیں.... ماں اور باپ کے فرائض میں یہ شامل ہیں کہ جسم کی تربیت پر خاص خیال رکھیں۔ استاد کا یہ فرض ہے کہ روح کی تربیت کرے۔"

12۔ قدیم روایات کیا ہیں؟

حبیبؔ جونپوری قدیم روایات و اقدار کے پرستار تھے۔ انہیں محبوب رکھتے تھے۔ ایک خط میں یونس نشاط نے حبیبؔ جونپوری کو لکھا کہ "(میں قدامت پسند نہیں ہوں)" اس بات پر انہوں نے یونس نشاط کو تنبیہ کی اور قدامت کا مطلب واضح کیا۔ لکھتے ہیں:

"آپ نے ایک جملہ لکھا ہے (میں قدامت پسند نہیں ہوں) عجیب بات ہے کہ آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، جس آغوش میں تربیت پائی، کیا اس کا تقاضا یہی ہے کہ ایسا مہمل جملہ آپ بغیر نتائج و عواقب پر غور کیے ہوئے لکھ جائیں۔ سوچیے کیا اسلام قدیم نہیں ہے؟ کیا قرآن قدامت کی یادگار نہیں؟ کیا والدین اور ان کا ردِعمل قدامت کا سرچشمہ نہیں؟ کیا خود آپ کا وجود قدیم رسم و رواج کی یادگار نہیں؟ کیا آپ کی شادی، لکیر کے فقیر ہونے کی دلیل نہیں؟ کیا آپ کا خلوص، ایثار، احترام، تعظیم و تکریم، محبت، نفرت، گفتگو، کھانا پینا، قدیم روایات کی محکم زنجیر نہیں ہے۔ جب لوگ شراب کے رسیا بنیں، کلبوں میں نامحرموں کے ساتھ راگ و رنگ کی محفلیں جمائیں، بیوی کا سرِ بازار نیلام فرمائیں، برائیاں کرتے ہوئے نہ جھجکیں، پھر قدامت کے بندھن سے آزاد ہوں گے اور مذکورہ جملہ اپنے معنی کی افادیت حاصل کر سکے گا۔ آپ یہ لکھ سکتے تھے کہ میں قدیم روایات کا اتنا دل دادہ نہیں ہوں بلکہ حالات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نقیب ہوں، تاکہ زندگی برائے زندگی سے دامن چھٹ سکے اور راہِ ترقی وا ہو سکے اور مقصدِ جدوجہد حاصل ہو سکے۔"

13۔ برائی کیا ہے؟

برائی کے متعلق حبیبؔ جونپوری کا اپنا نکتۂ نظر ہے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہر وہ چیز جو انسان پر حاوی ہونے کی کوشش کرے، وہ برائی ہے۔ غیر مرد کا قرب حاصل کرنا گناہِ عظیم اور بہت بڑی برائی ہے۔"

14۔ شرم و حیا کیا ہے؟

حبیبؔ جونپوری مندرجہ بالا خط میں برائی کے متعلق بتاتے ہیں کہ برائی کیا ہے، اس سے آگے شرم و حیا اُن کے نزدیک کیا ہے، اس کے متعلق بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک شرم و حیا جانِ مشرقیت ہے۔ یہی چیز بے حجابی سے روکتی

ہے۔ جھجک کو قائم رکھتی ہے، برائیوں سے محفوظ رکھتی ہے، زندگی کو حسن و رعنائی کا مرقع بنا دیتی ہے۔"

15۔ انسان کو آزادی رائے کا حق ہونا

حبیبؔ جونپوری انسان کی آزادی کے علم بردار تھے۔ انھیں بچوں اور بڑوں سب کی آزادی پسند تھی۔ اپنے ایک خط میں بچوں کی آزادی کے متعلق لکھتے ہیں:

"میرا نظریہ، یہ ہے کہ جب بچہ صائب الرائے ہوجائے تو وہ معاملات جو اس کی ذات سے متعلق ہیں، اس کی آزادانہ صواب دید پر چھوڑ دینا چاہیے۔"

ایک دوسرے خط میں آزادی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔ کچھ معاشرتی اصول و قواعد ہیں، جنھیں سوسائٹی نے حالات کے مطابق ہم پر مسلط کیے ہیں، جن میں بلحاظِ وقت و ماحول ترمیم و تنسیخ ہوتی رہتی ہے۔ یہیں قدامت پسندی اور جدت پسندی کے الفاظ جنم لیتے ہیں اور کچھ فطری اصول ہیں، جنھیں خالقِ کائنات نے ہمارے لیے وضع کیے ہیں۔ جہاں تبدیلی کا تصور گناہ، ترمیم کا تخیل، جرمِ تنسیخ کا ارادہ قابل گردن زدنی ہے، لہٰذا ہماری گفتگو یا تبادلۂ خیال کا محور یہی فطری اصول ہے جس کا ہر انسان کو حق حاصل ہے، جس میں باپ، بیٹے، میاں، بیوی، چھوٹے بڑے کا فرق برائے نام ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ نہ دیکھو (من قال) کون شخص کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو (ما قال) کیا کہہ رہا ہے تاکہ اچھی رائے کو قبول کرسکو، ضد اور تعصب سے نجات حاصل کرسکو۔"

16۔ وفا کیا ہے؟

وفا کے متعلق حبیبؔ جونپوری لکھتے ہیں:

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

گو آج کی دنیا میں لفظ ''وفا'' بے معنی سمجھا جاتا ہے اور اثر سے خالی فرض کرلیا گیا ہے، لیکن میرے نزدیک یہ دو مفہوم کا حامل ہے، ایک وفا برائے وفا، جسے ہمارے شعرا نے ناممکن العمل تصور کرلیا ہے اور جس کی مردہ لاش پر آنسو بہانا اپنا فریضۂ شاعری سمجھتے ہیں۔ دوسری وہ وفا جس کو فطرت عمل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ دونوں تشریحات غالبؔ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ پہلے خیال کا غماز غالبؔ چچا کا یہ مصرع ہے:

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

دوسرے خیال کی تصدیق انہیں کا یہ شعر کرتا ہے ۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیا

17۔ دن اور رات کیوں بنائے گئے ہیں؟

حبیبؔ جونپوری جہاں مختلف امور پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں، وہاں اُنہوں نے دن اور رات کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے:

''خدا نے یا فطرت نے دن کام کے لیے اور رات آرام کے لیے بنائی۔ ہم نے اس سے چشم پوشی کی اور رات کو آرام کی بجائے کام، دل چسپی، تفریح اور مشغلہ کا روپ دے کر رات کو دن بنانے کی سعی کرنی شروع کردی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ زیادتی مشاغل کے باعث اس کے پیچ ڈھیلے ہوجائیں گے، لہٰذا ہمیں فطری اصول پر عمل پیرا ہوکر زندگی کے ان ایام کو صحیح طور پر صرف کرنا چاہیے تاکہ قویٰ مضبوط رہیں اور آپ کو طویل عمر سے خوف نہ آئے اور میری طرح ان تخیلات کا اسیر نہ ہونا پڑے۔

طویل عمر اور اس پر یہ شکباریٔ غم
نہ ختم ہوتا ہے پانی، نہ جام بھرتا ہے

میں اسی دور سے گزر چکا ہوں جس سے آپ گزر رہے ہیں۔ میں نے اُس وقت بے اعتنائی برتی، جس کا نتیجہ آج میرے سامنے ہے، اس لیے نصیحت کرتا ہوں کہ

من نہ کردم شما حذر بکنید

18۔ جہد مسلسل، کامیابی کی کنجی

حبیبؔ جونپوری اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمیشہ محنت ہی سے انسان کام یاب ہوسکتا ہے۔ اس لیے یونس نشاط کو بھی سخت محنت کرنے کی نصیحت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

''آپ کا عزم آہنی اور جہدِ مسلسل ہی آپ کے مستقبل کو تاب ناک بنائے گا... میں نے جدوجہد کے ذریعے اپنا مقام بنایا ہے اور پچاس سال تک جنگ کرتا رہا ہوں اور اب بھی تھکا نہیں ہوں اور اُن شاء اللہ اگر زندگی نے وفا کی تو اپنے مشن کو پورا کرکے رہوں گا۔ ہاں اگر زندگی نے ہی کاندھا ڈال دیا تو مجبوری ہے۔''

19۔ دنیا کیا ہے؟

دنیا کے متعلق حبیبؔ جونپوری لکھتے ہیں:

''دنیا ایک بحرِ ذخار کی مانند ہے جس میں کشتیِ حیات رواں دواں ہے اور یہ حیات فانی، زندگی ناپائیدار، ایک بلبلہ کی مانند ہے جو چند لمحے اپنی آن بان دکھا کر مرکز کی آغوش میں گہری نیند سوجاتا ہے، لیکن جب نفسِ امارہ کی متلاطم موجیں اُسے تھپیڑ پر تھپیڑ مارتی ہیں تو سیلی زدہ طفل کے مانند خواہشات کا طوفان اُٹھنے لگتا ہے اور اس کی طوفان میں حیاتِ فانی خار وخس کی طرح بہنے لگتی ہے۔ تمناؤں کا ایک جال بچھ جاتا ہے۔ آرزوؤں کے گرداب گھیراؤ ڈالنے لگتے ہیں۔ ارمان تڑپ تڑپ کر جنابِ آسا آنکھیں دکھانے لگتے ہیں۔ اُمید دامن سمیٹ لیتی ہے۔ زلفِ یاس کمر تک بکھر جاتی ہے اور تخیلِ پرواز کناں الفاظ کے ذریعے اپنی عکاسی کرتا ہے۔

زندگی کا یہی لمحہ عین حیات ہے۔ اس لیے کہ مصیبتوں میں گھر کر رُخِ حیات مجموعۂ حسن و رعنائی، مجسمۂ کیف سرمستی بن جاتا ہے۔ یہی اسباب سعیِ پیہم کے محتاج بنتے ہیں اور جدوجہد کے چشمے اسی منزل سے پھوٹتے ہیں۔ یہ زندگی کا درمیانی رُخ ہے، اس لیے کہ

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

20۔ حبیبؔ جونپوری کا اپنی زندگی کے متعلق نظریہ

اور اپنی طبیعت اور فطرت کا ذکر

حبیبؔ جونپوری نے ہمیشہ ایک مسلسل جدوجہد اور کوشش کرتے ہوئے زندگی بسر کی۔ ہمیشہ محنت کی۔ انھیں اس سلسلے میں بے شمار مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے اُن کے اندر صبر و استقلال کی قوت بڑھی، ضبط کرنا آیا، خود اپنے خط میں اس بات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''میری مثال ایک دور اُفتادہ پتھر کی سی ہے جو سرِ راہ پڑا ہوا ہے اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھا کر بھی اپنی کیفیت پر قانع ہے۔ امتدادِ زمانہ نے اسے صبر کی دولت سے مالامال کردیا ہے۔ مرورِ ایام نے اپنے عطیات سے نوازا ہے، کبھی ضبط کی سوغات پیش کردی، کبھی استقلال کا درس دیا، کبھی سکون کا تحفہ مرحمت فرمایا، کبھی ہمت کا ارمغان عطا کیا، ان عطیات نے اسے جاذبِ نظر بنادیا۔ کوئی اسے مندر میں رکھ کر پوجنے لگا، کسی نے قابلِ اعتنا نہ سمجھا، پجاری کی عزت افزائی کے باوجود ہمیشہ اپنی حقیقت پر ناظر رہا اور ایاز قدر خود بہ شناس کے مصداق عمل پیرا رہا، جس نے نظروں سے گرادیا، اس سے شاکی بھی نہیں رہا، اس لیے

تمھیں ہوں تو ہوں میری جانب سے شکوے
مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے

اسی طرح اس خط میں حبیبؔ جونپوری اپنی طبیعت اور فطرت کے متعلق بتاتے ہیں کہ میں فقیر طبع انسان ہوں۔ لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں، مگر میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا، لکھتے ہیں:

''میری فطرت پیرانہ سالی کے باعث نہیں بلکہ ابتدا ہی سے فقیرانہ رہی ہے۔ نہ غمِ زرو، نہ غمِ کالا میری طبیعت دعا ہے، میری عادت سلامت روی ہے، خاموشی بہترین شغل ہے، خلوص میری روح، ہم دردی میرا شیوہ، صاف گوئی میرا طریقہ ہے، متانت و سنجیدگی میرا پیشہ ہے۔ نہ امیروں کی خوش آمد، نہ غریبوں سے دامن کشی بلکہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اس کے باوجود دنیا متکبر سمجھتی ہے۔ نہ میں نے دولت کا رعب ڈالا، نہ صلاحیت کا ڈنکا بجایا، نہ قابلیت کا غازہ ملا۔ انتہا یہ ہے کہ میرے قریبی دوستوں کو بھی یہ معلوم نہیں کہ میری تعلیمی استعداد کیا ہے۔ اس لیے کہ میرا نظریہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

میری کم آمیزی نے مجھے اس خطاب کا مستحق گردانا ہے۔ میں اپنی اس کم زوری سے واقف ہوں، لیکن اتنی فرصت نہیں مشاغل سے، یہ مشاغل اب طبیعتِ ثانیہ بن چکے ہیں، ان سے روگردانی موت کے مترادف ہے۔ اس لیے مجبور ہوں انہیں ترک نہیں کر سکتا۔''

21۔حق بات ہر حال میں کہنا

حبیبؔ جونپوری ہمیشہ حق بات کو ہر ایک کے سامنے کہہ دینا پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہیں بے شمار جگہوں پر نقصان بھی اُٹھانا پڑا۔ اس کا ذکر وہ اپنے مختلف خطوط میں

کرتے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''میری صاف گوئی سے بعض اوقات مجھے بہت نقصان پہنچا ہے اور میں آج تک اسی لیے موجودہ ترقی سے ہم کنار نہ ہوسکا۔ ورنہ کسی کالج کا پرنسپل ہوجانا کوئی دشوار امر نہ تھا۔ لیکن اپنی حقیقت پسندی سے مجبور ہوں۔ اب بھی حق و صداقت کی راہ سے منحرف نہیں ہوں اور آج بھی اسی راہ پر گامزن ہوں۔ مختصر واقعہ یہ ہے کہ میں جو حق سمجھتا ہوں، اس کے کہنے سے کبھی باز نہیں رہتا۔ اس میں خلوص کو دخل ہوتا ہے۔ فتنہ و فساد برپا کرنا نہیں ہوتا۔''

ایک اور خط میں اس بات کو شعر میں یوں بیان کرتے ہیں:

مانو نہ مانو جانِ جہان اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

22۔ محبت کیا ہے؟

محبت کے متعلق حبیبؔ جونپوری یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''یہ صرف ایک جذبۂ فطری ہے جو پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ ہوجاتا ہے۔ یہ جذبہ سرچشمۂ روحانیت ہے، جس کی ہر ساعت عبادت، ہر لمحہ ریاضت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔''

حبیبؔ جونپوری نے اپنے خطوط کو نادر الفاظ، تشبیہات و استعارات سے سجایا ہے۔ جابجا اشعار کا استعمال کیا ہے، عربی اور فارسی کے الفاظ و محاورات کا استعمال اُن کی عربی اور فارسی زبان پر عبور کو ظاہر کرتا ہے۔ اکثر خطوط میں جملے چھوٹے چھوٹے اور خوب صورت ہیں۔ اُن کے خطوط میں شعریت اور قافیہ بندی بھی پائی جاتی ہے۔ اُن کے خطوط کسی طرح بھی کسی بڑے مکتوب نگار سے کم اہم نہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

رباعی

مفہوم، روایت اور ارتقا

رباعی کی صنف اپنے اصولوں کے حوالے سے دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں ایک مشکل صنف ہے اور شاعر سے ایک خاص طرح کے ذوق اور مزاج کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری رقم طراز ہیں:

"رباعی کی دقت پسندی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ پختہ مشق شاعروں نے ساٹھ برس کی عمر کے بعد اس صنف میں طبع آزمائی کا مشورہ دیا ہے۔"

رباعی اُردو فارسی شاعری کی ایک معروف صنفِ سخن ہے۔ رباعی کی ایجاد کا سہرا ایران کے سر ہے۔"

اس کے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"عربوں میں رباعی تھی ہی نہیں (ان کا کہنا ہے) کہ رباعی کے مخترع اہلِ عجم ہیں اور اس کے اوزان بھی ایرانی ہیں۔

قدیم ایرانیوں میں چہار بیتی کا جو وزن رائج تھا، اس کی مثمن صورت کا نام دو بیتی اور بعد کو رباعی ہوگیا۔ یہ قدیم چہار بیتیاں یا دو بیتیاں اوّل اوّل لکھی نہ جاتی تھیں بلکہ صرف سماجی مجلسوں، تہواروں، مذہبی اجتماعات اور نجی تقریبوں کے مواقع پر نچلے طبقے کے دل بہلاوے کے لیے اس قسم کے گیت گایا کرتے تھے۔"

لیکن ڈاکٹر سید مجاہد حسین حسینی لکھتے ہیں:

''صوفیائے کرام نے پہلے پہل رباعی کا ڈول ڈالا۔ خصوصیت کے ساتھ عربی زبان دیگر اصناف سخن کی طرح رباعی سے بھی مالامال ہے۔ اس کے بعد رباعی فارسی زبان میں پہنچی۔ اس صنفِ سخن کے لیے مختلف اوقات میں دو بیتی، جفتی، چہار مصرعی، چوپائی، چو مصرع، چو بالا اور ترانہ کی اصطلاحات بھی استعمال ہوتی رہی ہیں۔ اب عموماً اسے رباعی ہی کہتے ہیں۔''

اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''غزل کی مانند رباعی کو بھی بالعموم رودکی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ترانہ بہرحال اسی کا دیا ہوا نام ہے۔''

مگر عواصی نے اپنی کتاب ''تذکرۂ باب الالباب'' میں رودکی کی رباعیوں کا تذکرہ نہیں کیا، اس نے ابوشکور بلخی متوفی ۳۳۶ھ کو پہلا رباعی گو قرار دیا ہے۔ گو فارسی کی پہلی رباعی یہ ہے:

ای کشتۂ من از غم فراواں تو بست
شد قامت من زور ز ہجراں تو شست
ای شیشہ من از فریب توہست
خود ہیچ کیسے بہ سیرت وشاں توہست

تذکرۂ لباب الالباب آلِ ساسان سے آلِ غزنوی تک عنصری و فرخی کے یہاں چند رباعیوں کا پایا جانا ثابت کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا کہ رباعی گوئی کے لیے سلجوقی عہد بہت سازگار تھا۔ اس عہد میں ابوسعد، ابی الخیر، حکیم عمر خیام، نظامی گنجوی، خاقانی، انوری، اور سنائی وغیرہ رباعی گو شعراء کا پتا چلتا ہے۔

رباعی حسب ذیل قواعد و شرائط کی پابند ہے۔

ا۔رباعی صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۲۔پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع لازماً ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ تیسرے مصرع میں قافیہ ضروری نہیں۔ تیسرے مصرع میں اگر قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں بلکہ اہلِ فن کے نزدیک مستحسن ہے۔

تیسرے مصرع میں قافیہ نہ ہو تو ایسی رباعی خصی یا غیر مصرع کہلاتی ہے اور اگر چاروں مصرعوں میں قافیہ ہو تو ایسی رباعی کو مصرع کہیں گے۔ شروع شروع میں مصرع رباعیاں کثرت سے کہی جاتی تھیں، اب اس کا رواج نہیں رہا۔

۳۔رباعی کے پہلے تین مصرع تین سیڑھیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو قاری کو بہ تدریج ایک ایسی بلندی تک لے جاتے ہیں جہاں چوتھا مصرع اپنا بھرپور جلوہ دکھاتا ہے۔ رباعی کے چوتھے مصرع کو ڈاکٹر سلام سندیلوی نے تین مصرعوں کا نچوڑ، امداد امام اثر نے تینوں مصرعوں کا خلاصہ، احسن مارہروی نے رباعی کی جان، ضیا بدایونی نے حاصل رباعی اور حمید عظیم آبادی نے کڑی کمان کا تیر اقرار دیا ہے۔

۴۔رباعی کہنے کے لیے بحر ہزج کے اوزان اخرب و اخرم مقرر ہیں جو تعداد میں چوبیس ہیں۔ بارہ اوزان کا تعلق بحر ہزج کے دائرۂ اخرب سے ہے اور بارہ کا تعلق اخرم سے۔ رباعی انھی اوزان میں کہی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اس کے متعلق کہتے ہیں:

''رباعی صرف بحر ہزج مثمن (اخراب و اخرم) ہی میں کہی جا سکتی ہے۔ البتہ زحافات سے چوبیس صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ بحر کی تبدیلی سے رباعی، رباعی نہ رہے گی۔ قطعہ بن جائے گی۔''

لیکن نجم الغنی ''بحر الفصاحت'' میں لکھتے ہیں:

''مذکورہ دائرہ کے اشتراک سے کم از کم بیاسی ہزار نو سو چوالیس شکلیں پیدا ہوتی ہیں، جن کے اوزان یا ترتیب مصاریع میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور رہے گا۔''

۵۔ رباعی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ سارے مصرعے ایک ہی وزن میں ہوں۔ رباعی کے چار مصرع چار مختلف اوزان میں بھی کہے جاسکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ چاروں اوزان بحر ہزج کے مقررہ چوبیس اوزان میں سے ہوں:

''زیادہ تر شعراء نے اس کے وزن کی صرف سات صورتوں کو برتا ہے۔''

شمیم احمد نے رباعی کے وزن کی مروّج صورتوں کا شماریاتی تجزیہ کرنے کے لیے ولی، میر، سودا، غالب، ذوق اور فانی وغیرہ کی ۲۵۰ رباعیوں کی صورت میں ایک ہزار مصرعوں کی تقطیع سے مندرجہ بالا نتیجہ اخذ کیا۔

بعض سخت گیر ناقدین نے اخرب اور اخرم کے اوزان کو ایک رباعی میں جمع کرنا جائز نہیں سمجھا، یعنی وہ چاہتے ہیں کہ ایک رباعی میں اخرب کے اوزان سے استفادہ کیا جائے۔ یا اخرم کے اوزان سے۔ لیکن رباعی میں عموماً شعرا نے اخرب و اخرم کے اوزان کو الگ الگ رکھنے کی یہ پابندی قبول نہیں کی جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ رباعی کو مختلف ناموں سے پکارا گیا۔

اس سلسلے میں حمید عظیم آبادی لکھتے ہیں:

''رباعی کو ترانہ، دو بیتی، جفتی اور چار مصرعی کہتے ہیں۔''

قدر بلگرامی کے مطابق ''ترانہ'' رباعی کو کہتے ہیں۔

اس کو ترانہ کہنے کا سبب یہ ہے کہ اس میں غنائیت کی وجہ سے گائے جانے کی صلاحیت موجود ہے۔

نجم الغنی نے شمس الدین محمد بن قیس الرازی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''ترانہ اس کو اس لیے کہتے ہیں کہ ارباب موسیقی نے اس پر اچھے اچھے راگ بنائے ہیں، عربی میں ایسے اشعار کو قول کہتے ہیں۔''

لیکن مجنوں گورکھ پوری مقالہ بعنوان ''رباعی'' (مطبوعہ ''اقدار'' کراچی شمارہ نمبر ۸۔۷) میں لکھتے ہیں:

''رباعی کے بارے میں ۹۰ فی صدی لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ رباعی کا ہر مصرع چہار رکنی ہوتا ہے، جو ترانے میں نہیں ہوتا۔ ترانے کے ہر مصرع میں تین ارکان ہوتے ہیں۔ رباعی زحافات میں کہی جاتی ہے۔ اخرب مفعول اخرم مفولن... چار ارکان ایک مصرع میں چار دوسرے میں، آٹھ ارکان سے رباعی بنتی ہے۔ ترانہ چھ ارکان کا ہوتا ہے۔ یہ رباعی کیسے ہو سکتا ہے۔''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے رباعی کے فن کی وضاحت کے لیے اپنی کتاب ''اُردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا'' میں فراق گورکھ پوری کی یہ رباعی درج کی ہے۔

پہلے مصرعے میں حسن کا خطِ جبین
اور دوسرے مصرعے میں لٹوؤں کی تزئین
چوتھا ہو نکلتا ہوا یوں تیسرے سے
جیسے بھیگی مسیں ہوں ابرو سے حسین

جدید نسیم اللغات میں رباعی کا یہ مفہوم درج ہے:

''رباعی (ع۔مو) چار مصرعوں کی نظم۔ جو مخصوص ۲۴ اوزان میں سے کسی وزن میں کہی جاتی ہے اور اس کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ ضروری ہے۔''

جہاں تک رباعی کے موضوعات کا تعلق ہے تو اس میں عام طور پر وہی

موضوعات آتے ہیں جو غزل سے وابستہ رہے ہیں۔ تاہم غزل کے مقابلے میں رباعی نسبتاً زیادہ سنجیدگی لیے ہوئے ہوتی ہے۔ سید امداد امام اثر رباعی کے موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رباعی وہ صنفِ شاعری ہے جس کے لیے حکیمانہ مضامین کی ضرورت ہے۔ شاعر کو لازم ہے کہ مسائلِ اخلاق و تمدن و معاشرت و مذہب و دیگر مضامینِ جلیلہ سے اپنے کلام کو زینت دے۔"

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں رباعی کے موضوعات کے متعلق درج ہے:

"عشق و محبت، اخلاق و تصوف، دین و دانش، حمد و نعت، پند و نصیحت، ذاتی حالات، مدح و قدح، بادہ و ساغر، نوحہ و ماتم، سیاست و معاشرت، محبوب کا سراپا اور مناظرِ فطرت رباعیوں کے عام موضوعات ہیں۔"

اسی طرح جوشؔ ملیح آبادی" "رباعیاتِ محروم" کے دیباچے میں رباعی کے موضوعات پر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یوں تو اس کے دائرے میں بے شمار موضوعات کو جگہ دی جا سکتی ہے، لیکن درحقیقت اس صنف کی تخلیق اس غرض سے ہوتی ہے کہ پختہ زندگی کے ژولیدہ و وسیع تجربات کو ہموار کر کے اور رسیدہ فکر کے عجیب و عمیق افکار کو ترتیب دے کر قلیل، لیکن بے حد جگر دار الفاظ کی معرفت ایسے استادانہ اختصار اور ایسے حکیمانہ لہجے میں ادا کیا جائے کہ اس کے جمال کے آشنا جمال پر تفصیل کا جلال، سر بہ سجود ہو کر رہ جائے۔"

ڈاکٹر عقیل احمد رباعی کے موضوعات کے متعلق رقم طراز ہیں:

"فلسفہ، اخلاق اور تصوف وغیرہ اس میں بیان ہونے والے اہم موضوعات ہیں۔ رباعی کے سرمایہ میں عشقیہ اور جمالیاتی مضامین کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔"

رباعی کے موضوعات کا دائرہ بے حد وسیع اور متنوع ہے۔ اس میں مذہبی

اخلاقی، فلسفیانہ، عارفانہ، متصوفانہ، عشقیہ، حمدیہ موضوعات کے علاوہ سماجی تصورات اور شخصی و ذاتی حالات کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

اس سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''فارسی رباعیات کی طرح، اُردو رباعیات میں بھی ہر شاعر کا ایک خاص موضوع رہا ہے اور اس نے اس موضوع کو اپنے اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہے۔ چناں چہ محمد قلی قطب شاہ کی رباعیات کا خاص موضوع عشق و محبت ہے۔ ولیؔ کی رباعیات پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ میرؔ کی رباعیات پر یاسیت اور محرومیت کی گہری چھاپ ہے۔ غالبؔ کی رباعیات میں فلسفہ کی جھلک زیادہ نمودار ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کی رباعیات سے زیادہ تر شہیدانِ کربلا کا خون ٹپکتا ہے۔ حالیؔ و اکبرؔ کی رباعیات میں بدلے ہوئے زمانے کی کروٹیں صاف نظر آتی ہیں۔ جوشؔ کی رباعیات میں شور و انقلاب کی للکار گونجتی ہے اور فراقؔ کی رباعیات میں سنگار رس کی مٹھائی پائی جاتی ہے۔''

بہرحال مختلف شعرا سے مخصوص ان خاص رنگوں سے قطع نظر بہت سے شعرا کے یہاں مختلف موضوعات بھی مل سکتے ہیں۔ مثلاً کچھ شعرا نے ریختی کی رباعیاں کہی ہیں۔ بعض نے اپنے کسی بڑے شاعر کی تقلید میں رباعیاں کہی ہیں۔ کچھ نے منظر نگاری میں اپنی رباعیاں پیش کی ہیں۔ یوں کسی صورت میں بھی موضوعات کی فہرست کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔

دیگر اصناف سخن، مثلاً قصیدہ، غزل، مثنوی اور مرثیہ کی طرح رباعی بھی فارسی سے اُردو میں آئی۔ فارسی میں کئی صدیوں تک یہ صنف فنی اور فکری سطح پر ترقی کرتی رہی اور خیامؔ جیسا رباعی گو پیدا کیا، اُردو میں جب یہ صنف آئی تو اپنے ساتھ تمام روایتیں بھی لے کر آئی۔ اُردو رباعی نے فنی اور فکری سطح پر وہ تمام روایتیں قبول کرلیں جو فارسی رباعی سے عبارت تھیں۔

اُردو کے پہلے رباعی گو شاعر کے بارے میں مختلف آرا ہیں، عام طور پر اُردو کے دو شعرا محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی ابتدائی ''رباعی گو'' کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ لیکن وجہی کی رباعیوں میں قلی قطب شاہ کی نسبت غیر مانوس الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی رباعیوں میں وہ موضوعات موجود نہیں ہیں جو عام طور پر رباعیوں میں نظم کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وجہی کے ہم عصر غواصی اور عادل شاہی دور کے شاہی اور نصرتی کے ہاں بھی چند ایک رباعیاں پائی جاتی ہیں۔

اٹھارہ ویں صدی عیسوی کے آخر میں جس دکنی شاعر نے باقاعدہ مختلف موضوعات میں رباعیاں کہی ہیں، وہ سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۴ء، ۱۷۶۳ء) ہیں۔

شمالی ہند. کے شعرا متقدمین کے ہاں بہت کم رباعیات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر زور نے سرگزشتِ حاتم میں شاہ حاتم (۱۶۹۵ء۔ ۱۷۸۹ء) کو دہلی کا پہلا شاعر تسلیم کیا ہے اور ان کی دو رباعیات بھی حوالے کے طور پر درج کی ہیں۔

مرزا علی لطف کے ''تذکرۂ گلشنِ ہند'' مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور، میں شعرا کی غزلیات، مثنویوں اور قصائد کے علاوہ رباعیات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

مرزا رفیع سودا (۱۷۰۶۔ ۱۷۸۳ء)، میر تقی میر (۱۷۲۲ء۔ ۱۸۱۰ء) اور خواجہ میر درد (۱۷۲۰ء۔ ۱۷۸۴ء) نے اگرچہ ضمنی طور پر رباعیاں کہی ہیں، تاہم ان کی رباعیوں میں ایسے شعری محاسن جمع ہو گئے تھے۔ جن سے رباعی کے امکانات کو وسیع کرنے میں خاصی مدد ملی۔ سودا کے کلیات میں کل اسی (۸۰) رباعیاں درج ہیں۔

اس دور کے دیگر شعرا میں جنھوں نے غزل اور دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ رباعی میں بھی طبع آزمائی کی، میر سوز، میر حسن، قائم چاند پوری، غمگین اور نظیر اکبر آبادی کے نام ملتے ہیں۔ ان شعرا کی رباعیات میں سادگی ملتی ہے۔ جذبات کا خلوص بھی موجود ہے۔ خاص طور سے میر کی رباعیات میں خلوص اور صداقت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

لکھنوی شعرا میں آتش، ناسخ، انشا اور جرأت وغیرہ اگرچہ اپنے مبلغ علم، جودتِ طبع، قادر الکلامی اور رنگین مزاجی کے اعتبار سے بڑے شاعر ہیں، لیکن رباعی گو کی حیثیت سے ان میں کوئی بھی سودا، میر، درد یا میر حسن کو نہیں پہنچتا۔ چناں چہ اس عہد کے شعرا کا مجموعی کلام جس طرح دوسرے عہد کے شعرا کے مقابلے میں پست اور پھیکا ہے، بالکل اسی طرح ان کی رباعیاں بھی بے مزہ اور بے رس ہیں۔

آتش اور ناسخ جیسے ہمہ گو شاعروں کے یہاں رباعی نظر نہیں آتی۔ البتہ انشا اور جرأت کے ہاں رباعیاں ملتی ہیں۔

انیس ویں صدی کے نصف اوّل کا زمانہ رباعی کی صنف کے لیے بے حد سازگار تھا کہ اس عہد میں اسے انیس، دبیر، غالب، مومن اور ذوق جیسے شعرا نصیب ہوئے۔ ان شعرا نے دیگر اصنافِ سخن کی طرح رباعی کو بھی ایک اہم اور قابلِ قدر صنفِ سخن بنادیا۔ اس دور میں پہلی مرتبہ اُردو رباعی کے مباحث کا یقین ہوا، اور عاشقانہ جذبات وصوفیانہ خیالات کے ساتھ اس میں واقعاتِ کربلا اور اس کے متعلقات و اثرات کا ذکر آنے لگا۔ لکھنوی شعرا میں انیس ودبیر نے رباعی کو نہ صرف معنوی اعتبار سے وسعت دی، بلکہ غزل، قصیدہ اور مرثیہ کی طرح اس صنف کو عوام سے روشناس بھی کرایا۔ رباعی کی اس مجلسی مقبولیت نے اس کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔ اس دور کے دہلوی شعرامیں مومن نے البتہ کثرت سے رباعیاں کہی ہیں۔ ان کی رباعیات کے متعلق ضیا بدایونی لکھتے ہیں:

"مومن کی رباعیات معیار پر پوری اترتی ہیں۔ اگرچہ اُردو کے مشہور رباعی نگاروں یعنی انیس و دبیر اور حالی کی طرح بلند نہیں۔ تاہم ہماری زبان کی عمدہ رباعیوں میں شامل کی جاسکتی ہیں۔"

انیس ویں صدی کے ربع آخر میں اُردو رباعی کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔

دور بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اُردو شاعری کے نئے امکانات کا پتا دیتا ہے۔ اس عہد میں اُردو شاعری کا محور بدل گیا اور وہ دربار اور خانقاہ سے ہٹ کر عوام کی طرف مڑ گئی۔ اس بدلے ہوئے رجحان کا سبب صرف اسلامی سلطنتوں کا زوال ہی نہیں، بلکہ اس کی تشکیل و تعمیر میں انگریزی تعلیم کا بھی زبردست ہاتھ ہے۔ ہندوستان کے نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جو راہیں سامنے آئیں، ان سے نہ صرف زندگی اور معاشرے اور فکری و تہذیبی دائرے میں، بلکہ شعر و ادب کی دنیا میں بھی بڑی دور رس تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ ادبی لحاظ سے اہم ترین بات یہ ہوئی کہ اب لکھنے والوں نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے کی سیاست اور سماج سے جوڑ کر اجتماعی زندگی کے مسائل کا عقلی حل پیش کرنا شروع کر دیا۔ ادب کی ذوقی اور تفریحی حیثیت بدل کر اسے اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا گیا۔

مولانا الطاف حسین حالؔی کے ادبی، اخلاقی اور اصلاحی کارناموں کا جائزہ لینا ہو تو ان کی نظموں کے ساتھ ان کی رباعیات کا مطالعہ بھی بے حد ضروری ہے۔ ان رباعیات کے حوالے سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

"یہ صنف جو قدمائے فارسی کے یہاں فلسفہ و حکمت اور اخلاق و معرفت کے سنجیدہ مضامین کے لیے مخصوص تھی، حالؔی کے اصلاحی مقاصد سے بے تکلف ہم آہنگ ہوگئی اور اپنے اختصار کی وجہ سے زندگی کے آخری دور میں بھی ان کا ساز بنی رہی۔"

"حالؔی کی رباعیات اس دور کی یادگار ہیں، جب زمانہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ چناں چہ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی ان کی رباعیات میں انقلابِ روزگار کے قدموں کی آہٹ صاف طور سے سنائی دیتی ہے اور قوم کی حالت کراہتی ہوئی اور سسکیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لیے حالؔی کی رباعیات قوم کا مرثیہ ہیں۔"

حالؔی کے بعد اس دور میں جس شاعر نے رباعیات میں نام پیدا کیا، وہ اکبر

الہ آبادی (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۲۱ء) ہیں۔ اکبر نے اپنے کلام میں مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ اکبر نے اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے مزاحیہ شاعری کی طرف رجوع کیا۔

اکبر کی رباعیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"اکبر کی رباعیاں جوانی گزرنے کے بعد کی تخلیق ہیں۔ ان میں زیادہ رباعیاں پند و نصائح سے بھرپور ہیں۔ یہاں تک کے فن کے تقاضوں کو عموماً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کہیں کہیں فن کی حدود میں آنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے، مگر یہ خال خال ہے۔"

☆☆☆☆☆

حبیبؔ جونپوری کا عہد اور اُردو رباعی

ہر عہد کے رباعی نگاروں نے اپنے اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات کو قبول کر کے انہیں رباعی کا موضوع بنایا۔ انیس ویں صدی کا ربع آخر اور بیس ویں صدی کی ابتدائی چھ سات دہائیاں اس اعتبار سے بے حد اہم ہیں کہ ان میں اُردو رباعی کو جس مقصدیت سے روشناس کرایا، وہ اس پورے عہد میں اپنے اثرات مرتب کرتی نظر آتی ہے، اس دور کے رباعی نگاروں نے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور قومی تقاضوں کے تحت رباعی کو پیغام رسانی کا ایک اہم ذریعہ بنایا اور قوم کی سیاسی اور اخلاقی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ اس عہد میں اُردو رباعی ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت سے سامنے آئی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"(اس دور میں) جوشؔ، امجدؔ، فراقؔ، رواں، محرومؔ اور یگانہؔ وغیرہ چند ایسے ممتاز رباعی نگار پیدا ہوگئے۔ جنہوں نے رباعی کو نظم و غزل کے قابل لا کر کھڑا کیا۔ آج جدید نظم و غزل میں جن رجحانات کی کارفرمائی ہے، ان سب کی ترجمانی رباعی میں ملے گی۔ اب تک اُردو شعر و ادب میں دو خطِ مستقیم غزل و نظم کے نام سے کھینچے جا رہے تھے۔ رباعی نے دونوں کو ملا کر مثلثی صورت قائم کردی اور آج بھی اُردو شعری ادب اس مثلثی نوعیت کا ارتقا پذیر ہے۔"

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جن شعرا کا ذکر کیا ہے، یہ سب کے سب حبیبؔ جونپوری کے معاصرین شمار ہوتے ہیں۔ ان تمام شعرا نے بیس ویں صدی میں اُردو رباعی

کو ایک اہم اور قابلِ قدر صنفِ سخن بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

شاؔد عظیم آبادی

شاؔد عظیم آبادی (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۲۶ء) کی رباعیات کا خاص موضوع تصوف اور فلسفہ ہے۔ ان کی زیادہ تر توجہ فلسفہ و تصوف، اخلاقی، اصلاحی اور عشقیہ موضوعات کی جانب مبذول رہی ہے۔ انھوں نے خمریہ رباعیات بھی کہیں، جن میں مے کش، مے خانہ، جام اور ساغر و مینا کا ذکر کیا ہے۔ ان کی رباعی پر عمر خیاؔم کے اثرات نمایاں ہیں۔

جگت موہن لال رواؔں

جگت موہن لال رواؔں (۱۸۸۹ء۔ ۱۹۳۴ء) کی رباعیات میں بھی عمر خیاؔم کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی رباعیات کا خاص موضوع فلسفہ ہے۔ لیکن فلسفہ کی آمیزش نے ان کی رباعیات کو دقیق، خشک اور بے آب و رنگ نہیں بنایا، بلکہ حسن و خوبی میں اور اضافہ کردیا ہے۔ تاہم جواں مرگی نے ان کے مزید آگے بڑھنے کو معدوم کردیا۔

بقول عبدالشکور:

"مرحوم اگر زندہ رہتے تو آسمانِ ادب پر آفتاب بن کر چمکتے۔"

فاؔنی بدایونی

فاؔنی بدایونی (۱۸۷۹ء۔ ۱۹۵۶ء) کی رباعیوں میں غم کی ترجمانی جس جس شدت سے ملتی ہے، اس سے میر تقی میؔر کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس دور کے ایک اہم رباعی نگار یاسؔ یگاؔنہ چنگیزی (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۵۶ء) ہیں۔ یگاؔنہ کی رباعیات کا ایک مجموعہ "ترانہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ان رباعیات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یگاؔنہ کو لکھنو کی زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی بیشتر رباعیات میں ضرب الامثال اور محاوروں کو نظم کیا ہے۔ انہوں نے اپنی بعض رباعیات میں شاعرانہ تعلّی سے بھی کام لیا ہے۔ جس کا مقصد اپنی شخصیت کو بلند کرنا ہی نہیں بلکہ دوسروں کو پست

کرنا بھی ہے۔

تلوک چند محرومؔ

بیس ویں صدی کے ایک اہم شاعر تلوک چند محرومؔ (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۶۵ء) صفِ اوّل کے رباعی نگار شمار ہوتے ہیں۔ ان کے مجموعہ ''رباعیاتِ محرومؔ'' کے دیباچے میں علامہ اقبالؔ لکھتے ہیں:

''رباعیاتِ محروم کا شاعرانہ معیار بہت بلند ہے۔ فلسفہ، اخلاق و روحانیت کے وہ نکتے جنھوں نے فارسی رباعیوں کو اس قدر پُرمعنی بنا دیا، ان میں جا بہ جا ملتے ہیں۔''

امجدؔ حیدر آبادی

امجدؔ حیدر آبادی (۱۹۶۱ء) اس عہد میں رباعی کے پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے اس صنف کو خصوصیت کے ساتھ اپنایا اور رباعی گوئی کے حوالے سے ممتاز ادبی حیثیت حاصل کی۔

جوشؔ ملیح آبادی

بیس ویں صدی کے معروف شاعر جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۶ء۔ ۱۹۸۲ء) نے اپنے ہم عصر شعرا میں تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ رباعیاں کہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ موضوعات کے لحاظ سے جو وسعت اور ہمہ گیری جوشؔ کے یہاں پائی جاتی ہے، وہ ان کے معاصر شعرا میں کم یاب ہے۔ انھوں نے کثرت کے ساتھ رباعیاں کہی ہیں۔ اس لیے موضوعات کے لحاظ سے ان میں خاصا تنوع اور وسعت پائی جاتی ہے۔ مذہب زندگی، جوش، وجود، غم، رندی، سرمستی، سیاست، حالاتِ حاضرہ، غرض ہر قسم کے موضوعات ان کی رباعیوں میں موجود ہیں۔ جن پر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

فراقؔ گورکھپوری

فراقؔ گورکھپوری (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۲ء) بھی اس دور کے ایک اہم رباعی گو کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کی رباعیات میں رومانیت، کہیں کہیں عریانیت کے لباس میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔

آرزوؔ لکھنوی

آرزوؔ لکھنوی نے ہر اچھے موضوع پر اتنا ہی جی لگا کر رباعی کہی ہے، جیسے کہ غزل کہتے تھے۔ ان کی رباعیوں کی خاص صفتیں، سلاستِ زبان، جدتِ ادا اور ندرتِ خیال ہے۔ عموماً ان کی رباعیوں کا موضوع اخلاق اور صرف اخلاق ہے، مگر اس میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ مختلف رباعیاں مختلف موضوعات پر ملتی ہیں۔

بیس ویں صدی اس سیاسی اعتبار سے ہمہ گیر تبدیلیوں کی صدی ہے، یہ تبدیلیاں اُردو شاعری پر بھی گہرے اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ شاعری کے روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ جدید عہد کے تقاضوں کے تحت نئے نئے مضامین شعر کے قالب میں ڈھل رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حبیب جونپوری بہ حیثیت رباعی نگار

حبیبؔ جونپوری نے نظم، غزل، قصیدہ اور گیت میں ہی طبع آزمائی نہیں کی، بلکہ انھوں نے رباعیات بھی خوب کہی ہیں۔ ان کی رباعیات میں مذہب، اخلاق اور فلسفہ کے موضوعات نمایاں ہیں۔ اہلِ بیت اور چہاردہ معصومین سے عشق ان کی رباعیات سے بھی جھلکتا ہے۔ وہ جس عہد میں زندہ تھے، اس کے تمام تقاضوں سے بھی باخبر تھے۔ ان کے پیشِ نظر وہ قوم تھی جو انقلاب کے عمل سے گزر کر اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں اس کی تابندہ روایات و اقدار، اذکار رفتہ ہو چکی تھیں اور تہذیبی پسماندگی نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ چناں چہ اس دور میں حبیبؔ جونپوری شاعری کا ایک واضح تصور لے کر آگے بڑھے۔ شاعری کا یہ تصور ان کی نظموں اور قطعات میں بھی نظر آتا ہے اور رباعیات میں بھی حبیبؔ جونپوری سمجھتے ہیں کہ جس طرح شمشیر سے نوازش کی تمنا رکھنا یا کسی بدبخت سے یہ امید رکھنا کہ اسے سفارش کی توفیق ہوگی، بے جا ہے اور کوئی شاعر بھی تب تک نہیں بن سکتا جب تک کہ اس میں ژرف نگاہی پیدا نہ ہو جائے، کیوں کہ جب تک بادل نہ ہوں، بارش کیسے ہو سکتی ہے۔ اس نظریے کی ترجمانی ان کی رباعیات میں اس طرح ہوتی ہے:

شمشیر سے امیدِ نوازش کیسی
بدبخت سے توفیقِ سفارش کیسی
شاعر ہے تو کر ژرف نگاہی پیدا
جب ابر نہیں ہوگا تو بارش کیسی

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۷)

چناں چہ شاعری کا یہی وہ تصور ہے جو حبیبؔ جونپوری کی تمام رباعیات میں ہمیں نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں شاعری کا ایک متعین مفہوم موجود ہے جو ان کے مذہبی معتقدات، سماجی شعور اور گہرے مشاہدے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ حبیبؔ جونپوری کے ہاں شاعر کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ دوسروں کی بھلائی کر سکے کام آسکے۔ ان کے دکھ درد کو مٹا سکے۔ حبیبؔ جونپوری سمجھتے ہیں کہ شاعر کو دل داریٔ انسان کا ماہر ہونا چاہیے۔ جو دکھی لوگ ہوں، مصیبت زدہ ہوں تو شاعر تو دیکھتے ہی ان کے دکھ اور درد کم ہو جانے چاہئیں۔ اس سلسلے میں حبیبؔ جونپوری لکھتے ہیں:

دلداریٔ انسان کا بڑا ماہر ہے
ہر چوٹ بھلا دینے پہ تو قادر ہے
ایسا ہو ترا راہ میں رفتار کا ڈھنگ
جو دور سے دیکھے تو کہے شاعر ہے

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۸)

حبیبؔ جونپوری کے ہاں اصل اہمیت خلوص اور جذبِ دل کی ہے، جس کے بغیر شاعری اثر انگیزی سے محروم ہو جاتی ہے اور اپنے مقاصد سے دور رہتی ہے۔ یہ وہی خلوص ہے جسے غالبؔ نے ''دل گرفتہ'' کہا ہے۔

حبیبؔ جونپوری کی رباعیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں رباعی کے فن پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ رباعی کے مخصوص فنی تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ چناں چہ انھوں نے اسلوب و اظہار کے معاملے میں رباعی کے فنی تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ رباعی کا مزاج دراصل ایسا ہے جس میں سو بات کی ایک بات کہی جاتی ہے، لیکن یہ ایجاز و اختصار اس وقت تک پیدا ہو ہی نہیں سکتا، جب تک اس کی تہوں میں فنی شعر کے ساتھ فکری خلوص بھی موجود نہ ہو۔

حبیبؔ جونپوری کے پیشِ نظر قوم کی سماجی، تہذیبی اور اخلاقی اصلاح کے مقاصد تھے۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ جب تک دل نگینہ کی طرح صاف نہ ہو، اور ہیرے کی طرح چمک دار نہ ہو، اور انسان کے اندر محبت ایسی چیز نہ ہو تو وہ شعر نہیں کہہ سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت اس کی فرماں برداری دل میں ہو تو شعر حدیث کی طرح اس کے دل پر نازل ہوتے ہیں۔ اس خیال کو ایک رباعی میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

شاعر ہے تو دل کر لے نگینوں کی طرح
بازارِ وفا میں رہ تو ہیروں کی طرح
دل میں ہوا اگر حبِ الٰہی کا جمال
اشعار نکلتے ہیں حدیثوں کی طرح

(کلیاتِ حبیب ص ۱۵۸)

حبیبؔ جونپوری کی رباعیات کا معیار بہت بلند ہے۔ فلسفہ، اخلاق اور روحانیت کے وہ نکتے جنہوں نے فارسی رباعیوں کو اس قدر پُرمعنی بنادیا، ان میں جابہ جا ملتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ان کی زیادہ تر رباعیات کا مزاج، مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ خیال کی پاکیزگی، بیان کی روانی، عام جذباتِ انسانی کی ترجمانی، تلقین حبیبؔ جونپوری کی رباعیات کی اہم خصوصیات ہیں۔ موضوعات کے حوالے سے ہم حبیبؔ جونپوری کو رباعیات کو درج ذیل اقسام میں ترتیب دے سکتے ہیں۔

مذہبی رباعیات، اخلاقی رباعیات، فلسفیانہ رباعیات، ذاتی رباعیات

مذہبی رباعیات:

خدا کے بعد جن ہستیوں کو حبیبؔ جونپوری اس پوری کائنات کا محور و مرکز سمجھتے ہیں، وہ چہاردہ معصومین ہیں۔ ان کے بغیر اس کائنات کی تخلیق کا کوئی جواز نہیں۔ حبیبؔ جونپوری کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نمودِ کبریائی کی تکمیل اور اپنی جلوہ نمائی کے لیے حضور کو

پیدا کیا اور انہیں اپنی نبوت دے دی۔ تمام انبیاؑ کے لیے خاتم النبیین بنایا۔ حبیبؔ جونپوری آگے کہتے ہیں کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کو امامت عطا کی۔ انھیں اوسط کا محمد کہا ہے اور حضرت امام مہدی علیہ السلام کو آخر کا محمد کہا ہے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ہی غیبت عطا کر دی۔ اس نظریے کو ایک رباعی میں اس طرح پیش کیا ہے۔

اوّل کے محمد کو نبوت دے دی
اوسط کے محمد کو امامت دے دی
آخر کے محمد کو خدا کیا دیتا
کچھ دن کو سہی اپنی ہی غیبت دے دی

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۶۰)

اس رباعی میں حضور اکرمؐ کی نبوت کے بعد آئمہ طاہرین علیہ السلام کے متعلق بتایا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سے لے کر حضرت امام مہدی علیہ السلام آخر الزمان تک بارہ آئمہ بنائے ہیں اور حضرت امام مہدی علیہ السلام کو غیبت عطا کی ہے، کیوں کہ عقیدۂ اثنا عشری میں حضرت امام مہدی علیہ السلام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ امامِ عصر ہیں۔

وہ زندہ ہیں، مگر عالمِ غیب میں ہیں اور بہ حکمِ پروردگار ایک دن ظہور فرمائیں گے۔ اسی لیے اس رباعی میں آخری مصرعے میں کہا گیا ہے کہ کچھ دن کو سہی اپنی ہی غیبت دے دی۔

حضرت علی علیہ السلام سے حبیبؔ جونپوری کو عشق تھا۔ اس لیے انہوں نے بیشتر قصائد بھی ان کی مدح میں لکھے ہیں اور رباعیات بھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بغیر حکمِ الٰہی سے ایک پتّا بھی نہ ہل سکتا۔ نہ ہی یہ پھول اور کلیاں بن سکتے ہیں، نہ ہی اس کائنات کی کوئی اور شے، تو ولی بھی اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں بن سکتا اور جہاں اطاعت و فرماں

برداری، شجاعت و دلیری اور یقینِ کامل اور دل کو اکٹھا کردیا جائے تو حضرت علی علیہ السلام کی ذاتِ اقدس بنتی ہے۔

اس بات کو اپنی رباعی میں بڑی ہی خوبصورتی سے یوں کہتے ہیں:

خود کوئی نہ گل اور نہ کلی بنتا ہے
اللہ بنائے تو ولی بنتا ہے
اطاعت ہو، شجاعت ہو، یقین ہو، دل ہو
یہ وصف ہوں یکجا تو علیؑ بنتا ہے

انھوں نے اپنی رباعیات میں اس بات پر زور دیا ہے کہ خدا کے احکامات اور چہاردہ معصومین علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ پر چل کر ہی انسان دنیا اور آخرت میں فلاح پاسکتا ہے اور چہاردہ معصومین علیہ السلام کی محبت ہی ہمیں خدا کے قریب لے جاسکتی ہے۔ اس طرح حبیبؔ جونپوری مسلمانوں کو ایک ایسا راستہ دکھا رہے ہیں جس پر چل کر وہ دین اور دنیا کی بھلائی حاصل کرسکتے ہیں اور آخرت میں سرخ رو ہوسکتے ہیں۔

فلسفیانہ رباعیات:

حبیبؔ جونپوری کے ہاں زندگی کا ایک باقاعدہ فلسفہ موجود ہے۔ ان کے نزدیک یہ بچپن، بڑھاپا سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ موت کو ہمیشہ انسان کو یاد رکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اسے فطرت کے ان مظاہر سے سبق حاصل کرنا چاہیے جو زندگی میں موجود ہیں۔ دن رات کا آنا جانا، دن مہینے سال گزرنا اور ہر انسان کا ایک دن اس جسم کے قفس سے آزاد ہوجانا، یہ انسان کی کل حقیقت ہے۔ اس لیے انسان کو ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ زندگی چار روزہ ہے۔ اس لیے ایسی موت کی تمنا کی جائے جو حیاتِ جاوداں کی بنیاد بن جائے۔ اس کے لیے وہ سمجھتے ہیں کہ خدمتِ خلق کے ذریعے عاقبت

سنواری جائے۔ ورنہ اگر انسان یہ سمجھے کہ وہ یہاں ہمیشہ رہے گا تو ذرا اپنی زندگی کے ایام پر نظر دوڑائے اور بچپن اور بڑھاپے کو ملا کر دیکھے کہ اس کی حقیقت دراصل کیا ہے۔ اس نظریے کو اپنی ایک رباعی میں یوں پیش کرتے ہیں۔

یادوں کا ہر ایک نقش سجا کر دیکھو
آئینۂ ایام اُٹھا کر دیکھو
ہو جائے گی انساں کی حقیقت معلوم
بچپن کو بڑھاپے سے ملا کر دیکھو

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۹)

حبیبؔ جونپوری کے نزدیک خدا پر کامل یقین، اس کی وحدانیت کا اقرار، انسان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے تمام کمالات سے انسان کی نظر کو نوازتا ہے۔ بس یقین ہونا چاہیے کہ انسان اگر شک میں مبتلا ہو جائے اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق مختلف خیالات کو جگہ دے تو اسے ''ہبل'' اور ''لات'' ملتے ہیں۔ اس لیے انسان کو اپنی سوچ و فکر میں شکوک کو جگہ نہیں دینی چاہیے، بلکہ یقین کی آخری منزل تک پہنچنا چاہیے وہ کہتے ہیں۔

نظروں کو خدا کے سب کمالات ملے
سو بار تیقن کے خیالات ملے
مشکوک نہ ہو اک پل کو بھی فکرِ بشر
اُٹھا جو یقین ''ہبل'' ملے ''لات'' ملے

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۷)

اخلاقی رباعیات:

حبیبؔ جونپوری کی اخلاقی رباعیات ان کے اصلاحی مقاصد کی ذیل میں آتی ہیں۔ جن کے ذریعے وہ قوم کو اخلاقی اعتبار سے تن درست و توانا بنانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک قوم میں پیدا ہونے والی اخلاقی بیماریوں کا اصل سبب مذہب سے دوری ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان اپنی روایات و اقدار سے بیگانے ہو چکے ہیں۔ چناں چہ حبیبؔ جونپوری اخلاقیات کے حوالے سے حقوق العباد کرنے کا درس دیتے ہیں۔ حبیب جونپوری جس معاشرے کے فرد تھے، وہ اپنے خیال و کردار کے حوالے سے تضادات کا شکار تھا۔ معاشی ناہمواری کے ساتھ ساتھ سماجی قدریں بھی ناپید ہو چکی تھیں۔ انگریزوں کی طویل غلامی نے احساسِ کمتری پیدا کر دیا تھا، حبیبؔ جونپوری نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کے مرض کی تشخیص کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر یہ لوگ ذرا سی کوشش سے اپنے معمولاتِ زندگی اور طریقہ ہائے حیات میں توازن پیدا کرلیں اور ہر انسان بولنے سے پہلے دیکھے کہ جو کچھ وہ کہنے جا رہا ہے، اس سے کسی کو تکلیف نہیں تو پہنچ رہی۔ وہ اپنے موتیوں جیسے الفاظ کو خذف کی طرح تو نہیں رول رہا۔ اس کا دل صاف ہو، کسی کے لیے کینہ، حسد نہ ہو، اور آئینے کی مانند ہو تو مسلمانوں کو اس مرض سے نجات مل سکتی ہے۔ کہتے ہیں۔

آئے ہوئے لب پہ لفظ تولے گا
موتی نہ کبھی مثلِ خذف رولے گا
لازم ہے کہ دل ہو آئینے کی مثل
آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۷)

حبیب جونپوری سمجھتے ہیں کہ انسان کا یہ فریضہ ہے کہ دوسروں کے کام آئے۔ انسانیت کی معراج یہ ہے کہ اگر بڑھاپا کچھ مانگے تو جوانی اس کو دے دو۔ اگر طبیعت مغموم ہو تو اس کو روانی دے دو۔ اگر کھیت کی آغوش سبزے سے خالی ہوجائے تو ہوا دے دو، اور اگر ہوا تمہارے قبضے میں نہیں تو اس کو پانی ہی دے دو، تاکہ اس کی شادابی واپس لوٹ آئے۔ کہتے ہیں۔

مغموم طبیعت کو روانی دے دو
پیری جو طلب کرے جوانی دے دو
جب کھیت کی آغوش ہو سبزے سے تہی
قبضے میں نہیں ہوا تو پانی دے دو

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۸)

ذاتی رباعیات:

حبیب جونپوری اس معاشرے کا فرد تھے۔ جہاں روز نت نئے حادثات انسان کو پیش آتے رہتے ہیں۔ یہاں زندگی میں محبت بھی ہے اور نفرت بھی۔ دل بھی ہے اور دل والے بھی۔ جذبات اور احساسات بھی ہیں اور دل کو شیشہ سمجھ کر توڑنے والے بھی۔ حبیب جونپوری اپنے محبوب کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے میرا دل لے کے میرا درد مجھے فروخت کردیا۔ غم اَن مول تھے، یعنی دل لے لیا اور اَن مول غم جو کبھی نہ ختم ہونے والا ہے، وہ دے دیا۔ لیکن مجھے ہر موڑ پر محبت اور الفت کا سبق دے کر اس نے میری ہستی کا اصل سبب مجھے بتادیا۔ مجھ پر افشا کردیا۔ کہتے ہیں۔

دل لے کے مرا درد مجھے تول دیا
انمول لیا مال اور انمول دیا

دے کے ہر اک گام پہ الفت کا سبق

تو نے مری ہستی کا سبب کھول دیا

(کلیاتِ حبیب۔ص ۱۵۴)

حبیبؔ جونپوری سمجھتے ہیں کہ محبت کرنا، دراصل موت کا سامان خریدنا ہے اور میں نے یہ زہر خود دانستہ اپنی زندگی میں گھولا ہے اور اپنے دوستوں سے کہتے ہیں کہ مجھے ایک مردہ بدست زندہ سمجھو، کیوں کہ میں دوستوں کی خاطر سے ہنس بول لیتا ہوں۔ اس کو رباعی میں یوں کہتے ہیں۔

الفت نہ کی سامانِ اجل مول لیا

یہ زہر سا ہستی میں خود گھول لیا

سمجھو مجھے اک مردہ بدستِ زندہ

احباب کی خاطر سے جو ہنس بول لیا

(کلیاتِ حبیب۔ص ۱۵۷)

ان رباعیات میں حبیبؔ جونپوری نے اپنی ذات کے حوالے سے بات کی ہے۔ ان میں انہوں نے غم و آلام کا ذکر کیا ہے جو ایک شاعر اور حساس دل رکھنے والے انسان کا مقدر ہوتے ہیں۔

مجموعی جائزہ:

حبیبؔ جونپوری کی رباعیات کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیس ویں صدی میں جن شعرا نے رباعی کو ایک صنف کے طور پر اختیار کیا اور اس کی طرف خاص توجہ دے کر اسے ایک قابلِ لحاظ صنف بنادیا۔ ان میں حبیبؔ جونپوری کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ حبیبؔ جونپوری نے اگرچہ رباعیات کم کہیں

ہیں، مگر پھر بھی اپنے اسلوب کے ذریعے ایک دل کشی اور رعنائی پیدا کی ہے۔ اس دور میں جوشؔ، فراقؔ، فانیؔ، امجدؔ حیدرآبادی اور آرزوؔ لکھنوی جیسے بڑے بڑے رباعی نگار موجود تھے۔ حبیبؔ جونپوری کی رباعی اس پایے کی تو نہیں، بہرحال اسے بالکل فراموش بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ ہر شاعر کا اپنا دائرۂ خیال اور حیطۂ احساس ہوتا ہے۔

حبیبؔ جونپوری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے رباعی کو اس کے مخصوص مزاج کے بہت قریب رکھا ہے۔ رباعی کا مخصوص مزاج حکمت و دانائی، اخلاقی اقدار کے بیان اور مقاصدِ جلیلہ کے اظہار سے ترتیب پاتا ہے۔ اس عہد کے اکثر رباعی نگار، رباعی کے مخصوص مزاج کے برعکس اسے عشق و محبت، تغزل اور روحانیت کی رنگین وادیوں کی سیر کراتے ہیں۔ حبیبؔ جونپوری کے ہاں ایسا نظر نہیں آتا۔ حبیبؔ جونپوری کا تعلق جس عہد سے تھا، اس کے تقاضے بھی کچھ اس قسم کے تھے کہ شاعری میں روایتی قسم کے موضوعات کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ اسی لیے حبیبؔ جونپوری نے اپنی شاعری کا رخ بھی اس سمت موڑ دیا جو فلاح و ترقی اور ایک روشن مستقبل کی سمت تھی۔ حبیبؔ جونپوری نے اپنے معتقدات کے حوالے سے قصیدہ نگاری، رباعیات اور قطعات کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے انتہائی سادہ اسلوب اختیار کیا۔ ان کی رباعیات میں پند و موعظت بھی ہے اور اخلاق کی تلقین بھی، حسرت خیزی بھی اور فلسفہ بھی۔ سوز و گداز بھی ہے اور درد و اثر بھی۔ اسلوب کی ان تمام جہتوں نے ان کے موضوعات کو ترفع اور خیال کی پاکیزگی عطا کی ہے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ حبیبؔ جونپوری ایک منفرد اور صاحبِ طرز رباعی نگار ہیں۔ کہیں کہیں ان پر حالیؔ کا اثر نظر آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

قطعہ

مفہوم

جدید نسیم اللغات میں قطعہ کے معنی یہ درج ہیں:

"قطعہ (ع۔ مذ) ٹکڑا۔ اراضی کا حصہ، پرزہ، پرچہ، دو یا دو سے زیادہ، بے مطلع بیتیں، جن کا مضمون ایک دوسرے سے مسلسل ہو۔ خوشنویسوں کے پورے صفحے پر جلی لکھی ہوئے دو شعر، جو اکثر فریم کر کے زینت کے لیے لگائے جاتے ہیں، ایسے ہی شعر چھپے ہوئے۔"

ڈاکٹر سلیم اختر قطعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"عربی الاصل قطعہ کو جداگانہ صنفِ سخن تسلیم کرنے میں جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے منفرد ہیئت کا حامل نہ ہونے کی وجہ سے یہ جداگانہ تشخص سے محروم ہے اور نہ ہی موضوع یا اسلوب کا کوئی خاص انداز اس سے مخصوص نظر آتا ہے۔ اساسی طور پر قصیدہ اور غزل کا ایک ٹکڑا تھا اور یہی اس کے لغوی معنی ہیں۔"

فرہنگِ آصفیہ میں (جلد سوئم میں) قطعہ کے معنی یہ ہیں:

"قطعہ (ع۔ اسم مذکر) (۱) ٹکڑا، پارہ، جزو، حصہ، بھاگ، کھنڈ،

(۲) پرزہ، پرچہ، جیسے یک قطعہ خط،

(۳) ملک کا حصہ، سرزمین، خطہ دیار، ملک دیس،

(۴) مطلع کے سوا باقی غزل یا قصیدہ کا ایک حصہ جو متفق المضمون اور کم سے کم دو شعر ہوں، دو بیتوں یا اس سے زیادہ کو جو با مطلع ہوں یا بلا مطلع مگر مضمون میں ایک دوسرے سے متعلق ہوں قطعہ کہتے ہیں۔"

المنجد (عربی اُردو) میں قطعہ کے معنی یہ درج ہیں:

القطعۃ من الشعر، سات یا دس یا اس سے کم اشعار۔"

مندرجہ بالا مفاہیم کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں یہ ایک صنفِ شعر ہے، جس میں قوافی کی ترتیب قصیدے یا غزل کے مطابق ہوتی ہے، یعنی تمام اشعار کے مصرع ہائے ثانی ہم قافیہ ہوتے ہیں، لیکن غزل اور قصیدے کے برعکس قطعے میں مطلع نہیں ہوتا اور مقطع ضروری نہیں۔ قطعہ کے لیے کم از کم دو شعروں کا ہونا ضروری ہے۔ زیادہ سے زیادہ اشعار کی کوئی قید نہیں۔ البتہ غزل کی طرح قطعے کا طول بھی دس بارہ شعروں تک ہی مناسب سمجھا جاتا ہے۔ قطعات میں عام طور پر ردیف سے کام نہیں لیا جاتا۔ چناں چہ خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"قطعات میں ردیف کا استعمال شاذ ہے، کیوں کہ خصوصاً لمبی ردیف مسلسل گوئی کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔"

یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنے والی ہے کہ اگرچہ قطعے کے لیے مصرعوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں رہی۔ یہ مصرعوں کی کسی بھی جفت تعداد پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ لیکن اخبارات میں قطعے کے رواج کے نتیجے میں یہ چار مصرعوں پر ہی محدود ہوکر رہ گیا اور اب اخبارات میں جتنے بھی قطعات دکھائی دیتے ہیں، ان میں چار ہی مصرعے ہوتے ہیں۔

چار مصرعوں کی وجہ سے قطعے اور رباعی میں ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔

اگرچہ رباعی کے لیے مخصوص بحر مقرر ہے اور اس میں مضامین بھی مخصوص نوعیت کے بیان کیے جاتے رہے ہیں، لیکن اب یہ فرق کچھ کم ہوگیا ہے۔ اب سمجھا جاتا ہے کہ چار مصرعوں پر مشتمل نظم اگر تو مخصوص بحر میں ہوگی تو رباعی ہے، ورنہ قطعہ ہوگا۔

غزل پر بے ربطی اور ریزہ خیالی کے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، قطعہ پر ویسا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کیوں کہ قطعہ کے تمام اشعار معنوی اعتبار سے باہم مربوط ہوتے ہیں۔ مضمون متحد ہوتا ہے اور اچھے قطعوں میں پہلے شعر سے لے کر آخری شعر تک معنوی ارتقا بھی ملتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قطعہ کے دامن میں مدح وستائش، شکر و سپاس، گلہ و اعتذار، ہزل و ہجو، طنز و مزاح، حکایت و لطائف، اخلاق و حکمت، نوحہ و ماتم، پند و موعظت بھی کی گنجائش موجود ہے اور شعرا نے اس گنجائش سے فائدہ بھی اُٹھایا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا قطعہ کے موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قطعہ ایک قدیم صنفِ سخن ہے اور اس میں کسی خاص موضوع پر طبع آزمائی کی قید نہیں ہے۔''

مسلسل غزل آخر غزل ہے۔ قطع کو مسلّم غزل سے جو خصوصیت ممتاز کرتی ہے، وہ ہے مفہوم کا تدریجی ارتقا۔ مسلسل غزل میں مفہوم کا اتحاد تو ہوتا ہے، تدریجی ارتقا بالعموم نہیں ہوتا، یعنی شاعر ایک مضمون یا کیفیت کو پیرایہ بدل بدل کر مختلف روپ دیتا چلا جاتا ہے، جب کہ قطع میں تدریجی ارتقا ہوتا ہے۔ قطع میں ہر شعر مفہوم کا ایک ٹکڑا بیان کرتا ہے اور وہی ٹکڑا بیان کرتا ہے جو مفہوم کے تدریجی ارتقا میں اس کا حصہ ہے۔ اس لیے قطعہ کے اشعار میں ربط و تسلسل کے مقابلے میں زیادہ گہرا اور ناگزیر ہوتا ہے۔

فارسی میں انوریؔ، سعدیؔ اور ابن یمینؔ کے قطعات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ابتدائی دور کی اُردو شاعری میں قطعہ بہ طور علیحدہ صنفِ سخن کے دکھائی نہیں دیتا۔

تاہم غزلوں کے درمیان قطعہ بند کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ اب ذرا قطعہ بند کی تعریف اور مفہوم پر بھی غور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین قطعہ بند کے متعلق لکھتے ہیں:

"غزل باوجود غزل ہونے کے کبھی کبھی قطعہ کی امداد چاہتی ہے۔ جب کسی مسلسل مضمون کو ایک شعر میں ادا ہوتے نہیں دیکھتی تو قطعہ کا سہارا لے کر آگے بڑھتی ہے۔"

فرہنگِ آصفیہ جلد سوئم میں قطعہ بند کے یہ معنی درج ہیں:

"قطعہ بند (ع+ ف۔ اسم مذکر) دو بیتیں، جن کے معانی متصل کی بیت ملائے بغیر تمام نہ ہوں، بلکہ بے نتیجہ رہیں۔"

ڈاکٹر سلیم اختر قطعہ بند کے متعلق لکھتے ہیں:

"غزل میں دو یا دو سے زائد اشعار قطعہ بند کہلاتے ہیں۔ جیسے مرزا سوؔدا کی تیس اشعار کی اس غزل

وہی جہاں میں رموزِ قلندری جانے
بھبھوت تن پہ جو ملبوس قیصری جانے

میں سے ۱۲ اشعار قطعہ بند ہیں۔ مقطع میں سوؔدا نے تعلّی کی

غرض یہ وہ غزل قطعہ بند ہے سوؔدا
کہ اس کی قدر کوئی کیا جز و انوریؔ جانے

جدید نسیم اللغات میں قطعہ بند کے معنی یوں لکھے ہیں:

"قطعہ بند (مذ) وہ اشعار جن کے معنی تسلسل باقی رکھنے کی صورت میں نامکمل ہوں۔"

ایسا قطعہ جو غزل یا قصیدہ میں شامل ہو، اصلاح میں قطعہ بند کہلاتا ہے۔ ایسے قطعے کو غزل یا قصیدے کے باقی اشعار سے الگ کرنے کے لیے اُسے ”ق“ کی علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ علامت قطعہ بند کے آغاز میں دی جاتی ہے اور جہاں قطعہ بند ختم ہوتا ہے وہاں ایک لکیر لگا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قطعہ بند کے اشعار معنوی اعتبار سے باہم مربوط ہوتے ہیں۔ معنوں کی اکائی شعر نہیں قطعہ بند ہوتا ہے۔ شعرا نے بالعموم قطعہ بند کو مقطع سے پہلے جگہ دی ہے جیسا کہ غالبؔ کا یہ مشہور قطعہ بند ان کی ایک غزل کے مقطع سے پہلے آیا ہے۔

اے تازہ واردان بساط ہوئے دل
زنہار اگر تمھیں ہوس ناؤ و نوش ہے

مولانا حالیؔ نے ”فسانہ ہرگز، چراتا ہرگز“ کی ردیف و قوافی میں دہلی مرحوم کا جو مرثیہ لکھا ہے، وہ اس غزل میں قطعہ بند کے طور پر آیا ہے، جس مطلع ہے:

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا، نہ لگانا ہرگز

☆☆☆☆☆

اُردو میں قطعات نگاری

ماہرینِ فن نے اُردو قطعہ نگاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

(۱) دکنی دور

(۲) شمالی ہند کا دور

(۳) جدید شاعری کا دور

(۱) دکنی دور:

پہلے دور کو دکنی دور کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جس میں شعرا کی بہت قلیل تعداد ایسی ہے جس نے قطعات لکھے۔ ان میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور قاضی محمود بحریؔ کے علاوہ ولیؔ دکنی کے نام شامل ہیں۔

(۲) شمالی ہند کا دور:

قطعات نگاری کا دوسرا دور شمالی ہند سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تاہم اس دور میں بھی قطعہ بند غزلیں تو بے شمار ہیں، لیکن قطعہ کو علیحدہ صنف کے طور پر کم ہی لکھا گیا ہے۔ قطعہ بند غزلیں لکھنے والوں میں حاتمؔ کے علاوہ میرؔ و سوداؔ، قدرتؔ اور فغاںؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ دیگر مشہور شعرا میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور شیفتہؔ وغیرہ نے بھی اسی

روایت کی پیروی کی اور گو قطعہ کو علیحدہ صنف کے طور پر نہیں اپنایا، البتہ غزلوں میں قطعہ بند لکھتے رہے۔ لکھنوی دبستان کے شعرا نے بھی قطعات نگاری پر کم ہی توجہ دی، البتہ جرأت، انشا اور میر حسن وغیرہ کے ہاں قطعہ بند غزلیں ملتی ہیں۔

دہلوی دور

دہلوی دور کے اواخر میں داغ اور امیر نے قطعہ کو علیحدہ طور پر لکھنے کی سعی کی۔ ان کے علاوہ نظیر اکبر آبادی اور راسخ عظیم آبادی وہ شعرا ہیں جنہوں نے قطعہ کو علیحدہ طور پر بھی لکھا ہے اور قطعہ بند میں بھی۔ تاہم یہ بھی بروزنِ بیت ہی کے طور پر تھا اور اُن شعرا میں سے کوئی بھی قطعہ لکھنے میں سنجیدہ نہ تھا۔

(۳) جدید شاعری کا دور

نئی نظم کا رواج ہونے سے ان ہیئتوں پر بھی توجہ دی گئی جو اُردو زبان میں موجود تو تھیں لیکن نظر انداز کی جا رہی تھیں۔ نیچرل شاعری سے متاثر ہوتے ہوئے حالی نے اس طرف توجہ کی اور کثیر تعداد میں قطعات لکھے۔ حالی شاعر سے زیادہ مصلح تھے۔ چناں چہ قدرتی طور پر اُن کے قطعات پر اصلاح کا پہلو نمایاں انداز سے چھایا ہوا ملتا ہے۔ حالی کے تتبع میں شعرا کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوگئی، جس نے قطعات لکھنے شروع کیے۔ ان میں احسن مارہروی، اسماعیل میرٹھی، شاد عظیم آبادی اور ثاقب لکھنوی کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ اقبال، سیماب اکبر آبادی، شبلی، چکبست اور وحید الدین سلیم کے نام بھی اس حوالے سے معروف ہوئے۔ اسی روایت کے ایک مضبوط ستون اکبر الہ آبادی بھی ہیں۔ اگر چہ قطعات نگاری کے فن پر اصلاح کا پہلو شروع ہی سے حاوی ہوگیا تھا، لیکن دیگر موضوعات بھی سامنے آئے۔ اخباروں کی ریل پیل کے نتیجے میں سیاسی قطعہ نگاری کو بے حد فروغ نصیب ہوا، اور ہر اخبار میں ایک قطعہ نظر آنے لگا۔ چناں چہ سیاسی

قطعات کی روایت بہت امیر ہو گئی۔ اس کے علاوہ طنزیہ اور مزاحیہ قطعات کی بھی کمی نہیں رہی۔ عشق و عاشقی، رند و مستی، تصوف و معرفت کے موضوعات بھی قطعات میں اپنائے گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد کم ہے۔

قطعہ نگاری میں ظفر علی خاں، جوش، احسان دانش، فیض، اختر انصاری اور احمد ندیم قاسمی کے قطعات کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

☆☆☆☆☆

حبیبؔ جونپوری کی قطعہ نگاری

حبیبؔ جونپوری کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک رنگ بہ حیثیت قطعہ نگار بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ انہوں نے بے شمار قطعات متنوع موضوعات پر لکھے۔ تاہم ہمیں کل سترہ قطعات دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کچھ قصائد میں بھی قطعہ بند اشعار موجود ہیں۔ جیسا کہ اُن کا قصیدہ ''قصیدہ در مدح علی عقدہ کشا'' میں قطعہ بند اشعار موجود ہیں۔ حبیبؔ جونپوری کے قطعات کسی خاص موضوع تک محدود نہیں ہیں۔ مذہبی، شخصی، اخلاقی، سماجی اور روایتی، غرض کہ ہر موضوع پر اُن کے قطعات موجود ہیں۔ موضوعات کا یہ پھیلاؤ حبیبؔ جونپوری کی وسیع النظری اور وسعتِ مشاہدہ پر دال ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ قطعات چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ حبیبؔ جونپوری نے کچھ شخصی قطعات بھی لکھے۔ یہ قطعات حبیبؔ جونپوری کی شعری استعداد اور ہنر مندی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اُن کے قطعات کو ہم بلحاظ موضوع مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ مذہبی قطعات

۲۔ ذاتی قطعات

۳۔ متفرق قطعات

ا۔ مذہبی قطعات

جیسا کہ مختلف ابواب (قصائد، رباعی) وغیرہ میں بتایا گیا ہے کہ حبیبؔ جونپوری ہاشمی سید تھے اور آئمہ اثنا عشری پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اُن کے متعدد اشعار، قصائد، رباعیات اور قطعات سے بھی اُن کے مذہبی عقائد کا اظہار ہوتا ہے۔

حبیبؔ جونپوری کو پیغمبرِ اسلامؐ، حضرت علی علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام، حضرت امام حسن علیہ السلام اور دوسرے تمام آئمہ علیہ السلام سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ یہی عشق اُن کے قطعات میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔

دینی روایات میں مابعد الطبیعیاتی صداقتوں پر ایمان اور اُن کے ساتھ طہارت اور تقدس کے تصورات کی وابستگی، روایت کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو اُن صداقتوں اور اُن سے وابستہ طہارت، تقدس اور برکتوں کی تجسیم ہے، یعنی ایسی شخصیات کا وجود جو صداقتوں کے ہم پلہ ہیں۔ مذہبی معتقدات میں ان دونوں کو یکساں اہمیت ہے۔ صداقتیں مذہب کے تہذیبی محرکات کا درجہ رکھتی ہیں، جب کہ شخصیات ایک طرف تو تشبیہی محرکات کی ضامن ہیں اور دوسری طرف تنزیہہ کا بدل ہیں۔ ایسی شخصیات تمام مذاہب میں اہم حیثیت کی حامل ہوتی ہیں کہ وہ صداقتوں کا عملی پہلو نمایاں کرتی ہیں۔

کردار کی تعمیر میں مقدس شخصیتوں کا حصہ مقدس صداقتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ عام انسان انہی مقدس شخصیتوں کے حوالے سے ہی صداقتوں کا ادراک کرتے ہیں۔ ان مقدس شخصیتوں کے تتبع اور اُن کی تقلید سے وہ اپنی جبلی آلائشوں کو پاک کرتے ہیں اور انہیں کے حوالے سے اپنے لیے ایک مثالی زندگی کا تصور قائم کرتے ہیں۔ ذات اور شخصیت کی یہ تربیت اور تہذیب معتقدات کی بدولت ہی ہوتی ہے اور اسی لیے انسانی زندگی میں عقیدے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ایک اور چیز جس نے انسان کی باطنی تہذیب کی ہے، شاعر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُسے ہماری روایت میں "جزوِ پیغمبری" بھی بتایا گیا ہے، یونانیوں نے تہذیب نفس کی بنیاد ہی اصول توازن پر رکھی تھی، شاعری کی بنیادی بھی اسی اصول توازن پر ہے۔ شاعری نے بھی انسانوں کی باطنی تربیت و تہذیب کے لیے بہت کام کیا ہے۔ گو اس کا دائرۂ اثر مذہب کے مقابلے میں کم رہا ہے۔ معتقدات کی قوت اور تاثیر شاعری کی قوت اور تاثیر سے زیادہ ہوتی ہے اور شاعری کے مقابلے میں اس نے انسانوں کی زیادہ بڑی تعداد کو متاثر کیا ہے۔

مگر ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شاعری اور عقیدہ دونوں یک جا ہوجائیں۔ جی ہاں! ہوسکتی ہے، یہ صورت دو طرح نمایاں ہوسکتی ہے۔ ایک یوں کہ عقیدہ پس منظر میں رہے اور شاعری کے لیے توانائی مہیا کرے۔ دوسری یوں کہ شاعری عقیدے کے اظہار کے لیے ذریعہ بن جائے۔ دوسری صورت میں شاعری کی حیثیت ثانوی ہوجائے گی اور عقیدہ بہ حیثیت مقصد شاعری پر حاوی ہوجائے گا۔ اس کے باوجود ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ ایسی صورت میں عقیدے اور شاعری دونوں کی ملی جلی قوتوں سے سروکار ہوتا ہے، ہمیں ایسی ہی ایک کاوش حبیبؔ جونپوری کی مذہبی شاعری میں نظر آتی ہے۔

حبیبؔ جونپوری اس دور میں پیدا ہوئے جب "جدید نظریات کی آمد آمد تھی اور قدیم مذہبی رومانس کی رخصتی" اس میں شک نہیں کہ دنیا میں اعلیٰ کردار اور اخلاق اقدار کی مالک شخصیات پیدا ہوتی رہی ہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی ہوں، لیکن بہرحال عرب میں ایک گھرانہ ایسا پیدا ہوا تھا جس نے اپنے کردار، سچائی اور علم و معرفت کی بیکرانی سے اپنے لیے سخت مخالف پیدا کیے اور مخالفوں کی انتہائی شدید العذاب دنیا میں اپنی زندگی تک کو قربان کردیا۔ اس طرح خیر و شر کی واضح علامتوں نے انسانی علم و تمدن، زبان و

ادبیات کو بھی متاثر کیا۔ اب یزید اور حسین علیہ السلام شخصیات نہیں رہیں بلکہ جبر و حریت کا استعارہ بن گئیں۔

اب شاعری میں واقعاتِ کربلا یا کردارِ رسالتؐ و اہلِ بیتؑ کو انسانی تمدن، ارتقا اور عمرانی تشکیلات کے معاون سمجھا جاتا ہے اور اس کے لیے ممتاز شعرا نے بہت کچھ اضافے کیے۔ ان میں حبیبؔ جونپوری بھی شامل ہیں۔ اعتقادی طور پر جو مذہبی و تاریخی معلومات، جو قصائد و رباعیات یا قطعات کے لیے ضروری ہیں، حبیبؔ جونپوری اُن سے مالا مال تھے، کیوں کہ تحریکِ اسلام یا امامتِ امیر المؤمنین علیہ السلام واقعۂ کربلا یا اہلِ بیت کی انفرادیت اور اجتماعی زندگی، سارے عالم کے لیے لائقِ تقلید ہے۔ اسی لیے حبیبؔ جونپوری نے بھی اسی گھرانے کا دامن تھامے رکھا اور شاعری میں بھی جگہ جگہ اس کا اظہار مختلف انداز سے ہوا۔ مندرجہ قطعہ بھی اسی جذبے کو ظاہر کرتا ہے۔

لہو سے سارے زمانے کو لالہ زار کریں
حسینؑ آئیں تو اسلام استوار کریں
تھپیڑے کھائے گی کشتی تو کون روکے گا
نبیؐ سے کہہ دو نواسےؑ کا انتظار کریں

(کلیاتِ حبیب ص ۱۶۰)

اسی طرح ایک اور قطعہ میں حضرت فاطمہ زہرا علیہ السلام کے دور کی بڑائی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس کو وہاں عزت مل جائے تو سمجھ لیں اس کو جنت مل گئی اور جو بچہ حضرت فاطمہ علیہ السلام کی گود میں پل جائے وہ امامت پا جائے۔

در پہ زہراؑ کے اگر کوئی بھی عزت پا جائے
پھر تو بن مانگے ہی دنیا میں وہ جنت پا جائے

صدقے کیا چیز ہے آغوشِ جنابِ زہراؑ
اس میں پل جائے جو بچہ وہ امامت پا جائے

۲۔ذاتی قطعات

حبیبؔ جونپوری کی عابد علی عابدؔ سے چشمک تھی۔ جب حبیبؔ جونپوری لاہور میں تھے، اس وقت اُن کے شاگردوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ بن گیا تھا۔ لاہور میں عابد علی عابدؔ کا اپنا ایک شعری حلقہ تھا۔ چناں چہ دونوں حلقوں میں ٹھن گئی اور ایک عرصے تک شاعرانہ مجادلے ہوتے رہے۔ لیکن حبیبؔ جونپوری نے اپنی روایتی شرافت اور وضع داری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انہوں نے ہمیشہ عابد علی عابدؔ کا دل سے احترام بھی کیا اور انہیں ایک اہم شاعر تسلیم کرتے تھے۔ جب حبیبؔ جونپوری کے والد صاحب کی وفات کے بعد عابد علی عابدؔ کا انتقال ہوا تو انہوں نے ان کے سانحۂ ارتحال پر ایک قطعہ کہا جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

درد کی ٹیسوں نے دل کو کرلیا آماجگاہ
دل تو ٹوٹا تھا مرا پہلے ہی والد کے بغیر
حسرتِ نظارگی کچھ مضمحل سی ہوگئی
اُٹھ گیا لطفِ سخن گوئی بھی عابدؔ کے بغیر

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۹)

یعنی حبیبؔ جونپوری یہ سمجھتے تھے کہ ''لطفِ سخن گوئی'' عابد علی عابدؔ ہی سے تھا۔ اسی طرح وہ سمجھتے تھے کہ ''سلام نگاری'' کا لطف صرف نجم آفندی کی وجہ سے تھا اور جوشؔ ملیح آبادی، سید آلِ رضاؔ کے بغیر کلام کا مزا نہیں۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

حبیبؔ اب نہ رہا کوئی رہبری کے لیے
نہیں ہیں نجمؔ تو کیا لطف ہے سلام کا اب
بھٹک رہا ہوں اندھیرے میں روشنی کے لیے
نہ جوشؔ ہیں، نہ رضاؔ کیا مزا کلام کا اب

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۹)

مختلف موضوعات کو ہم نے متفرق قطعات کے زمرے میں رکھا ہے۔

۳۔ متفرق قطعات

حبیبؔ جونپوری کے ہاں عشق و عاشقی کے روایتی مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ وہی پرانا ظالم محبوب اور اس کی جفائیں، وہی عاشق کی سادگی اور آہ وزاری، محبوب کی بے وفائی وغیرہ۔ مثلاً یہ قطعہ دیکھیں:

اپنا ہمیں کہہ کہہ کے نظر موڑ رہے ہو
جس دل کو بڑھایا تھا اُسے توڑ رہے ہو
بس ایک نظر دیکھ لو پھر دوست سمجھ کر
آخر تو ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہے ہو

اُن کے قطعات میں جدت ادا کے نمونے بھی ہیں۔ انسانی جذبات کی رنگا رنگ تصویر کشی، خوب صورت زبان کا حسن، لفظی و معنوی کے پیش کرنے کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ بعض قطعات میں نفسیاتی باریک بینی میں حبیبؔ جونپوری کی مہارت کا باربار احساس ہوتا ہے۔ بعض قطعات نفسیاتی تحلیل و تشریح کا نمونہ ہیں اور تحلیل و تشریح محض سُنی سنائی باتوں یا مغربی مفکرین کے مشہورِ زمانہ تھیوریز (Theories) پر مبنی نہیں، بلکہ ذاتی

مشاہدہ، تجزیہ باطن اور غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ یہ قطعہ دیکھیں:

درد میں ڈوبا فسانہ چاہیے
اور سننے کو زمانہ چاہیے
دوست دشمن سب عیادت کر چکے
وہ نہ آئے جن کو آنا چاہیے

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۴)

کچھ قطعات میں شوخی اور نغمگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

نہ دل پہ قابو، جگر پر نہ اختیار مجھے
بنائے دیتے ہیں مل جل کے بیقرار مجھے
چھپا چھپا کے خطائیں بچا بچا کے نظر
ترے کرم نے بنایا گنہگار مجھے

یہاں محبوب کی شوخ نگاہیں شاعر کے دل اور جگر کو بے قابو کر رہی ہیں۔ کچھ قطعات میں حسنِ بیان اور فکر کی گہرائی پائی جاتی ہے، بعض قطعات میں محاکات کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں محاکات کو ''شاعرانہ مصوری'' کہا ہے جس کے ذریعے خیالات، جذبات اور کیفیات زیادہ موثر طریقے پر ادا کیے جاسکتے ہیں۔ شاعر الفاظ کی مدد سے ہر خیال و واقعہ اور کیفیت کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ حبیب جونپوری کے ہاں محاکات کا نمونہ دیکھیں۔

وفورِ شوق نہ جوشِ اُمید رہ جائے
نہ شوقِ وصل نہ ارمانِ دید رہ جائے

وہ مل رہے ہیں گل جانِ زار رخصت ہو

کہ تابہ حشر، مری عید عید رہ جائے

اس قطعے میں عید دو معنوں میں استعمال ہوا ہے، ایک تو عید کے تہوار کے معنی میں اور دوسرا خوشی کے معنوں میں۔

مولانا شبلی کا یہ بھی خیال ہے کہ شاعرانہ مصوری کے لیے (بخلاف عام مصوری کے) کسی تصویر کے تمام خدو خال کا دکھانا ضروری نہیں۔ شاعر صرف دو چیزیں لیتا ہے جو ہمارے جذبات پر اثر انداز ہوں۔ بقیہ چیزیں نظر انداز یا دھندلی کر دیتا ہے اوپر والا قطعہ اس کی مثال ہے، اس کے علاوہ مندرجہ بالا قطعات میں گیتوں کی سی فضائی پائی جاتی ہے۔ مترنم بحریں، مضامین میں رومانیت اور جذباتی اُبال ان قطعات کی جان ہے، بعض قطعات حبیبؔ جونپوری کی قادر الکلامی کا نمونہ ہیں۔ مثلاً یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

دل یہ کہتا ہے کہ قطرہ نہ ٹپکنے پائے

تم یہ کہتے ہو کہ غنچہ نہ چٹکنے پائے

کیا کروں کیا نہ کروں ہائے ضدیں ہیں کیسی

جام لبریز ہے کیسے نہ چھلکنے پائے

اس میں روایتی کلاسیکی انداز پایا جاتا ہے، جذبات کی شدت کا اظہار ہے، کیوں کہ محبوب شاعر سے یہ چاہتا ہے کہ میں ظلم و ستم کرتا رہوں اور عاشق آہ بھی نہ کرے، جب کہ اگر دکھ و درد حد سے گزر جائیں تو اُن کے اظہار کی ضرورت نہیں رہتی۔ جیسا کہ پیمانہ لبریز ہونے کے بعد چھلک جاتا ہے، حبیبؔ جونپوری کو اپنے مولد جونپور محلّہ سپاہ سے بے حد محبت تھی۔ اُسے جنتِ ماوئی کہا ہے۔ جیسا کہ ہر انسان کو اپنی جنم بھومی سے محبت ہوتی ہے تو اس سبب سے انھوں نے بعض قطعات میں شاعرانہ تعلّی کا استعمال کیا ہے اور ساتھ جونپور کا جنت الماوئی کے نام سے یاد کرتے ہوئے اس کی سب پر فوقیت کا

اظہار بھی کیا ہے۔ شاعرانہ تعلّی کی روایت میرؔ و سوداؔ، غالبؔ و شیفتہؔ، اکبرؔ اور آرزوؔ لکھنوی سے ہوتے ہوئے حبیبؔ جونپوری تک پہنچی اور ان کے ہاں بے شمار قطعات ایسے ہیں جن میں شاعرانہ تعلّی سے کام لیا گیا ہے، مثلاً یہ قطعہ دیکھیں:

خیال سب کا ہے اپنی نظیر ہم بھی ہیں
ادب کی جانِ سخن کے امیر ہم بھی ہیں
جنوں زدوں نے بنائی ہے مل کے راہِ عمل
اسی لکیر کے ہاں ہاں فقیر ہم بھی ہیں

(کلیاتِ حبیب، ص ۱۵۶)

یہاں شاعرانہ تعلّی کے علاوہ روایت کے اسیر ہونے کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے۔ ایک اور قطعہ دیکھیں:

شاعروں کی مطمئن دنیا میں شامل ہوگیا
ماہِ نو اُبھرا اُبھر کر بدرِ کامل ہوگیا
ممتحن ہو شاعرانِ بے بدل کا میں حبیبؔ
جنت الماویٰ کو سب پر فوق حاصل ہوگیا

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۶)

یہاں جنت الماویٰ کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ اسے سب پر فوقیت حاصل ہے اور خود کو بدرِ کامل بنایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ میں بھی شاعروں کی صف میں شامل ہوں۔ اسی مضمون کو آگے ایک اور قطعہ میں یوں باندھا ہے:

یہ تو کہہ سکتا نہیں ہوں میں کہ ماہر ہوگیا
شعر کہہ لینے پہ لیکن اب تو قادر ہوگیا

میرا مولد بن گیا ہے مرکزِ علم و ادب
بچہ بچہ جنت الماوئ کا شاعر ہوگیا

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۶)

اس قطعے میں کہتے ہیں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میں بہت ماہر ہوگیا ہوں، لیکن شعر کہہ لینے میں مجھے قدرت حاصل ہوگئی ہے، پھر اپنے مولد جونپور کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ علم و ادب کا مرکز ہے اور یہاں کا بچہ بچہ شاعر ہوگیا ہے۔

اسی طرح ایک اور قطعہ میں جونپور کے غنچہ غنچہ کو جام برکف بتاتے ہیں اور ہر کلی کو مے نوش اور لکہ لکہ یعنی ہر ٹکڑا بادل کو کہتے ہیں کہ ایک میکدہ بنا ہوا ہے۔ جنت الماوئ کو اپنا جھولا بتاتے ہیں اور فلک کو گود کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میری تربیت میں دو عالم خود شامل ہیں۔ لکھتے ہیں:

غنچہ غنچہ جام برکف ہر کلی مے نوش ہے
لکہ لکہ ابر کا اک میکدہ بردوش ہے
تربیت میں میری شامل خود دو عالم ہیں حبیبؔ
جنت الماوئ ہے جھولا اور فلک آغوش ہے

(کلیاتِ حبیب۔ ص ۱۵۶)

حبیبؔ جونپوری کے قطعات میں ساقی نامے کے نمونے بھی موجود ہیں اور خمریات کا استعمال کیا ہے۔ یہ قطعہ دیکھیں:

للچا کے پی گیا کبھی اِٹھلا کے پی گیا
کل کائناتِ ہوش کو ٹھکرا کے پی گیا

زاہد سے تنگ دل کا جو آنے لگا خیال

یہ جام دوسرا بھی میں جھلا کے پی گیا

(کلیاتِ حبیب۔ص ۱۵۵)

حبیبؔ جونپوری کا فنِ شاعری کے متعلق اپنا ایک نکتۂ نظر ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ شعر وہی ہے جو موزوں ہو۔ لفظ وہی ہے جو بحر میں آئے اور اس میں حسین خیال موجود ہو۔ اس لیے لکھتے ہیں:

لفظ بے ترتیب بد روئی پہ شرمائے ہوئے

حسنِ موزوں دیکھتے رہتے ہیں للچائے ہوئے

بحر سے باہر کبھی مصرع نہ لے انگڑائیاں

بزم میں دیکھا کسی کو پاؤں پھیلائے ہوئے

(کلیاتِ حبیب۔ص ۱۵۸)

یہاں حبیبؔ جونپوری یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اچھا شعر کہنے کے لیے انسان کا حسد سے دور ہونا ضروری ہے، کیوں کہ حاسد تو کبھی بھی اچھا شعر نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ وہ تو دوسروں کے عیب تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ لکھتے ہیں:

دل والا خاموش نہیں رہ سکتا

صبر نہیں تو رنج نہیں سہہ سکتا

آنکھیں تو کرتی ہیں اُس کے عیب تلاش

حاسد اچھا شعر نہیں کہہ سکتا ہے

(کلیاتِ حبیب۔ص ۱۵۹)

حبیبؔ جونپوری کے ہاں بعض قطعات میں فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ دنیا سے بڑے بڑے اہلِ فن چلے گئے، لیکن اُن کا ذکر ابھی بھی محفلوں میں جا بہ جا ہوتا ہے۔ حبیبؔ جونپوری کے اس طرح کے قطعات میں درسِ اخلاق کے نہایت عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً ایمرسن کا خیال ہے کہ انسان بالعموم دوسروں سے کسبِ ضیا کا متمنی ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے اُسے اپنے اندر کے چراغ (خودی) کی روشنی دکھائی نہیں دیتی، لیکن اگر انسان میں بہ ذاتِ خود "جوہرِ ذاتی" موجود ہو تو اُسے کسی سہارے یا سفارش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ وہ خود ہی مشک کی طرح مہک اُٹھتا ہے اور اپنی زندگی کی تعمیر خود کرتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو حبیبؔ جونپوری نے مندرجہ ذیل قطعہ میں اس طرح باندھا ہے:

نہ گل باقی نہ بلبل ہے نہ سوز و ساز باقی ہے
فضاؤں میں مگر ڈوبی ہوئی آواز باقی ہے
قفس کی تیلیوں پر خون کی چھینٹیں بتاتی ہیں
شکستہ بازوؤں میں ہمتِ پرواز باقی ہے

اس قطعہ میں ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے کہ حبیبؔ جونپوری نے جیسا کہ اپنے خطوط میں بھی یہ بات واضح ہے کہ میں نے ہمیشہ محنت کی کوشش کی ہے۔ بہت سی مشکلات کا سامنا کیا ہے، مگر میں نے ہمت اب بھی نہیں ہاری اور مسلسل جدوجہد کررہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ جب تک کہ زندگی باقی ہے۔ یہی بات مندرجہ بالا کے آخری شعر میں بھی نظر آتی ہے کہ قفس کی تیلیوں پر خون کی چھینٹوں کا ہونا، یعنی بہت مشکلات کا سامنا کرنا اور شکستہ بازوؤں میں ہمتِ پرواز کا ہونا، اُن کے عزم و استقلال کو ظاہر کرتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حبیبؔ جونپوری کے قطعات میں فنِ شعر پر قدرت

بھی نظر آتی ہے اور اشعار میں سموئے جانے والے مضامین کے ماحول سے پوری طرح واقفیت بھی۔ وہ کبھی اپنی ذات کو زمانے کے آئینے میں دیکھتے ہیں اور کبھی اپنی ذات کے آئینے میں زمانے کو دیکھتے ہیں، یعنی اُن کے نزدیک ذات اور زمانے کے افہام اور شناسائی کے لیے وہ عمل درکار ہے جس کا رُخ دونوں طرف ہو۔ بیرونی اثرات سے آزاد ذات، سچائی کی صورت ہوتی ہے۔ گرد اور تاریکی سے پاک آئینہ بھی حق کا پیکر ہوتا ہے۔ فرد، ماضی کے ہر عہد کا اختتام بھی ہوتا ہے اور مستقبل کے ہر عہد کا آغاز بھی۔ حبیبؔ جونپوری کی ذات میں ماضی ڈوبتا اور مستقبل اُبھرتا نظر آتا ہے۔ وہ سماجی نفسیات کی اس منطق کو وقت کے اعادے، ترتیب، تنظیم، تقسیم اور تجزیے کے لیے کام یابی سے استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ حبیبؔ جونپوری ماضی کا رشتہ حال سے اور حال کا رشتہ مستقبل سے جوڑتے ہیں۔ انہوں نے روایت کی پاس داری بھی کی ہے، وہ جدید شاعری کے وسیع و عریض سمندر کے جزیرہ نما میں بیٹھ کر نئے نئے تجربات کی لہریں گننے کے بجائے روایات کے تجربے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے نئے قافلوں کا ہم راہی بننے کے بجائے سفر شکار کے سارے مرحلے اپنی ذات ہی میں طے کرلیے ہیں۔ جہاں صرف قافلے کی گھنٹیوں کی آواز ہی سنی جاسکتی ہے۔

حبیبؔ جونپوری کے قطعات میں شعریت اور نغمگی بھی ہے اور موسیقیت بھی۔ اپنے مولد سے محبت کی جھلک بھی ہے اور شاعری کا مخصوص نقطۂ نظر بھی ہے اور کلامِ موزوں کا عکس بھی۔ وہ اپنے قطعات کی وجہ سے ادب کی جان اور سخن کے امیر بھی ہیں اور اپنی نظیر آپ ہیں۔ اُن کے قطعات ساقی نامے کے نمونے بھی ہیں اور روایتی عشق و عاشقی کے قصے اور محبوب کی جفائیں اور ادائیں بھی ہیں۔ روایتی کلاسیکی انداز بھی موجود ہے اور جذبات و کیفیات کی شدت کا اظہار بھی ہے۔ شوخی و شرارت بھی ہے، فراق و ہجر کے مضمون بھی۔ نفسیاتی ژرف نگاہی بھی، اُن کے قطعات کا اہم خاصہ ہے۔

☆☆☆☆☆

حبیبؔ جونپوری کے مقام و مرتبہ کا تعین

اُردو میں شعری روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ایک اہم نام حبیبؔ جونپوری کا ہے۔

احساسات کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ تاریخ میں ان احساسات کا تحریر کرنا ممکن یا مناسب ہے لیکن تاریخ ان احساسات کا انکار نہیں کرتی بلکہ "کروس" تو انسانی محسوسات کے ساتھ فکرِ انسانی کو بھی تاریخ کا جزو قرار دیتا ہے۔ "ہیگل" اسی انسانی فکری ارتقا کو خود انسانی ارتقا کا محرک سمجھتا ہے لیکن نہ فکرِ انسانی تحریر میں لائی جانی ممکن ہے، نہ اس کے محسوسات۔ تاریخ صرف واقعات کا تسلسل بیان کرتی ہے اور فکری عمل کا انکار ہے اور نہ احساسات کا۔ لیکن جب ایک شاعر انہی کیفیات کو شاعری میں بیان کرتا ہے تو وہ تاریخ سے علیحدہ نہیں بلکہ اس کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنے شعری بندشوں میں ان احساسات کو بیان کردیتا ہے جو بجز شاعری ممکن نہیں۔ خوشی کا اظہار ہو یا غم کا۔ جذبات کی شدت، اس کے اظہار کی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان سب کی عکاسی ممکن ہے تو صرف شعری بندش سے اور تاریخی واقعات جو جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات میں نہیں سما سکتے۔ ان کے لیے ایک ایسا ہی قالب چاہیے جو دوسروں کے جذبات کو اپنے جذبات پر منطبق کردے۔ حبیبؔ جونپوری کی نظمیہ شاعری بھی ایسے ہی احساسات اور کیفیات لیے ہوئے ہے۔

حبیبؔ جونپوری کا عہد وہ عہد ہے جس میں نثر شاعری کو دبا رہی تھی۔ انہوں نے شاعری کو معتبر، فقہی اور ہمہ گیر بنایا۔ انہوں نے شاعری میں متنوع ذائقے پیدا کیے۔

نظم، غزل، گیت، قصیدل، رباعی اور قطعات غرض کہ مختلف اصناف شعری میں اپنے جوہر دکھائے۔ انھوں نے عصری ضروریات کو پورا کیا۔ اپنے معاشرے کی ابتری اور فرسودہ رسومات کو اپنی شاعری سے عیاں کرنے کی کوشش کی۔

انہوں نے موضوعاتی شاعری کو تنوع بخشا۔ انجمن پنجاب سے جو موضوعاتی شاعری کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اسی روایت کو آگے بڑھایا۔ اُن کی شاعری اسلوب بیان کی ندرت لیے ہوئے ہے۔ حبیبؔ جونپوری کی شاعری عصرِ حاضر کے پُرآشوب ماحول اور انسانی معاشرے کے انتشار جیسے گھمبیر عصری المیوں کو بنیاد بناتی ہے۔ حبیبؔ جونپوری انتہائی استدلالی انداز میں اپنے دور کے نمایاں میلانات و رجحانات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری انسانی نفسیات کے تقاضوں کو بھی موضوعِ سخن بنائے ہوئے ہے۔ خصوصاً گیتوں، نظموں اور غزلوں میں حبیبؔ جونپوری انسانی فطرت کے بہترین نباض دکھائی دیتے ہیں اور وہ انسانی نفسیات کے دائروں کو ایک خاص ترتیب اور مرکز پر قائم رکھنے کے لیے چہاردہ معصومین کی محبت کو مرکز بناتے ہیں جس کی عکاسی اُن کے قصائد، رباعیات اور قطعات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حبیبؔ جونپوری کی شاعری کو انفرادیت بخشنے والا ایک اہم عنصر اُن کا مخصوص اسلوبِ شعرگوئی ہے۔ وہ اختصار سے کام لیتے ہوئے روایات کی تفصیل نگاری سے گریز کرتے ہیں۔ ندرتِ خیال اور اندازِ بیان کی سادگی انہیں معتبر اور منفرد بنادیتی ہے، اسی طرح نادر تراکیب اور تشبیہی و استعاراتی طرزِ بیان بھی اُن کی فنی پختگی کی دلیل ہے۔

اُن کی شاعری میں آرزوؔ لکھنوی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ وہ آرزوؔ لکھنوی کی طرح لکھنوی طرزِ بیان بھی اختیار کرتے ہیں اور زبان و بیان کی سادگی کے جوہر بھی دکھاتے ہیں۔ ان کے کلام میں استفہامیہ لب و لہجہ کی آمیزش بھی ملتی ہے جو دراصل خالص فلسفیانہ افکار کو آسان اور عام فہم انداز میں قارئین تک پہنچانے کی ایک کامیاب کوشش کا نتیجہ ہے۔

حبیبؔ جونپوری کی شاعری گہری حساسیت لیے ہوئے ہے۔ وہ معاشرے کے دوہرے رویوں پر طنز کرتے ہیں، اُن کے خیال میں سماج کے قول وفعل کا تضاد تمام معاشرتی المیوں کی بنیاد ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں مظلوم کی داد رسی کرنے والا کوئی نہ ہو اور ظلم کے مہیب سائے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہوں، وہاں چہار دہ معصومین کا کردار حق گوئی اور انسانی وقار کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے، حبیبؔ جونپوری کے کلام میں چہاردہ معصومین کی محبت خصوصاً حضرت علی علیہ السلام کی محبت، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام اور واقعہ کربلا کے دشمنوں کے سامنے سرنگوں ہونے کی بجائے سینہ سپر ہوجانے کا اعلان، فکرِ کربلا کی دین میں اس فکر کے نتیجے میں حبیبؔ جونپوری کے یہاں رجائیت کا وہ پیغام اُبھرتا ہے جو علاقائی حدود سے ماورا ہے اور جس میں رنگ ونسل کی تفریق کے بغیر تمام عالمِ انسانیت کے لیے پیغامِ اُمید ہے۔

حبیبؔ جونپوری کے کلام خصوصاً رباعیات اور قطعات میں ''عرفانِ ذات'' کو اوّلیت حاصل ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صداقت کی منزل کو پالینے والا شاعر ہی حرمتِ فن کا پاس دار بن سکتا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ حاسد کبھی بھی اچھا شعر نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس کی نظر تو دوسروں کے عیب تلاش کرنے میں لگی رہتی ہے اور حبیب جونپوری کہتے ہیں کہ اگر کوئی شاعر بننا چاہے تو اس کو ژرف نگاہی پیدا کرنا ہوگی کیوں کہ اگر ابر نہ ہو تو بارش کیسے ہوسکتی ہے۔ حبیبؔ جونپوری کے نزدیک شاعر کا دل نگینوں کی طرح صاف ہونا چاہیے اور جب ایسا ہو تو اشعار حدیث کی طرح اس پر نازل ہوتے ہیں۔ حبیبؔ جونپوری ایک سخت گیر نقاد کی طرح بیک وقت ایسے تمام خود ساختہ اہلِ فن کی تردید کرتے ہیں جو کسی بھی قسم کی مصلحت پسندی کے فریب خوردہ ہوں یا جو اپنی کم نگاہی کے سبب اہلِ سخن کی رسوائی کا سبب ہوں۔ ایسے ابن الوقت اور منفعت پسندوں کو حبیبؔ جونپوری کے نزدیک شعر نہیں کہنا چاہیے۔

حبیبؔ جونپوری کا کلام تغزل کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اُن کی روایتی وضع

داری اور مخصوص تہذیبی مزاج اُن کی شاعری میں تغزل کا سبب بنتا ہے۔ حبیبؔ جونپوری کی شاعری کیوں کہ آشوبِ عصر کے رجحانات کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے تخیل کی دنیا میں آباد جہانِ امن تک نارسائی کا غم، مٹتی ہوئی اقدار و روایات اور اس پر افراد کی عُمُلی بے حسی و بے توجہی کا نوحہ حبیبؔ جونپوری کے کلام میں در آیا ہے۔ یوں حبیبؔ صاحب کا کلام ادب برائے زندگی کے جان دار، متحرک، بامعنی اور موثر نظریے کا عکاس بن جاتا ہے۔

حبیبؔ جونپوری غزل کے کلاسیکی مزاج سے بھی حرف بہ حرف آشنا ہیں اور جدید میلانات کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی لیے باوجود اس کے کہ وہ فارسی اور عربی کے بڑے ماہر تھے، انہوں نے گراں، ثقیل اور بوجھل الفاظ کو اپنی شاعری میں استعمال کرنے سے حتی الامکان گریز کیا ہے تاکہ اُن کی شاعری کا رشتہ عوام سے منقطع نہ ہونے پائے۔ اسی لیے اپنے کلام کے لیے زبان سادہ اور سہل استعمال کی ہے۔ حبیبؔ جونپوری کی وضع داری انہیں روایت سے منسلک کیے رکھتی ہے اور نظم کے میدان میں وہ حالیؔ کی اصلاحی روایت کے امین دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تمام شعرا کی طرح جدت پسندی کی دوڑ میں شامل ہونے کی بجائے پورے عزم و حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ روایت سے اپنا تعلق استوار رکھتے ہیں، قومی زبوں حالی اور اخلاقی اقدار کی پامالی پر گہری دردمندی اور جذبے کی تڑپ حبیبؔ جونپوری کی نظموں سے مترشح ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی حبیبؔ جونپوری کے کلام کو موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے اہم خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......جناب حبیبؔ جونپوری کا کلام اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں متنوع معروضات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔''

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے جب اپنا دیوان مرتب کیا تو اپنی بعض قدیم غزلیں، متعدد اشعار بوجوہ شاملِ دیوان نہ کیے اور یوں اُن کے کلام کا کثیر حصہ زیورِ

اشاعت سے آراستہ نہ ہونے کے سبب تلف ہوگیا۔ لیکن بعض شعراء ایسے بھی ہیں جن کا کلام اُن کی حیات میں سرے سے ہی مرتب نہیں ہونے پاتا اور اُن کی رحلت کے بعد گردشِ زمانہ کی نذر ہوجاتا ہے یا پھر کسی متشاعر کے لیے ذریعۂ عزت قرار پاتا ہے۔"

حبیبؔ جونپوری کے کلام کے متعلق پروفیسر سید نواز حسن زیدی لکھتے ہیں:

"حبیبؔ جونپوری اس اعتبار سے خوش بخت ہوکر اُن کے کلام کا بیشتر حصہ اُن کی زندگی میں نہ سہی، بعد از وفات ہی سہی مرتب ہوکر "کلیاتِ حبیبؔ" کے نام سے شائع ہوگیا ہے اور یہ فرضِ کفایہ انہی کے خانوادے کے ایک محقق اور نقاد ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ہاتھوں ادا ہوا۔"

گزشتہ ابواب میں مختلف اصنافِ سخن اور مکتوب کے حوالے سے حبیبؔ جونپوری کے فن کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس جائزے کے دوران گیت اور مکتوب کے علاوہ باقی تمام شعری اصنافِ سخن اُن کی "کلیاتِ حبیبؔ" سے ہی لی گئی ہیں۔ اس جائزے کے دوران ہم نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ حبیبؔ جونپوری ایک ہمہ جہت اور متنوع رنگ کے حامل شاعر اور مکتوب نگار تھے۔ ان کا اصل میدان شاعری تھا جس کی تقریباً تمام اصناف اُن کی دسترس میں تھیں۔ بلاشبہ کسی شاعر کے ہاں موضوعات کے تنوع کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم کسی شاعرانہ عظمت کا معیار محض موضوعات کی کثرت نہیں شعریت ہے۔ اس حوالے سے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو حبیبؔ جونپوری ایک کہنہ مشق اور مستند شاعر کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ ان کی نظموں، غزلوں، قصائد، رباعیات اور گیتوں میں روایتی اور جدید دونوں طرح کے موضوعات پر تخیل شعری اسلوب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ قول ہمارے موقف کی بھرپور تائید کرتا ہے کہ

"...... پڑھنے والے ان کی شاعری اور انداز سے مستفید ہوسکتے ہیں۔"

حبیبؔ جونپوری نے دیگر شعرا کی طرح اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا جیسا کہ سید وحید الحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

''مرحوم نے چھ سال کی قلیل مدت میں اپنے استاد آرزوؔ لکھنوی کے زیرِ تربیت اپنے مخصوص ترنم کی وجہ سے غزل میں اچھا خاصا نام پیدا کرلیا تھا۔''

حبیبؔ جونپوری کی دستیاب غزلوں میں قدیم اور جدید دونوں رنگوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اُن کی غزل مزاحمتی رجحان کی آئینہ دار بھی ہے۔ انہوں نے نرم، لطیف اور شیریں لہجے سے کام لیتے ہوئے غزل کی ہیئت کو کارآمد بنانے کی سعی کی ہے۔

ترقی پسند شعرا کی صحبت کے زیرِ اثر حبیبؔ جونپوری نے نظم کی دنیا میں قدم رکھا۔ اُن کی اس ہجرت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غزل کو دوراز کار رفتہ خیال کرتے تھے یا انہیں غزل گوئی پر قدرت نہ تھی۔ بلکہ ان کی نظم نگاری میں بھی غزل کا سا لہجہ در آیا اور ان کی نظم تغزل کے عناصر لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ حبیبؔ جونپوری کی شاعری پر رومانیت کے اثرات بھی پڑے۔ رومانوی رجحانات نے کم و بیش تین دہائیوں تک شعر و ادب کو اپنے سحر میں مبتلا کیے رکھا۔ تشکیک اور ماضی سے محبت رومانوی شعرا کی شناخت ہیں۔ ماضی کی حسین یادیں ان کے غموں کا مرہم ہوتی ہیں۔ وہ خوشیوں کے تخت پر براجمان ہوتے ہوئے بھی رنج و الم کے لیے دستِ سوال دراز کرتے نظر آتے ہیں، حبیبؔ جونپوری کی نظم ''عہدِ ماضی'' انہیں رومانوی شعرا کی صف میں جگہ دیتی ہے۔

خم بہ خم زلفوں کا وہ چہرے پہ میرے لوٹنا
بھینی بھینی نکہتوں میں ڈوب جانا یاد ہے
سرخیوں سے وہ جھلک اٹھنا رخِ ضوریز سے
لیتے لیتے نام میرا جھینپ جانا یاد ہے

حبیبؔ جونپوری کا عہد انگریز سامراج کے ظلم و ستم اور ہندو انگریز گٹھ جوڑ سے عبارت تھا۔ اس ظلم کا شکار زیادہ تر مسلمان ہی ہوتے تھے۔ سیاسی ابتری کے علاوہ ہندووانہ رسوم و رواج نے مسلمانوں کے سماجی اور خاص طور پر عائلی زندگی پر منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ چنانچہ افلاس و غیر اسلامی رسوم و رواج پر حبیبؔ نے جس انداز سے آنسو بہائے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں معاشرتی حالات کا کس قدر گہرا شعور موجود تھا۔ اس تناظر میں اُن کی نظم ''مفلس طالب علم، نظیر اکبر آبادی کی نظم ''مفلسی'' اور بیوہ کی خودکشی'' حالؔی کی نظم ''مناجاتِ بیوہ'' کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ذیل کے چند اشعار حبیبؔ جونپوری کی قادرالکلامی اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعہ کا پتا دیتے ہیں۔

دل سنبھلتا ہی نہیں ہے سینہ صد چاک میں
پھول سا چہرہ اٹا ہے بیوگی کی خاک میں

....

اشک ٹپکا آنکھ جھپکی ہچکی آئی کھو گئی
موت کی آغوش میں اک آہ بھر کر سوگئی

....

اور اک آہ ٹوٹے ہند کی رسموں کا دام
اے جوانا مرگ بیوہ تجھ پہ ہو میرا سلام

(کلیاتِ حبیبؔ۔ ص 90)

حبیبؔ جونپوری کو اپنے عہد کا گہرا شعور حاصل تھا۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ کسی بھی شاعر کے فن اور سماجی شعور کو سمجھنے کے لیے اس کا شعری سرمایہ اور نثری تحریریں

راہنمائی کرتی ہیں کیونکہ ایک شاعر یا ادیب جس طرح ادب اور تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اور گرد و پیش کے ماحول سے متاثر ہو کر شعر و ادب میں جو نئے تجربات کرتا ہے ان کے واضح اثرات اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ حبیبؔ جونپوری کے عہد میں بھی جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ خصوصاً مشرقی و مغربی تہذیب کے اختلاط سے ایک جدت پسند مشرقی تہذیب عالم وجود میں آئی، ان حالات میں حبیبؔ جونپوری کی شاعری میں اس بدلتے ہوئے ماحول اور سماجی اقدار کی تبدیلی کا عمل جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ علی گڑھ تحریک، آزادؔ اور حالیؔ کی ادبی و اصلاحی کوششیں اور اکبر الہ آبادی کے قوم پرستانہ جذبات اور ترقی پسند تحریک نے حبیبؔ جونپوری کی شعوری صلاحیت کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں اپنے فن کو اپنی قوم کی سماجی اور معاشی زبوں حالی کو درست کرنے کے لیے بروئے کار لانا چاہیے۔ بالآخر انہوں نے ایسا ہی کیا جیسا کہ ان کے خطوط سے بھی ظاہر ہے کہ ان کا تعلیمی ڈھانچہ کیسا ہونا چاہیے۔ عورتوں کو مردوں کی طرح کھلے عام نہیں پھرنا چاہیے۔ پردہ کی اہمیت اور کلبوں کی زینت نہ بننا چاہیے وغیرہ اور بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں انہوں نے جو شاعری کی اس میں خوب سے خوب تر کی تلاش، رہن سہن کے انداز، معاشرت کے طور طریقے، تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت پر زور، ہر فرد کی درستی سے قوم، سماج اور معاشرت کی درستی کے اصول موجود ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ حبیبؔ جونپوری کی اس عہد کی شاعری ان کے سماجی شعور کا نچوڑ ہے۔

حبیبؔ جونپوری کو سماج میں اگر کہیں پر کوئی مذموم رسم نظر آئی تو انہوں نے اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ لوگوں کو اس کے عدم استعمال پر مائل کرنے کی کوشش کی (جیسا کہ ان کے خطوط اور ان کی نظموں سے ظاہر ہے) اور غلط رسوم و رواج کی بیخ کنی اور ناشائستہ طور طریقوں کی اصلاح کے مفید مشورے دیئے اور غلط رسوم کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرضِ منصبی سمجھا۔

حبیبؔ جونپوری ایک باشعور اور فطری شاعر تھے۔ وہ قدرت کی طرف سے ایک دردمند دل لے کر آئے تھے، ان کو قوم اور سماج کی زبوں حالی نے اتنا متاثر کیا کہ ان کے دلی جذبات شعری پیرائے میں ڈھل کر قوم اور سماج کی خدمت کا ذریعہ بن گئے۔ حبیبؔ جونپوری ادب میں سماجی اہمیت کے قائل تھے۔ وہ شاعری کو صرف دل بہلانے کا شغل نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب برائے ادب کے نظریے کو تسلیم نہ کرسکے بلکہ ادب برائے زندگی کے نقیب تھے۔ ان کی نظمیہ شاعری اس بات کی شاہد ہے۔ ایک دردمندی کا احساس ان کے اشعار میں موجود ہے اور وہ طرح طرح سے قوم کے احساس خفتہ کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حبیبؔ جونپوری زندگی کو میدانِ عمل میں بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جہدِ مسلسل ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ دل میں اندھیرا ہو تو حسنِ عمل سے وہاں اُجالا ہوسکتا ہے اور اگر حوصلہ سلامت ہو تو اکیلا آدمی کارواں ہو کر منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

ان کی نظموں میں میر انیسؔ اور علامہ اقبالؔ کے مطالعے سے اس عقیدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو میر انیسؔ اور علامہ اقبالؔ کے لیے ان کے قلب و ذہن میں موجود تھی۔ انیسؔ کی خدمت اور علامہ اقبالؔ کی ملت دوستی کو موضوع بنا کر حبیبؔ جونپوری نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ حبیبؔ جونپوری شاعری کے مقام و مرتبے سے بھی آگاہ ہیں اور اس کی ذمے داریوں سے بھی۔ اس لیے کہتے ہیں کہ جب ظلم رگِ جمہوریت کو کاٹنے کے لیے بڑھتا ہے تو بے گناہی صبر کرتی ہے اور شاعر اس کو اثر دیتا ہے اور شاعر قلبِ آہن کو بھی موم کرنے کا ہنر جانتا ہے۔

۱۸۶۷ء کے اُردو ہندی جھگڑے کے بعد اُردو کا مسلمانوں کی زبان قرار دیے جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ حبیبؔ جونپوری کی اُردو زبان سے محبت اور تاریخ ادب اُردو سے آگہی ان کی نظم بعنوان ''اُردو'' ہے۔

ان کی طبیعت قصیدہ نگاری کے لیے موزوں تھی اور انہوں نے جو قصائد کہے وہ تمام آئمہ طاہرین کی شان میں کہے گئے ہیں لیکن انہوں نے روایتی قصیدہ نگاروں کی طرح مبالغہ آرائی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے وہ نجم آفندی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ ان قصائد کی فنی پختگی زبان و بیان کا جوش، پرشکوہ تراکیب حبیبؔ جونپوری کو مذہبی قصیدہ نگاروں کی صف میں جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر سحرؔ انصاری کا موقف یہ ہے:

''نظم نگاری پر انہیں قدرت تو تھی، جب قصیدے کی طرف توجہ ہوئی تو اس میں انفرادیت کے جوہر نمایاں کیے۔''

حبیبؔ جونپوری نے صرف قصیدے کی کلاسیکی روایت سے اکتساب کیا اور روایتی قصائد لکھنے میں نام پیدا کیا بلکہ جدید شاعری کے رجحانات کو قبول کرتے ہوئے اُردو قصیدے میں بعض ایسی جدتیں پیدا کیں کہ اُردو قصیدہ جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگیا۔ جدید دور میں شاعری جس طرح انقلابات اور تبدیلیوں سے دو چار ہوئی اس میں وہ اُردو قصیدے کی آن بان قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ اس عہد میں قصیدے کو اذکار رفتہ اور پامال صنف قرار دے کر اکثر شعراء اس سے کنارہ کشی اختیار کرچکے تھے۔ حبیبؔ جونپوری نے اُردو قصیدے کو سہارا دے کر اس کے پاؤں پر کھڑا کردیا اور ایسی مثال قائم کردی جس کی تقلید اُن کے بعد بھی جاری و ساری ہے۔

ان کی رباعیات میں روایتی موضوعات شاعری کے علاوہ اخلاق، مذہب اور معتقدات کو جگہ دی گئی ہے۔ چند ایک میں حبیبؔ جونپوری نے اپنے ''مولا'' کو مختلف ادبی حوالوں سے پیش کیا ہے۔ ان کی رباعیات زبان و بیان کے تسلسل، برجستگی، شوخ اور ذہانیت کے اظہار ایسی صفات سے مملو ہیں۔ انہوں نے رباعی کو اس کے مخصوص مزاج سے بہت قریب رکھا ہے۔ رباعی کا مخصوص مزاج حکمت و دانائی، اخلاقی اقدار کے بیان

اور مقاصدِ جلیلہ کے اظہار سے ترتیب پاتا ہے، ان کی رباعیات میں پند و موعظت بھی ہے اور اخلاق کی تلقین بھی۔ ان کی رباعیات کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حبیبؔ جونپوری نے ایک منفرد اور صاحب طرز رباعی نگار ہیں جنہوں نے بیسویں صدی میں اردو رباعی کو نئی فضاؤں اور جدید موضوعات سے روشناس کرایا۔

حبیبؔ جونپوری نے قطعات بھی لکھے ہیں۔ ان میں اخلاق کے عمدہ نمونے بھی ہیں اور ان کی معاشرتی زندگی کی عکاسی بھی، مذہبی رجحانات بھی نمایاں ہیں اور قطعات میں فنِ شعر پر قدرت نظر آتی ہے۔ حبیبؔ جونپوری کے قطعات شعریت اور نغمگی بھی لیے ہوئے ہیں اور موسیقیت بھی ان میں اپنے مولد سے محبت کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور فخر بھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جونپور کو علم و ادب میں سب پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے، ان کے قطعات میں ساقی نامے اور خمریات کے نمونے بھی موجود ہیں اور روایتی کلاسیکی انداز بھی۔ شوخی و شرارت بھی ہے، ہجر و فراق اور محبوب کی بے وفائی اور ظلم و ستم کے قصے بھی۔ نفسیاتی ژرف نگاہی بھی ان کے قطعات میں موجود ہے اور جذبات و کیفیات اور احساسات کی بہترین عکاسی بھی۔

انہوں نے اپنے قطعات میں شاعری کا مخصوص نکتۂ نظر بھی واضح کیا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ شعر وہی ہے جو موزوں ہو اور لفظ وہی ہے جو بحر میں آئے اور اس میں حسین خیال موجود ہو اور اس کے لیے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ شعر کے لیے شاعر کا حسد سے بچنا ضروری ہے۔ ورنہ حاسد کبھی بھی عمدہ شعر نہ کہہ سکے گا ان کے قطعات میں فلسفیانہ خیالات بھی بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں اور مختلف شخصیات کی شاعری کے حوالے سے مختلف خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں اور شاعرانہ تعلّی بھی ان میں موجود ہے اور کہیں کہیں صنعتِ تضاد کو بھی استعمال میں لایا گیا ہے غرض یہ کہ حبیبؔ جونپوری کے قطعات مختلف موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

حبیبؔ جونپوری کے خطوط میں زندگی کے مختلف معاشرتی مسائل، اپنے عہد کے حالات و واقعات، مذہبی امور پر بحث اور فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے ذاتی تعلقات اور حالات کے پردے میں بڑے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان میں زندگی اپنی تمام تر پیچیدگیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں حوصلہ شکن حالات میں زندہ رہنے کا وسیلہ بھی ہے، بیان کی شوخی بھی۔ انہوں نے ذاتی حالات و ضروریات اور قومی سیاسی اور تہذیب مسائل کو اپنے خطوط کا موضوع بنایا اور یہ مسائل اس طرح ان کے ذاتی حالات میں شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ انہیں علاحدہ کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں عزیزوں کی پریشانی میں ان کا غم غلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ گھریلو مسائل سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

حبیبؔ جونپوری نے اپنے خطوط میں چھوٹے چھوٹے فقرے، موثر آسان اور سمجھ میں آنے والے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ فارسی اور عربی الفاظ و محاورات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مختلف شعرا کے مختلف اشعار کو اپنے خطوط کی زینت بنایا ہے۔ خط لکھنا ایک فن ہے بلکہ مشکل فن یہی وجہ ہے کہ ہم بہت سے لوگوں کے خط پڑھتے ہیں لیکن لذت اور تسکین ہمیں ان خطوط سے ملتی ہے جنہیں مکتوب نگار نے اپنے خونِ جگر سے لکھا ہو۔ حبیبؔ جونپوری کے خطوط پڑھ کر وہ لذت اور تسکین ہمیں ملتی ہے اور ایک عالم اور مفکر کے خطوط کا تاثر ابھرتا ہے۔ ان خطوط میں ناقدانہ رائے کا اظہار ملتا ہے، انہوں نے اپنے خطوط میں مختلف موضوعات مثلاً زندگی کیا ہے؟ قیامت کیا ہے؟ برائی کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ محبت کیا ہے؟ شرم و حیا کیا ہے؟ دن اور رات کیوں بنائے گئے ہیں؟ پردہ کیا ہے اور کیوں ضروری ہے؟ حجاب نسواں کیا ہے؟ شریعت کے قوانین کیوں اہم اور ضروری ہیں؟ والدین کے حقوق کیا ہیں؟ بیوی کے حقوق کیا ہیں؟ عورت کیا ہے؟ عورت کے فرائض کیا ہیں اور عورت کے حقوق کیا ہیں؟ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ قدیم روایات

اور جدید روایات کیا ہیں؟ اور قدیم روایات کی پاسداری کیوں ضروری ہے؟ وفا کیا ہے؟ جیسے موضوعات پر بڑے عالمانہ اور مفکرانہ انداز میں بحث کی گئی ہے، اپنے موقف کو احادیث نبوی اور آیات قرآنی کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے۔ اس میں فارسی اور عربی الفاظ میں آگئے ہیں۔ اپنے موقف کو دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ مختلف دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے خطوط میں شعریت اور قافیہ بندی بھی پائی جاتی ہے ان کے یہ خطوط کسی طرح بھی کسی بڑے مکتوب نگار سے کم اہم نہیں ہیں۔

حبیبؔ جونپوری کے کلام اور مکتوبات کے مطالعے اور جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیسویں صدی کے شعرا میں وہ ایک اہم مقام کے حامل ہیں لیکن بقول پروفیسر سحرؔ انصاری:

''مولانا محبوب نے اپنے کلام کی اشاعت، ترتیب و تدوین پر بہت کم توجہ دی اگر وہ دیگر شعرا کی طرح ایک منظم انداز میں اپنی شاعرانہ تخلیقات کی اشاعت فرماتے تو بلاشبہ انہیں ادب میں وہ مقام ملتا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔''

ان کا بیشتر کلام ابھی بھی غیر مطبوعہ ہے۔ جو مختلف لوگوں کے پاس ہے اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ صرف ''کلیات حبیبؔ'' میں ان کا کچھ کلام مطبوعہ ہے، ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے ان کے کلام کو اپنے نام سے چھپوا بھی لیا ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ بہرحال جو تھوڑا بہت کلام ہمارے ہاتھ لگا ہے، اس میں غزل، نظم، قصیدہ، رباعی اور قطعات میں انہوں نے جس جہت اور سمت کا تعین کیا ہے،اس میں وہ انفرادیت کے مالک ہیں اور ایک خاص سوچ اور فکر کے حوالے سے شاعری کو آگے بڑھانے میں وہ بڑے بڑے شعرا سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

حبیب جونپوری کی تخلیقی کاوش

"کلیاتِ حبیب" ایک جائزہ

"کلیاتِ حبیب" حبیبؔ جونپوری کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے مرتب کیا ہے۔ یہ نظموں، غزلوں، قصائد، رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام میں متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

حبیبؔ جونپوری کو شعری ماحول ورثہ میں ملا۔ ان کے والد سید شبیر حسن صفا الہ آبادی معروف شاعر اور تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حبیبؔ جونپوری نے اپنے عہد کے قلبی جذبات اور زبان کے ماہر غزل گو آرزوؔ لکھنوی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے تھے چنانچہ ان کی غزلوں میں استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔

"کلیاتِ حبیبؔ" کی اشاعت سے قبل پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن (شہید) نے فن اور فنکار کے رشتے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ملک کے نامور اہلِ قلم سے حبیبؔ جونپوری کی شخصیت اور فن پر مقالے لکھوائے ہیں۔ فنکار کی سوانح عمری اس کے فن کے بعض پہلوؤں کی تفہیم کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح تہذیب اور سماج کے رویوں کے بارے میں حقائق کا تخلیق کے جائزے کے لیے ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاثراتی تنقید کے علم برداروں کے نظریات کے علی الرغم جدید جهد عہد میں فن پارے کو فنکار کی ذات سے الگ کر کے انہیں دکھایا جاتا۔

خوش قسمتی سے "کلیاتِ حبیبؔ" کے مرتب خود بھی محقق ہیں۔ اس لیے انہیں اس ضرورت کا شدید احساس تھا چنانچہ جناب سید وحید الحسن ہاشمی، جو ایک طرف شعر و ادب کی دنیا میں بلند مرتبے پر فائز ہیں، دوسری طرف تحقیق و تنقید سے ان کی دلچسپی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مزید یہ کہ وہ حبیبؔ جونپوری کے برادر ہیں، اس حوالے سے ان کی مہیا کردہ معلومات کہیں زیادہ معتبر ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے اپنے مضمون "حبیبؔ جونپوری..... چند یادیں چند باتیں" میں حبیبؔ جونپوری کی سوانح بیان کرتے ہوئے بعض ایسے واقعات کی نشان دہی کی ہے جن کے بغیر بعض تخلیقات کی تفہیم شاید ممکن نہ ہوتی۔ حبیبؔ جونپوری کی ایک نظم "فرنگی" کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب مرحوم کی وامق جونپوری سے صرف شناسائی تھی لیکن ۱۹۲۸ء میں قیام لکھنو کے زمانہ میں گہری دوستی ہوگئی۔ اس کی نظم "بھوکا ہے بنگال" سے متاثر ہو کر انہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک نظم "فرنگی" کے عنوان سے کہی۔ لیکن یہ نظم کہیں شائع نہ ہو سکی۔"

اپنے مضمون میں سید وحید الحسن ہاشمی نے حبیبؔ جونپوری کی شاعری پر ان کی شخصیت اور عہد کے حوالے سے تنقید کی ہے۔ نظم نگاری تغزل، قصائد، رباعیات و قطعات پر فرداً فرداً تحقیقی اور تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ:

"ان کی متعدد نظموں کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو خوبی اور حسن ان کی نظموں میں ہے وہ غزلوں میں موجود نہیں میں انہیں بنیادی طور پر نظم کا شاعر اس لیے کہتا ہوں ان کی نظموں میں تغزل بھی ہے اور مرثیت بھی۔"

"کلیاتِ حبیبؔ" کی تفہیم و تفسیر کے حوالے سے دوسرا اہم مقالہ جناب پروفیسر سحر انصاری کا ہے۔ موصوف کا شمار عہد حاضر کے صفِ اوّل کے محققین اور ناقدین میں ہوتا ہے۔ سحرؔ انصاری نے اپنے مقالے میں حبیبؔ جونپوری کے مولد اور ان کے عہد

کے سیاسی و سماجی حالات پر ادبی رجحانات پر بھرپور انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے حبیبؔ جونپوری کے سیاسی وابستگی اور سیاسی و قومی شعور پر بھرپور انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے حبیبؔ جونپوری کے حوالے سے ان کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر سحرؔ انصاری نے اپنے مقالے بعنوان "حبِ حبیبؔ" میں شاعری کے بارے میں حبیبؔ جونپوری کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حبیبؔ صاحب نے ایک نظم "شاعرؔ" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اسے ان کا منشورِ شاعری کہا جاسکتا ہے..... اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر کو معاشرے کی ایک فعال اور انقلاب آفرین شخصیت سمجھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر تعمیری، مقصدی اور مثبت ہے۔"

پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن (شہید) نے "کلیاتِ حبیبؔ" کی تفہیم کو مزید آسان اور بااعتبار بنانے کے لیے جن ناقدین اور محققین کو مقالات لکھنے کی دعوت دی، ان میں ایک معتبر نام پروفیسر عبدالکریم خالد کا ہے۔ موصوف کی ژرف نگاہی بیسویں صدی کے شعری و نثری ادب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ عبدالکریم خالد نے حبیبؔ جونپوری کے بارے میں اپنی تحقیقی مقالے بعنوان "حبیبؔ جونپوری۔ ایک مطالعہ" میں حبیبؔ جونپوری کی شاعری کو بیسویں صدی کے سیاسی، سماجی، تہذیب، ادبی اور اقتصادی تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے، لکھتے ہیں:

"حبیبؔ جونپوری کی شاعری مذہبی اور اخلاقی فضا ان کے بطن میں نمو پانے والی روحانیت اور مذہبیت سے اثر پذیر ہو کر اپنا الگ رنگ جماتی ہے۔ انہوں نے قطعہ غزل، نظم اور قصیدہ سمیت اکثر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان تمام اصناف میں ان کی طبیعت کا رنگ معمولی بیش و کم سے تقریباً ایک سا نظر آتا ہے۔"

حبیبؔ جونپوری کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے دیگر مضامین حسین اعظمی اور پروفیسر اقبال حسین کے تحریر کردہ ہیں۔ ان مضامین سے بھی حبیبؔ جونپوری کی شاعری کی تفہیم وبیش از بیش مدد ملتی ہے۔

''کلیاتِ حبیبؔ'' کی تدوین پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن (شہید) کی چار سالہ محنتِ شاقہ کا ثمر ہے۔ محقق موصوف نے مقدمہ میں تدوین کے حوالے سے اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''راقم نے حبیبؔ جونپوری کے کلام کے صنف وار تدوین کا فیصلہ کیا اور اصناف کے اعتبار سے معیارِ کلام کو پیش نظر رکھا ہے۔''

ڈاکٹر عبادت بریلوی ڈاکٹر شبیہ الحسن کی سعی مشکور کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کلیاتِ حبیبؔ مرتب کر کے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اچھے شاعر سے ہمیں متعارف کرایا ہے اور ایک جوہر قابل کو مٹی میں ملنے سے بچالیا ہے۔''

''کلیاتِ حبیبؔ'' کی اشاعت سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے محض ایک مستند شاعر اور جوہر قابل کو مٹی میں ملنے سے نہیں بچایا بلکہ قارئین کو معتبر کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقع عطا کیا ہے اور ہمارے نزدیک یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

کلیاتِ حبیب

مقدمہ

بیسویں صدی میں جن شعراء نے اپنا خون جگر دے کر چراغ غزل کی لو فروزاں رکھی ان میں آزاد لکھنوی کا نام نہایت معتبر ہے۔ آرزو لکھنوی نے شاہراہ عام سے ہٹ کر اپنے لئے فکر و اسلوب کا ایک ایسا راستہ منتخب کیا جو انہیں شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار تک لے گیا۔ اس زمانے میں حالی کی جدید شاعری کی تحریک نے اردو غزل کو بے اعتبار کر دیا تھا۔ آرزو لکھنوی کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دیا اور اپنے کمال ہنر سے یہ ثابت کیا کہ نظم کی مجموعی فضا میں بھی غزل اپنی حیثیت و انفرادیت برقرار رکھ سکتی ہے۔ آزاد لکھنوی نے نہ صرف اردو شاعری کو جدید لہجہ عطا کیا بلکہ "سریلی بانسری" کی لے سے اردو غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا۔ آرزو لکھنوی کے شاگردوں نے اس شعری اسلوب اور فکری موضوعات کو حرز جاں بنایا اور اپنے روشن فکر اور عالی دماغ استاد کی جلائی ہوئی شمع کو تابندہ تر رکھنے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دیں۔ برصغیر پاک و ہند میں آرزو لکھنوی کے شاگردوں کا شمار تو ممکن نہیں تاہم نمائندہ تلامذہ کے کلام کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان شاگردوں نے اپنے استاد کی روش کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اس میں فکر و اسلوب کے نئے نئے رنگ و آہنگ بھی پیدا کئے۔ آرزو لکھنوی کے ان شاگردوں میں سے ایک اہم اور معتبر نام حبیب جونپوری کا بھی ہے۔ حبیب جونپوری نے آرزو لکھنوی سے اصلاح بھی لی اور ان کے فکر و اسلوب کو اپنانے کی شعوری و لاشعوری کوشش بھی کی۔ یہی سبب ہے کہ ان

کے فکری موضوعات و اسالیب پر آرزو لکھنوی کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حبیب جونپوری نے ایک جانب تو آرزو لکھنوی کی فکری روایت کو اپنی شاعری کے ذریعہ آگے بڑھایا اور دوسری جانب انہوں نے لاہور میں "انجمن آرزو" قائم کر کے دیگر شعرا کو بھی آرزو لکھنوی کے طرز فکر و احساس سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی۔

حبیب جونپوری نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے جوہر خداداد نظموں اور غزلوں میں کھل کر ہمارے سامنے آئے۔ ان کی مذہبی شاعری میں تو ان کے عقیدے کی جھلک نمایاں ہے تاہم غزلوں، نظموں اور قطعات و رباعیات میں وہ ایک انقلابی رجحان کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں پر باغیانہ لب و لہجہ ان کے عصری تقاضوں کا عکاس ہے۔ وہ حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ استعماری طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی مجموعی شاعری اپنے اندر ایک خاص طرح کی جاذبیت رکھتی ہے جو قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔

اس مختصر سے ابتدائیہ میں حبیب جونپوری کی شخصیت یا شعری عظمت کا احاطہ مقصود نہیں ہے۔ اس حوالے سے معتبر ناقدین ادب کے مبسوط مقالات کتاب کی زینت بڑھا رہے ہیں۔ سردست اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

حبیب جونپوری کے کلام کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ مرحوم کا بیشتر کلام تلف ہو چکا تھا اور دستبرد زمانہ سے بچ جانے والا کلام منتشر اوراق کی صورت میں مختلف اصحاب کے قبضہ تصرف میں تھا۔ راقم نے حبیب جونپوری کے کلام کے حصول کے لئے چار سطحوں پر کاوش کی۔

الف۔ حبیب جونپوری کے عزیز و اقارب سے رابطہ۔

ب۔ حبیب جونپوری کے دوستوں اور ہم عصر شعرائے سے رابطہ۔

ج۔ معروف لائبریریوں اور نجی کتب خانوں تک رسائی۔

۵۔ حبیب جونپوری کے عہد میں شائع ہونے والے رسائل کی چھان بین۔

اس جست وخیز کے بعد راقم حبیب جونپوری کا جو کلام حاصل کرسکا اسے نذر قارئین کیا جارہا ہے۔ راقم نے تحقیق، تدوین اور تسوید کے تمام مروجہ اصولوں کو پیش نگاہ رکھا ہے۔ دستیاب کلام کو مدون کرنے کے چار طریقے راقم کے پیش نظر تھے۔

الف۔ تمام کلام کی سن وار تدوین۔

ب۔ صنفی تدوین۔

ج۔ موضوعاتی تدوین۔

د۔ معیار کلام کے پیش نظر مجموعی تدوین۔

راقم نے حبیب جونپوری کے کلام کو صنف وار تدوین کا فیصلہ کیا اور اصناف کے اعتبار سے معیار کلام کو پیش نظر رکھا ہے۔ اب ذیل میں حبیب جونپوری کے کلام کا صنف وار جائزہ پیش خدمت ہے۔

(الف) نظمیں

حبیب جونپوری کی کل ۱۶ نظمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ۱۳ نظمیں متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں جبکہ ۲ نظمیں شخصی منظومات کے ذیل میں آسکتی ہیں اور ایک نظم ہماری قومی زبان "اردو" کے حوالے سے ہے۔ جن نظموں کے سن تخلیق معلوم ہوسکے وہ آخر میں درج کردیے گئے ہیں۔ قیاسی سنین لکھنے سے گریز کیا گیا ہے۔ حبیب جانپوری کی درج ذیل نظمیں اس کتاب کی زینت بن رہی ہیں۔

۱۔ مفلس طالب علم

(جستجو کے علم میں باندھے ہوئے کس کرکمر)

۲۔ بیوہ کی خودکشی

(یہ اندھیری رات یہ ساری فضا سوئی ہوئی)

۳۔ نامعلوم حسرت

(میں ہوں کہ گھٹا جاتا ہوں دل ہے کہ حزیں ہے)

۴۔ شکستِ حسن

(کھوئے ہوئے ہیں سر کو جھکائے ہوئے ہیں آپ)

۵۔ نرگی

(تم تو خدمت کے جذبے سے سرشار تھے)

۶۔ عہدِ ماضی

(یاد ہے آغاز الفت کا زمانہ یاد ہے۔

۷۔ لاشیں

(صبر کیوں کر ہو دیکھ کر لاشیں)

۸۔ کشمکش

(نہ جانے اب ترا دل بے قرار ہے کہ نہیں)

۹۔ آؤ گیت گائیں

(آؤ الفت کے گیت ہی گائیں)

۱۰۔ حسرتِ دیدار

(مرتا ہوں کاش پھر تجھے اک بار دیکھ لوں)

۱۱۔ نوجوان ساتھی کی موت۔

(ہوگیا ہے اشک افشاں آج کیوں یہ آسماں)

۱۲۔ جدائی

(تاکید ضبط غم کی نہ فرما کے جایئے)

۱۳۔ اردو

(خطۂ ارض پہ کیا شان ہے تیری اردو)

۱۴۔ شاعر

(خاک کے ذروں کو تنویر نظر دیتا ہے وہ)

۱۵۔ میر انیس

(عظمت اردو کا جس نے رکھ لیا دل وہ انیس)

۱۶۔ علامہ اقبال

(باتوں میں تھی دلیل حوالہ سخن میں تھا)

(ب) غزلیات

حبیب جونپوری معروف غزل گو آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ یقین واثق ہے کہ انہوں نے سینکڑوں غزلیں کہی ہوں گی، مگر راقم محض سولہ غزلیں یکجا کرسکا ہے بیشتر غزلیں ۶ تا ۹ اشعار پر محیط ہیں اور اکثر میں مقطع کی موجودگی ان کے مکمل ہونے کی نشاندہی کرتی ہے جن غزلوں کا حتمی سن تخلیق معلوم ہوسکا اسے لکھ دیا گیا ہے، ان غزلوں کے مصرعہ ہائے اولی درج ذیل ہیں۔

۱۔ تقدیر بگڑتی جاتی ہے گو بات بنائے جاتے ہیں

۲۔ دیکھ کر مجھ کو وہ گھبرایا بہت

۳۔ حکم حاکم ہے عزم سفر کاٹ دو

۴۔ دنیا کو پھونک دے گی یہی خامشی کی آگ

۵۔ جس کا مجھے ارماں ہے وہ اکثر نہیں ملتا

۶۔ یہ شان وفا غم کی حکایت سے ملی ہے

۷۔ ذرا سے دل میں محبت کا سوز لائے ہیں

۸۔ کسی طرح بھی وہ تکمیل مدعا کرتے

۹۔ انداز دلبری ے دکھا کر کریں گے کیا

۱۰۔ یہ تو ممکن نہ تھا وفا کرتے

۱۱۔ میں تج کے بیٹھا ہوں جس روز سے زمانے کو

۱۲۔ اک ایسا عہد کہ جس کا کوئی جواب نہ تھا۔

۱۳۔ میری خود دار طبیعت کو جگاتے کیوں ہو۔

۱۴۔ شام وعدہ گاہ رونا گاہ ہنسا دیکھتے

۱۵۔ جاتے جاتے رخ محبوب کا دیدار ملے

۱۶۔ مہبط عشق کو گریاں بخدا می بینم

(ج) قصائد

حبیب جونپوری کے دستیاب تمام قصائد اہل بیت کی شان میں ہیں۔ صرف ایک قصیدہ واقعہ غدیر کے حوالے سے ہے۔ قصائد کی مجموعی تعداد آٹھ ہے۔ چار قصائد حضرت علی کی شان اقدس کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت امام حسن کی مدح میں ہے۔ ایک قصیدہ امام حسین کی فضیلت میں ہے۔ ایک قصیدہ صاحب العصر حضرت امام مہدی کی مدح میں ہے۔ ذیل میں ان قصائد کے موضوعات اور مصرعہ ہائے اولیٰ پیش خدمت ہیں۔

۱۔ قصیدہ در مدح حیدر کرار

(بشر سے کیا ثنا ممکن ہو داماد پیغمبر کی)

۲۔ قصیدہ در مدح حضرت علی

(تا بہ خلوت گہہ وحدت گئے جانے والے)

۳۔ قصیدہ در مدح علی عقدہ کشا

(ہٹی ظلمت عروس صبح نکلی بے حجابانہ)

۴۔ قصیدہ در مدح ساقی کوثر حضرت علی

(صدقے ترے سرستِ انداز خود آرائی)

۵۔ جشن غدیر

(پیام موت اس جانب ادھر وعدہ ہے وصل کا)

۶۔ قصیدہ در مدح امام حسنؑ

(فضا اچھی نہیں معلوم ہوتی آج صحرا کی)

۷۔ قصیدہ در مدح امام حسینؑ

(ابھی آغاز الفت ہ کبھی کچھ عہد و پیماں ہے)

۸۔ قصیدہ در مدح امام زمانہؑ

(یہ اچھا کھیل ہے آفت زدوں کا دل دکھا دینا۔

(د) قطعات و رباعیات

حبیب جونپوری عمر بھر قطعات و رباعیات کہتے رہے۔ تاہم راقم کو کل سترہ قطعات اور گیارہ رباعیات دستیاب ہیں۔ ان میں سے ایک قطعہ اور دو رباعیاں اہل

بیت کی شان میں ہیں اور انہیں آخر میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان قطعات و رباعیات کے مصرعہ ہائے اولی درج ذیل ہیں۔

۱۔ بہشت ناز کی کلیوں کو توڑ دے ساقی

۲۔ دل لے کے مرا درد مجھے تول دیا

۳۔ اپنا ہمیں کہہ کہہ کر نظر موڑ رہے ہو

۴۔ درد میں ڈوبا فسانہ چاہیئے۔

۵۔ دل یہ کہتا ہے قطرہ نہ ٹپکنے پائے۔

۶۔ وفورِ شوق نہ جوشِ امید رہ جائے۔

۷۔ للچا کے پی گیا کبھی اٹھلا کے پی گیا

۸۔ نہ دل پہ قابو جگر پر نہ اختیار مجھے

۹۔ خیال سب کا ہے اپنی نظر ہم بھی ہیں

۱۰۔ شاعروں کی مطمئن دنیا میں شامل ہو گیا

۱۱۔ یہ تو کہہ سکتا نہیں ہوں میں کہ ماہر ہو گیا

۱۲۔ غنچہ غنچہ جام برکف ہر کلی مے نوش ہے

۱۳۔ الفت نہ کی سامانِ اجل مول لیا

۱۴۔ نظروں کو خدا کے سر .کمالات ملے

۱۵۔ آئے ہوئے لب پہ لفظ تولے گا

۱۶۔ شمشیر سے امید نوازش کیسی

۱۷۔ شاعر ہے تو دل کرلے نگینوں کی طرح

۱۸۔ دلداری انساں کا بڑا ماہر ہے

۱۹۔ مغموم طبیعت کو روانی دے دو

۲۰۔ لفظ بے ترتیب بدروئی پہ شرمائے ہوئے

۲۱۔ یادوں کا ہر اک نقش سجا کر دیکھو۔

۲۲۔ دل والا خاموش نہیں رہ سکتا ہے۔

۲۳۔ درد کی ٹیسوں نے دل کو کرلیا آماجگاہ

۲۴۔ حبیب اب نہ رہا کوئی رہبری کے لئے

۲۵۔ نہ گل باقی نہ بلبل ہے نہ سوز وساز باقی ہے

۲۶۔ لہو سے سارے زمانے کی لالہ زار کریں۔

۲۷۔ اول کے محمد کو نبوت دے دی۔

۲۸۔ خود کوئی نہ گل اور نہ کلی بنتا ہے۔

یہ تصنیف چار برس کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اس کی ترتیب واشاعت میں جو دقتیں پیش آئیں ان کا بیان بجائے خود داستان غم ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں حبیب جونپوری کے بھائی جناب سید وحید الحسن ہاشمی کا بے حد اہم کردار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موصوف کی بے پناہ اعانت کے بغیر یہ کام شاید پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔ حبیب جونپوری کے دو صاحبزادوں جناب ڈاکٹر محمد باقر زیدی اور جناب منقاد حیدر اختر ہاشمی نے اس کتاب کی تکمیل واشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

اس کتاب میں جناب سید وحید الحسن ہاشمی کا ایک مبسوط مقالہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس میں موصوف نے حبیب جونپوری کی شخصیت اور فن کے حوالے سے چند اہم نکات بیان کئے ہیں۔ اسی طرح اس کتاب میں جناب پروفیسر اقبال حسین (مرحوم) ایک مضمون بھی موجود ہے۔ جس میں انہوں نے حبیب جونپوری کے ابتدائی زندگی کے

حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ افسوس ہے کہ اقبال صاحب یہ کتاب طبع شدہ صورت میں دیکھنے سے قبل ہی راہی ملک بقا ہوگئے اس طرح یہ مضمون ان کی آخر تحریر کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ ملک کے تین ناقدین جناب سحر انصاری، جناب عبدالکریم خالد اور جناب حسین اعظمی نے راقم کی درخواست پر حبیب جونپوری کے فن پر وقیع مقالات سپردقلم کئے۔ ان مقالات کی موجوگی سے یہ کتاب انتہائی معتبر اور قابل توجہ ہوگئی ہے۔ اس کتاب کے صوری حسن میں جناب عبدالکریم خالد صاحب کی کاوشیں راقم کے لئے موجب طمانیت ہیں۔ راقم ان تمام احباب کا فرداً فرداً شکر گزار ہے۔ جنہوں نے مختلف مواقع پر راقم کی دستگیری کی۔

اس کتاب کی تدوین وتسوید میں ایک طویل عرصہ صرف ہوا، تاہم راقم کو اطمینان ہے کہ اس نے تحقیق وتدوین کے مروجہ اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کتاب کو بہتر سے بہتر بنانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں موجود حبیب جونپوری کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے دو مضامین کے مصنفین جناب پروفیسر اقبال حسین اور جناب حسین اعظمی قضائے الٰہی سے رحلت فرماگئے ہیں۔ راقم ان مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

یہ کتاب آپ کی خدمت اقدس میں نہایت عاجزی سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

☆☆☆☆☆

جس کا مجھے ارماں ہے وہ اکثر نہیں ملتا
میں ہوش میں ہوں اور مجھے گھر نہیں ملتا
انساں سے رخصت ہوا معیار فضیلت
دستار تو لاکھوں ہیں مگر سر نہیں ملتا

حبیب جونپوری

مقالات

حبیب جونپوری کی شخصیت و فن

حبیب جونپوری، چند یادیں چند باتیں

سید وحید الحسن ہاشمی

مولانا محبوب الحسن ہاشمی مولوی سید شبیر حسن الہ آبادی کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۸ء میں شیراز ہند جون پور میں ہوئی اسی رعایت سے انہوں نے اپنا تخلص حبیب جونپوری رکھا۔

ان کے اجداد میں میر درویش علی ۱۵۵۶ء میں ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ایرانی فوج کے ساتھ وارد ہند ہوئے۔ امیر احسن اخوند ایرانی فوج کے سلار تھے۔ وہ میر درویش علی کے تبحر علمی اور زہد و ورع سے بیحد متاثر تے۔ انہی کی وساطت سے میر صاحب مغل صوبے دار کڑا مانک پور کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔

الہ آباد گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۱۱ء میں درج ہے کہ جب رام چندر بن باس کے سلسلے میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ دریائے گنگا پار کر کے تربنی کے مقام پر پہنچے تو وہیں قیام کیا۔ اسی وجہ سے یہاں ہر سال میلہ منعقد ہوتا ہے رام چندر کے بیٹے کوسا نے یہاں ایک مندر تعمیر کیا۔ اب یہ علاقہ پریاگ کہلاتا ہے۔ کالی داس نے میگھ وت اور ہیون سانگ نے اپنے سفرنامے میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اشوک نے ۲۷۲ قبل مسیح یہاں ایک مینار بنوایا جو آج تک موجود ہے۔ کڑا پریاگ سے کچھ فاصلے پر ہندوؤں کی زبردست بستی تھی وہاں ایک قلعہ ہے جس پر ۱۰۳۶ء کا سن درج ہے۔ محمود غزنوی کے ایک سپہ سالار

ساہو نے ۱۰۰۵ء میں کڑا پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر دیا۔ ۱۱۹۲ء میں غوری کی فوج نے راجہ جے چند کو شکست دے کر کڑا کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۲۵۸ء میں ارسلان خاں کے دور میں کڑا کو مانک پور سے ملا کر ایک نیا صوبہ بنادیا گیا۔ بلبن بادشاہ نے اس صوبے میں بڑے رفاہی کام کیے۔ ۱۲۸۶ء میں بلبن کا انتقال ہوگیا اور ۱۲۹۰ء میں جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا۔ اسی سال بلبن کا ایک جرنیل چھجو خاں کڑا کا سلطان بن گیا۔

خلجیوں اور تغلقوں کے دور میں یہاں مختلف صوبیدار آتے جاتے رہے۔ ۱۵۷۵ء میں یہاں کے صوبیدار نے مغلیہ سلطنت کے خلاف بغاوت کردی۔ اکبر خود فوج لے کر کڑا پہنچا۔ بدایونی کہتا ہے کہ اکبر نے صوبیدار کو شکست دے کر پریاگ اور کڑا کے متصل ایک نیا شہر بسایا جس کا نام اللہ باس رکھا گیا۔ مسلمانوں نے باس کی جگہ باد کر کے اسے اللہ آباد کردیا جو رفتہ رفتہ الہ آباد ہوگیا۔ اسی الہ آباد کی تحصیل پھولپور میں میر درویش علی کو گزر اوقات کے لئے بیس ایکڑ زمین ملی جو والد مرحوم مولوی شبیر حسن (ولادت ۱۸۸۴) تک آتے آتے صرف بیس بیگھ تک رہ گئی۔ خاندانی روایت کے مطابق میر درویش علی عربی اور فارسی زبانوں پر دستگاہ کامل رکھتے تھے اس کے علاوہ علم حدیث، علم تفسیر، علم جفر اور علم رمل کے بھی ماہر تھے۔ مقامی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے ان کا اہل دربار کے علاوہ عوام سے کوئی رابطہ نہ قائم ہوسکا۔ صرف اتنا معلوم ہوسا کہ سات آٹھ سال کے بعد شاگردوں کے ذریعے انہیں اتنی اجازت مل گئی کہ نماز عصر کے بعد فوجیوں کا اخلاق درست کرنے، ان کی عام بیماریوں کا علاج کرنے اور علم رمل اور جفر سے ان کی پریشانیوں کو حل کرنے کے لئے دربار سے دور وہ کہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ اس اجازت کے بعد وہ سہ پہر کو اپنے ایک دوست کی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر ہندو، مسلمان دونوں کے مسائل سنتے اور حل کرتے رہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مغل سرداروں کی سخت گیر پالیسیوں کی وجہ سے وہ کھل کر اپنے اصل عقائد کا اظہار نہ کر سکے۔

۱۷۶۵ء میں کڑا اور الہ آباد کے ضلعے انگریزی عملداری میں آ گئے تو دوسرے اصحاب کی طرح اس خاندان کے افراد نے بھی دینی مشاغل میں کھل کر حصہ لیا۔ میر درویش علی کی چوتھی نسل میں میر مردان علی بڑے جید عالم گزرے ہیں۔ انہیں تاریخ حدیث اور تفسیر پر پورا پورا عبور تھا۔ مشہور ہے کہ الہ آباد سے وہ پہلے شیعہ تھے جو جج کے لئے گئے۔ افسوس ہے کہ ان کی تمام نگارشات ضائع ہو گئیں اور آج ان کے تمام اہل خانہ کف افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

پانچویں نسل میں مولوی میر انتظام علی ولد میر حسن علی وہ بزرگ گزرے ہیں جن کا دنیائے عملیات میں بڑا نام تھا۔ کیپٹن ضامن حسین جلال الہ آبادی انہی کے شاگرد تھے۔ اس خاندان میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اردو زبان میں خطوط لکھے اور ہندی زبان میں نوحے کہے۔ لیکن مرحوم کا کوئی مطبوعہ کلام دستیاب نہیں ہے۔ والد مرحوم مولوی شبیر حسن ۱۸۸۳ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا اور بہ سلسلہ ملازمت جونپور آ گئے۔ جونپور کو فیروز تغلق نے بسایا پہلے اسے جونا پور کہتے تھے جو بگڑ کر جونپور ہو گیا۔ یہ شہر ۷۷۲ھ میں بسایا گیا۔ "شہر جونپور" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ ۱۳۹۳ء میں ملک الشرق خواجہ جہاں نے دہلی کی مرکزی حکومت سے ناطہ توڑ کر جونپور کو ایک آزاد اور خود مختار ملک قرار دیا۔ صوفیائے کرام سے عقیدت اور عالموں سے محبت رکھنے کی وجہ سے پورے ہندوستان کے علماء اور دانشور یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ ان میں ابو الفتح سن برسا شیخ شہاب الدین دولت آبادی، مولانا الہدیٰ، ملا افضل، ملا محمود صاحب شمس بازغہ، شیخ اعظم اور شاہ پیر محمد جونپوری نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

ابو الفتح کا مزار محلہ سپاہ میں آج بھی موجود ہے یہ اپنے زمانے کے مانے ہوئے صاحب حکمت اور صاحب کرامت تھے۔ ان کی کرامتیں دیکھ کر اکثر ہندو مسلمان ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہندو راجہ نے ان کو اس عمل سے باز رکھنے کے لئے کچھ سونا

ارسال کیا جسے انہوں نے واپس کرتے ہوئے دعا کی اسی وقت سونے کی ڈلیوں کی بارش ہونے لگی۔ جس مقام پر سونا برسا تھا اس کا نام ہی سونا برسا جو بگڑ کر سن برسا ہو گیا۔ اور آج تک اس جگہ کا یہی نام ہے۔ انہیں کی اولاد میں میر محمد محسن کی اکلوتی بیٹی صدیقہ بانو سے مولوی شبیر حسن کی ۱۹۱۲ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں ایک لڑکی وافیہ بانو پیدا ہوئی جو دو سال بعد انتقال کر گئی۔ والد مرحوم نے درگاہ رب العزت میں دعا مانگی کہ اب اگر لڑکا پیدا ہوگا تو اسے عالم دین بناؤں گا مرحوم کی دعا مستجاب ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں مولوی محبوب الحسن پیدا ہوئے۔ میر محسن انسپکٹر پولیس کے قائم کردہ کتب خانے میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ نو سال کی عمر میں ناصریہ عربی کالج میں داخل ہو کر فقہ حدیث، تفسیر، تاریخ و تنقید کے ابتدائی مراحل طے کئے۔ ۱۹۲۶ء میں جب والد مرحوم سفر عراق کے سلسلے میں لکھنؤ گئے تو انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئے اور اپنے برادران سید کاظم حسین ایڈووکیٹ کے حوالے کر کے عراق چلے گئے۔ کاظم حسین ایڈووکیٹ چند سال بعد سیکریٹری شیعہ یتیم خانہ لکھنؤ ہو گئے۔ انہوں نے لکھنؤ کے مختلف علماء کے زیر سایہ انہیں تعلیم دلوائی۔ بھائی صاحب مرحوم نے اپنی ذکاوت اور خداداد قابلیت سے لکھنؤ آگرہ اور الہ آباد بورڈ کے تمام اعلیٰ امتحانات پاس کر لئے اور عربی فارسی انگریزی اور اردو میں کافی دستگاہ حاصل کر لی۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ اس لئے لکھنؤ کے نامور شاعر آرزو لکھنوی کی شاگردی اختیار کی سردار جعفری اور کیفی جریا کی دوستی نے نظم نگاری کی طرف رخ موڑ دیا لیکن غزل اور قصیدے کو ترک نہ کر سکے۔

والد مرحوم مولوی شبیر حسین خود شاعر تھے انہوں نے فارسی اردو اور ہندی میں تقریباً تیس چالیس ہزار اشعار کہے لیکن اب تک صرف دس ہزار اشعار شائع ہو سکے۔ ہندوستان کی مطبوعات میری دسترس میں نہیں۔ پاکستان میں جتنا کلام شائع ہو چکا ہے۔

اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ اشک غم (نوحوں کا مجموعہ)

۲۔ صحیفۂ غم (نوحوں کا مجموعہ)

۳۔ صحیفۂ عقبیٰ (نوحوں کا مجموعہ)

۴۔ منظوم سوانح عمری امام موسیٰ کاظمؑ

۵۔ منظوم سوانح عمری امام تقیؑ

۶۔ منظوم سوانح عمری امام رضاؑ

۷۔ منظوم سوانح عمری امام زمانہؑ

۸۔ منظوم سوانح عمری جناب سلمان فارسی

۹۔ منظوم سوانح عمری جناب عون بن علی

۱۰۔ منظوم سوانح عمری حبیب ابن مظاہر

۱۱۔ منظوم سوانح عمری نافع بن ہلال

۱۲۔ منظوم سوانح عمری ہلال بن نافع

۱۳۔ منظوم سوانح عمری کمیل ابن زیاد

۱۴۔ منظوم سوانح عمری جابر ابن عبداللہ

15۔ کربلا والے (سلاموں کا مجموعہ)

آپ غزل میں صفا اور نوحے سلام میں حیدر تخلص استعمال کرتے تھے۔ مولوی محبوب الحسن نے شاعری کا جذبہ وراثت میں پایا تھا۔ ان کی شاعری پر تبصرہ بعد میں پیش کیا جائے گا۔

۱۹۴۳ء میں ان کی شادی مسماۃ کنیز معصومہ بنت میر مہدی علی ابن میر مردان علی سے ہوئی۔ لکھنؤ سے علوم دینی اور دنیوی حاصل کرنے کے بعد وہ کئی سال جالون اور نہٹور میں بطور عربک پرشین ٹیچر کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۲ء میں والد مرحوم سروس سے ریٹائر ہو گئے تو گھر کے اخراجات اور بھائیوں کی تعلیم کا بارگراں ان کے کاندھوں پر آپڑا۔ اس لئے محکمہ تعلیم کو خیر باد کر کے بطور لیبر آفیسر کلکتہ چلے گئے۔ اس وقت پورے بنگال میں قحط پڑا ہوا تھا۔ جاپان برما کو فتح کر کے بنگال پر زبردست بمباری کر رہا تھا۔ سبھاش چندر بوس ہندوستانی فوج کے ساتھ جاپان سے مل چکے تھے۔ قحط کا سارا بوجھ مسلمانوں پر تھا۔ بھوک سے روزانہ ہزاروں مسلمان لقمۂ اجل بن رہے تھے۔ وامق جونپوری کی نظم ''بھوکا ہے بنگال'' اسی زمانے میں شائع ہوئی جس نے اہل ہند خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں انگریز سے نفرت تیز کر دی۔

بھائی صاحب مرحوم کی کی وامق جونپوری سے صرف شناسائی تھی لیکن ۱۹۴۸ء میں قیام لکھنؤ کے زمانے میں گہری دوستی ہو گئی۔ اسی نظم ''بھوکا ہے بنگال'' سے متاثر ہو کر انہوں نے بھی انگریزوں کے خلاف ایک نظم ''فرنگی'' کے عنوان سے کہی لیکن کہیں شائع نہ ہو سکی یہ نظم ان کے مختصر دیوان میں شامل ہے اس کا آخری بند ہدیۂ قارئین ہے۔

تم نے لوٹا ہے اسلام کا بانکپن
آرزوؤں کے گل زندگی کا چمن
رونقِ نازنیناں گلوں کی پھبن
حسنِ پنجاب تہذیبِ گنگ و جمن
مقبروں کی ضیا میتوں کا کفن
سیدوں کا حشم عظمتِ برہمن

تم نے دکھا دیا اہل مشرق کا فن
جوہر آدمی اعتزاز وطن
سطوت مرد سرمایۂ حسن زن
شہسواروں کے دل سورماؤں کے تن
قلب بیباک بازوئے شمشیر زن
ساری دنیا میں ممتاز رنگ سخن
اپنی فتح دو روزہ پہ پھولے ہو کیوں
خبث باطن کا انجام بھولے ہو کیوں

۱۹۴۲ء میں ان کی دوسری شادی سید فتح علی کی چھوٹی بیٹی سیدہ مشتاق فاطمہ سے انجام پائی۔

۱۹۴۵ء میں انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی تو اضافی ادارے توڑ دیئے گئے۔ اس تخفیف میں بھائی صاحب مرحوم بھی آ گئے۔ اس لئے انہوں نے الہ آباد چھونگی میں بحیثیت لیبر آفیسر نوکری کر لی۔

۱۹۵۳ء میں وہاں سے فارغ ہو کر لاہور آ گئے۔ اسی سال آر۔ اے بازار ہائی اسکول لاہور کینٹ میں عربی فارسی کے استاد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ یہ علاقہ پروفیسر عابد علی عابد کے شاگردوں سے بھرا ہوا تھا۔ عام طور سے ہر مشاعرے کی صدارت پروفیسر موصوف ہی فرماتے تھے۔ بھائی صاحب مرحوم نے اپنے چند ہمنواؤں سے مل کر ''انجمن آرزو'' کی بنیاد ڈالی اور طرحی مشاعرے شروع کر دیئے اس عمل کا بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ ان کے دل میں شاعری کی بجھی ہوئی شمع پھر سے روشن ہو گئی لیکن نقصان یہ ہوا کہ متشاعروں کو غزلیں کہہ کہہ کر بانٹنے لگے۔ اس بات سے شاعری کا معیار بھی گر گیا اور ایک

ہی علاقے میں نوک جھونک کی فضا پیدا ہوگئی جائے حیرت تو یہ ہے لاہور کے اس میں سال کے عرصے میں ان کی دو تین غزلیں دستیاب ہوسکیں۔

۱۹۷۶ء میں ۵۸ سال کی عمر مکمل کرنے کے بعد وہ ریٹائر ہوگئے ایک سال پنشن کی تیاری میں ختم ہوگیا۔ ۱۹۷۷ء میں وہ کراچی اپنے بیٹوں کے پاس چلے گئے اور اسی سال حسینیہ سجادیہ امام بارگاہ کے خطیب ہوگئے اور پریشان و مایوس افراد کا روحانی علاج کرتے رہے۔ آخر ۱۹۸۷ء میں کراچی ہی میں انتقال کرگئے۔

یہ مختصر حالات اس شخص کے ہیں جو عالم بھی تھا عامل بھی مقرر بھی تھا شاعر بھی مفکر بھی تھا۔ مدبر بھی ہزاروں محفلوں مجلسوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے والے کا یہ مختصر دیوان دیکھ کے عبرت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ مرحوم نے اپنے پس ماندگان میں چار لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر سید محمد باقر زیدی

۲۔ سید معصوم الحسن

۳۔ سید منقاد حیدر اختر ہاشمی

۴۔ سید منصور حیدر

۵۔ سیدہ شمیم فاطمہ

۶۔ سیدہ اعجاز فاطمہ (عرف ہما)

مرحوم کو سخی حسن کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس کی اصل عبارت کتاب خفتگان خاک کراچی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نظم نگاری

اگرچہ نظر اکبر آبادی نے اپنے ماحول میں پیدا ہونے والی زندگی کی تمام کیفیات کا نقشہ اپنی نظموں میں کھینچ دیا تھا۔ لیکن نظم نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۳ء میں انجمن پنجاب کے مشاعروں سے ہوا۔ مولانا آزاد اور حالی نے نظموں کا رخ نیچرل پوئٹری کی جانب موڑ دیا مگر بیسویں صدی کے شعراء نے فطری شاعری میں رومانی اور سیاسی شاعری کا اضافہ کردیا۔ چکبست اسماعیل میرٹھی اور صفی اصلاح قوم کی جانب قدم بڑھاتے رہے لیکن جوش مجاز اختر شیرانی اور احسان دانش نے رومانی نظموں کو بہت عروج دیا۔ آخر الذکرہ وہ شعراء ہیں جو بھائی صاحب مرحوم کے ہم سفر بھی ہیں اور جن کی رومانیت کا مرحوم کی شاعری پر گہرا اثر بھی ہے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آرزو لکھنوی کے شاگرد ہونے کے ناطے سے ان کا تعلق خاص غزل سے ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ان کی متعدد نظموں کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو خوبی اور جو حسن ان کی نظموں میں ہے وہ غزلوں میں موجود نہیں۔ میں انہیں بنیادی طور پر نظم کا شاعر اس لئے کہتا ہوں کہ ان کی نظموں میں تغزل بھی ہے اور مرثیت بھی غزل سے انہوں نے لہجہ لیا اور مرثیے سے سوز گداز، اس کے علاوہ غزل کا شاعر قصیدہ نگار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ غزل میں ایجاز و اختصاد اور ایمائیت ہوتی ہے جبکہ قصیدہ وسعت اور تشریح چاہتا ہے مرحوم بہترین قصیدہ نگار اسی لئے ہیں کہ ان میں نظم نگاری کا ملکہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مرحوم کی ابتدائی نظمیں رومانیت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان نظموں کا لہجہ شیریں اور انداز دلکش و دل نشیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان نظموں میں غنائیت اور موسیقی کی لہریں بھی موجزن ہیں۔ ۱۹۳۶ء کی ایک نظم ''نامعلوم حسرت'' میرے اس دعوے کی

دلیل میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اس نظم کے تین بند ملاحظہ فرمائیں۔

فرقت ہے کبھی وصل کبھی وصل ہے فرقت
ملنا بھی قیامت ہے نہ ملنا بھی قیامت
کیا جانے وہ قاتل ہے کہ قاتل ہے محبت
مقتول ہوں کس کا مجھے معلوم نہیں ہے

یہ کشمکش غم یہ دھڑکتا ہوا سینہ
ساحل پہ ابھی ہے موجوں میں سفینہ
آیا نہ ابھی تک مجھے جینے کا قرینہ
سچ یہ ہے کہ جینا مجھے معلوم نہیں ہے

الفت کی شکایت ترا شکوہ نہیں پیارے
میں جانتا ہوں ظلم کسی کا نہیں پیارے
پوری ہو تمنا تو تمنا نہیں پیارے
بس اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہے

رومانی شاعری میں عہد ماضی کی یاد کا بڑا دخل ہے یہی یاد ماضی وہ کھلونا ہے جس سے شاعر کے دل کو تسکین ملتی ہے اور اس کی تنہائی کے لمحات بڑے حسین معلوم ہوتے ہیں جب شاعر ماضی کی یادوں میں کھوجاتا ہے تو اس کے منہ سے اس کے اصلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے جس میں محبت کی چاشنی عشقیہ انداز کا نکھار اور واردات قلبی کا سچا اظہار ہوتا ہے اب اس کی باتوں میں خلوص ہی خلوص اور اس کے جذبات میں اصلیت ہی اصلیت نظر آتی ہے اس سلسلے میں مرحوم کی دو نظمیں 'کشمکش' اور ''عہد ماضی' اپنے دامن میں نہ صرف خیالات کی سچائی بلکہ انداز کی دل نشینی اور رنگینی بھی لئے ہوئے ہیں۔ کشمکش

کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

نہ جانے اب ترا دل بے قرار ہے کہ نہیں
وہ جستجو وہ محبت وہ پیار ہے کہ نہیں
نظر جمی ہے اسی طرح پردۂ در پر
اسی طرح سے مرا انتظار ہے کہ نہیں
نظر میں اب بھی ہے قیمت دل شکستہ کی
غریب عشق کا اب بھی وقار ہے کہ نہیں
کھٹک نے جس کی تری خود نمائیاں لوٹیں
وہ تیر اب بھی کلیجے کے پار ہے کہ نہیں
تری امید پہ ٹھکرا رہا ہوں دنیا کو
تجھے بھی اپنے پہ یہ اعتبار ہے کہ نہیں
بتا قسم ہے اسی عہد دل نشیں کی تجھے
ترے بھی قلب میں اگلا سا پیار ہے کہ نہیں

ہر شخص جانتا ہے کہ ماضی کی کوکھ سے استعجاب حیرت غیر یقینی اور انجان پن جنم لیتے ہیں اس نظم میں آپ نے اس استعجاب و حیرت کو ملاحظہ کیا ہوگا جس میں شاعر گرفتار ہے اور عالم تنہائی میں محبوب سے ہمکلام ہے بظاہر انداز سوالیہ ہے لیکن حقیقت میں وہ اپنے ماضی کی کہانی مستحکم انداز میں پیش کر رہا ہے اور بتانا چاہتا ہے کہ نامساعد حالات کے باجود وہ اپنا عہد وفا نباہ رہا ہے۔ عہد وفا کی پابندی ہو یا تہذیب انسانی کی پاسداری مرحوم کے تمام کلام میں جاری و ساری ہے۔ جہاں جوش کا تصور عشق و محبت رومان سے نکل کر عیاشی کی فضا میں داخل ہوگیا وہیں مرحوم کے تصور عشق میں کوئی گراوٹ کوئی

ابتذال اور کوئی بازاری پن جنم نہ لے سکا۔

ان کی دوسری نظم ''عہد ماضی'' سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے یہ نظم حسرت موہانی کی غزل، ''وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے کے'' تتبع میں لکھی ہے۔ حسرت کی طرح مرحوم کا بھی کوئی محبوب نہیں ہے بلکہ وہ ایک جیتا جاگتا چلتا پھرتا ہنستا بولتا خوش و ناخوش ہونے والا انسانی پیکر میں شرم و حیا کا مجسم شاہکار ہے جس سے ملنا جس سے باتیں کرنا اور جس کی زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہونا شاعر کا آغاز الفت میں مقصد حیات تھا اب وہ دن بیت گئے وہ زمانہ باقی نہ رہا فقط عہد ماضی کی یادیں رہ گئی ہیں جو شاعر کو خون کے آنسو رلا رہی ہیں۔

وہ مرا جذبات سے گھبرا کے تجھ سے روٹھنا
آبدیدہ ہو کے وہ تیرا مناتا یاد ہے
یاد جس کی خون کے آنسو رلائے گی حبیب
وہ حکایت یاد ہے اور وہ فسانا یاد ہے

سینکڑوں شاعروں نے قوم کی بے حسی کا رونا رویا اور قوم کی اصلاح کی فکر کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مرحوم نے نہ جانے کتنی قومی اور ملی نظمیں کہیں لیکن ان کے نامکمل اور مختصر دیوان میں صرف ایک قومی اور ایک سیاسی نظم ہے۔

زمانے کی گردش اور قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جو شخص عربی فارسی اور اردو زبانوں کی اعلیٰ اسناد رکھتا ہو جو ضلع جالون میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کا اسکول مدرس ہو وہ اپنا اور اپنا اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے درس و تدریس کا شعبہ چھوڑ کر (۱۹۴۱ـ۴۲) میں کلکتے میں لیبر آفیسر بن جائے۔ پیشے کی یہ تبدیلی محکمہ تعلیم کے ماتھے پر ایک بدنما داغ تھا۔ مگر مرحوم کو اس سفر اور اس نوکری سے دو فائدے پہنچے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ برسوں کے بعد وامق جونپوری سے رسم و رواہ بڑھی۔ وامق جونپوری وہ شاعر تھے

جن کی نظم ''بھوکا ہے بنگال'' نے پورے ہندوستان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ انہیں بہت قریب سے انگریزوں کی عادات و سکنات طرز جہاں بانی اور ہندوستانیوں کے ساتھ ظالمانہ اور معاندانہ سلوک دیکھنے کا موقع مل گیا۔

بنگال کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور غربت کا تذکرہ وہ اکثر اپنے خطوط میں کیا کرتے تھے۔ پھر قحط کی وجہ سے مانک تلہ کے مسلمان بچوں کی بے گور و کفن لاشیں دیکھ کر ان کے ذہن سے ان لاشوں کا تصور محو نہ ہوسکا۔ پھر جب ۱۹۶۴ء میں نوا کھالی میں چار سو مسلمان شہید کردیے گئے تو انہوں نے ''لاشیں'' کے عنوان سے ایک عجیب ''نظم'' لکھی۔ اس نظم میں صرف واقعات و حادثات کا تذکرہ نہیں بلکہ اس میں لاشیں بطور استعارہ نظم کی گئی ہیں۔ انہوں نے مسلمان لاشوں کو مردہ تصور نہیں کیا بلکہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے یہ سو رہی ہیں۔ اگرچہ یہ لاشیں بے بصر ہیں مگر یہی منزل کی راہوں کا تعین کریں گی یہ معمولی مسلمانوں کی لاشیں نہیں ہیں ان پر آسمان گریہ کرتا ہے اور کرنیں انہیں چوم کر گزرتی ہیں۔ آخری شعر میں شاعر مسلمانوں کو عزم و حوصلہ کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ حادثہ کربلا سے مسلمان دھوپ اور اس دھوپ میں جلتی لاشوں کو دیکھتا چلا آیا ہے۔

آرزوئے حصول مقاصد میں
سو رہی ہیں زمین پہ لاشیں
یہ دکھائیں گی منزلوں کا نشان
جن کو کہتے ہیں بے بصر لاشیں
دیکھتے آئے ہیں یونہی ہم لوگ
عمر بھر دھوپ عمر بھر لاشیں

مرحوم کی پیدائش ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ تحریک خلافت کے اختتام تک وہ پانچ سال کے ہو چکے تھے۔ اگرچہ اس کمسنی میں ملی اور سیاسی شعور ناپختہ ہو رہا ہوگا لیکن جگہ جگہ جلسوں کا انعقاد اور انگریز دشمنی پر مبنی نعرے تو کان میں گئے ہوں گے۔ پھر قیام کلکتہ کے زمانے میں انہوں نے بہت نزدیک سے انگریزی حرکتوں اور ان کی چالوں کو دیکھا ہوگا۔ یہی وجوہات ہیں جن کی بناء پر ان کی شاہکار نظم "فرنگی" معرض وجود میں آئی۔

اس نظم کے تین حصے ہیں۔ پہلے باب میں یہ بتایا گیا کہ انگریز اپنے کو خادم خلق خدا کہتے تھے لوگوں کی نکبت اور ناداری مٹانے اور قوم کی کشتی کھینے کا دعوی کرتے تھے۔

دوسرے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب انگریزوں کا عمل نزدیک سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ مکر وفن کے استاد بدنوں کے خریدار بدمعاش بدکار اور مسلمانوں کے خون کے طلبگار ہیں۔

تیسرے باب میں کہا گیا ہے کہ انگریز شدید سزا کے حقدار ہیں کیونکہ

تم نے لوٹا ہے اسلام کا بانکپن
آرزوؤں کے گل زندگی کا چمن
رونق نازنیناں گلوں کی پھبن
حسن پنجاب و تہذیب گنگ و جمن
مقبروں کی ضیا میتوں کا کفن
سیدوں کا حشم عظمت برہمن
تم نے دفنا دیا اہل مشرق کا فن
جوہر آدمی اعتزاز وطن

سطوت مرد سرمایۂ حسن زن

شہسواروں کے دل سورماؤں کے تن

قلب بیباک بازوے شمشیر زن

ساری دنیا میں ممتاز رنگِ سخن

اپنی فتح دو روزہ پہ پھولے ہو کیوں

خبث باطن کا انجام بھولے ہو کیوں

(۱۹۴۲ء)

آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ اس نظم میں نہ چکبست کی زبان کی تیزی ہے نہ جوش کی سی للکار ہے بلکہ صاف اور ستھری زبان میں دلائل پیش کرکے انگریزوں کو سزا کا مستوجب ٹھہرایا ہے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اس نظم ے بعد صرف پانچ سال کے عرصے میں انگریز اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ اسی لئے شاید شاعری کو پیغمبری کا جزو کہا گیا ہے۔

تمام دنیا میں شاعری کی بنیاد یا خیال ہے یا جذبہ خیال میں عقلی دلائل منطق فلسفہ اور جذبات میں خوشی و غم غیظ و غصہ نفرت و محبت اور عقیدت و عداوت شامل ہیں۔ عقلی دلائل و فلسفہ انسانی ارتقا کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن جذبات میں اتار چڑھاؤ تو ممکن ہے مگر جذبات نہ حضرت آدم کے دور میں تبدیل ہوئے نہ آج تبدیلی کی طرف مائل ہیں اسی لئے جذبے کی شاعری سدا بہار ہے جبکہ خیال کی شاعری موسموں کے تغیر و تبدل کی طرح آج کچھ ہے کل کچھ، مرحوم خیال آرائی اور خیال بندی کو ثانوی درجہ دیتے تھے اور جذبات نگاری کو بہت اہم سمجھتے تھے ان کے موجودہ دیوان میں صرف تین نظمیں ،مفلس، طالب علم، بیوہ کی خودکشی اور نوجوان ساتھی کی موت، ہیں جن میں جذبات کی الگ الگ دنیا ئیں آباد ہیں۔

مفلس طالب علم میں ایک ایسے طالب علم کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کے کپڑے بوسیدہ ہیں جوتیاں پھٹی ہیں جس کے پاس فیس ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں جب وہ امیر طلبا کو ہنستا کھیلتا دیکھتا ہے تو اس کی نگاہیں جھینپ جاتی ہیں وہ سہما سہما کلاس میں جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ شاعر ایسے بچے کے خوفناک مستقبل کے بارے میں پریشان ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جب تک ملک سے مفلسی دور نہ ہو گی قوم اور ملک کی ترقی محال ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جستجوئے علم میں باندھے ہوئے کس کر کمر
جارہا ہے درسگہ کی سمت مفلس کا پسر
کچھ اڑا سا رنگ رخ کا کچھ پریشاں سر کے بال
دل ہجوم غم میں ڈوبا منحنی غمگین چال
روز کے فاقوں نے یوں چوسا ہے رگ رگ کا لہو
اٹھ نہیں سکتا دل مردہ سے بار آرزو
گل سے چہرے پر غبار مفلسی چھایا ہوا
جسم مردہ میلے کپڑوں میں کفنایا ہوا
ٹوپی کچھ چکٹی ہوئی جوتی پھٹی کرتا پھٹا
کوٹ بھائی کا پرانا جس پہ دھبے جا بجا
کالر ادھڑا کہنی مسکی مونڈھے بھی مسکے ہوئے
آستیں ہاتھوں پہ ڈھلکی ہے بٹن ٹوٹے ہوئے
فیس باقی ہے تو ایسا چور بجھتے دل میں ہے
مٹتی جاتی ہے چمک وہ بھی جو مستقبل میں ہے

چھیڑ کرتے ہیں جب اسکول کے سب گل عذار
دیکھ لیتا ہے تنکھیوں سے بحسرت بار بار
حوصلے کیا چھوڑتے تن میں جان بھی رکھتی نہیں
مفلسی انسان کو انسان بھی رکھتی نہیں
بجھ گیا دل کھپ گئی جان سعی زیبا کیا کرے
کوئی سمجھادے مجھے پڑھ لکھ کے مردہ کیا کرے

ان کی دوسری نظم بیوہ کی خودکشی ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس میں جذبات کی رواتی اعلیٰ منظر نگاری واقعات کا تسلسل تشبیہات و استعارات زباں کی دلکشی اور آخر میں قوم میں ایک جاہلانہ اور فرسودہ رسم جاری رہنے پر شدید طنز ہے اسی نظم میں مرحوم کی شاعری کے اصلی جوہر نمایاں ہوئے ہیں انہوں نے بیوہ کی پہلی رات کا جو دلدوز اور دلفگار منظر پیش کیا ہے۔ نظمیہ شاعری میں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ مفلس طالب علم، والی نظم کی طرح اس نظم میں بھی ان کا انداز خطیبانہ نہیں مصلحانہ ہے انہوں نے واقعات بیان کرکے پوری انسانیت کے شعور کو جھنجوڑ ہے اسی سے انداز ہوتا ہے کہ مرحوم کی نگاہ کسی ایک فرقے کے افعال و اعمال پر نہ تھی بلکہ پوری انسانی برادری ان کی فکر کا محور تھی۔

ان کی تیسری نظم ''نوجوان ساتھی کی موت'' ہے اس نوجوان دوست کا نام سراج الحسن ولد فیاض حسین تھا وہ جون پور کا رہنے والا شاعر بھی تھا اور مقرر بھی اگرچہ اس میں علمی استعداد کم تھی لیکن قدرت نے اسے عزم و ہمت سے خوب نوازا تھا۔ بھائی صاحب مرحوم خود ایک زبردست مقرر تھے۔ اس لئے دونوں میں گاڑی چھنتی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ ایجی ٹیشن کے موقع پر اس نے ولبھ بھائی پنتھ وزیراعلیٰ یوپی کے خلاف ایسی زبردست تقریر کی کہ لوگ وزیراعلیٰ کی جان کے درپے ہوگئے۔ سراج الحسن کو گرفتار کرکے بنارس جیل میں رکھا گیا اور اتنی اذیت پہنچائی گئی وجب وہ قید سے رہا ہو کر گھر آئے تو ان سے

چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد ان کا عین عالم شباب میں انتقال ہوگیا۔ نظم کیا ہے اسی دوست کا نوحہ ہے جس میں شاعری کم ہے جذبات کی شدت زیادہ ہے۔ اس شخصی نوحے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم میں کردار نگاری کا بڑا ملکہ تھا۔ مرحوم کے دل میں اپنے استاد آرزو مرحوم کی بڑی قدر تھی۔ انہوں نے استاد کے انتقال پر ایک نایاب نظم کہی تھی اس کی ہیئت سولہ رکنی تھی اور آخری شعر میں استاد ہی کی غزل کا مقطع بھی رکھ دیا تھا۔اب نہ مرحوم کی نظم دستیاب ہے نہ میری نظر سے استاد کی یہ غزل گزری۔ ممکن ہے کسی ابتدائی دیوان میں ہو۔

آرزو آرزو کیا ہوا کیا ہوا کچھ کہو کچھ کہو چپ ہو کیوں
منہ ہے فق زرد رخ چشم تر خشک لب آگ بولو کہو کس چمن میں لگی

مرحوم کو میر انیس سے الفت علامہ اقبال سے عقیدت اور عابد علی عابد سے چشمک تھی لیکن والد مرحوم کے انتقال کے چند ماہ بعد جب عابد علی عابد کا انتقال ہوا تو انہوں نے ان کے سانحۂ ارتحال پر ایک قطعہ کہا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عابد علی عابد کو ایک اہم شاعر تسلیم کرتے تھے۔ قطعہ یہ ہے۔

درد کی ٹیسوں نے دل کو کرلیا آماجگاہ
دل تو ٹوٹا تھا مرا پہلے ہی والد کے بغیر
حسرت نظارگی کچھ مضمحل سی ہوگئی
اٹھ گیا لطف سخن گوئی بھی عابد کے بغیر

انیس کی صد سالہ برسی کا اہتمام ہوا۔ اس سلسلے میں لاہور میں بیاد انیس ایک مشاعرہ ہوا جس میں مرحوم نے انیس پر ایک نظم پڑھی آپ غور فرمائیں اس چھوٹی سی سات شعری نظم میں انیس کی بارہ صفات گنائی ہیں۔

۱۔ عظمت اردو کا دل رکھ لیا۔

۲۔ شاعری کو رنگ کامل عطا کیا۔

۳۔ تا عمر مرثیہ گوئی میں مستغرق رہا۔

۴۔ شعر اس کے دل پر خود نازل ہوتا تھا۔

۵۔ دنیا کو ایک نیا رنگ ثنا خوانی دیا۔

۶۔ ہر پرانے اسلوب کو باطل کردیا۔

۷۔ خدا سے جو مانگا اسے ملا۔

۸۔ وہ دنیا کا سائل نہ بنا۔

۹۔ لفظوں اور حرفوں کو ترنم اور مزا دیا۔

۱۰۔ عیوب شعر زائل کردیے۔

۱۱۔ جدت کے خصائل اپنائے۔

۱۲۔ کربلا کی داستان سے درد کی منزل طے کی۔

میرے پاس انیس پر متعدد طویل نظمیں اور مسدس ہیں۔ میں اس نظم کا ان سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن پوری دیانت سے تحریر کر رہا ہوں کہ جو ایجاز و اختصار، معنویت کے ساتھ اس نظم میں موجود ہیں وہ اپنا الگ حسن رکھتے ہیں۔

اوپر کہہ چکا ہوں کہ مرحوم کو علامہ سے بڑی عقیدت تھی۔ علامہ اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ علامہ اقبال والی نظم میں انہوں نے علامہ کے فن شاعری اور ملتِ اسلامیہ سے ان کے لگاؤ اور حسن عقیدت کے بارے میں نہایت آسان اور عام فہم زبان میں اپنا مافی الضمیر پیش کیا ہے خاص طور سے درج ذیل شعر علامہ کی تمام کاوشوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اب اس سے بڑھ کر بس میں تیرا تھا بھی کچھ نہیں

ملت کو دے دیا وہ لہو جو بدن میں تھا

اردو اور شاعر دو الگ قبیلے کی نظمیں ہیں نظم 'اردو' کو اگر میں محاسن اردو کہوں تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ اس نظم میں ان افراد کے اسمائے گرامی بھی آئے ہیں جنہوں نے اردو زبان کو کچھ دیا ہے۔ پروفیسر حامد حسن نے اپنی کتاب داستان تاریخ اردو میں تحریر کیا ہے کہ اردو کا لفظ "تھا" پہلی بار اشرف جہانگیر سمنانی نے ساتویں صدی میں اپنے ایک رسالے میں لکھا ہے شعرائے قدیم و جدید نے اپنی تخلیق سے اردو کو جو نعمتیں بخشیں ان کا ذکر اس نظم یں بڑے عمدہ پیرائے میں کیا گیا ہے۔ آخری شعر میں زبان اردو کا ایک حسن بیان کیا ہے جس کی طرف کم شاعروں نے توجہ دی اسی ایک شعر سے مرحوم کے تخیل کی سادگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شادی و غم میں تجھے یاد کیا کرتے ہیں

تیری آواز میں فریاد کیا کرتے ہیں

شاعر کے محاسن اس کے لہجے اس کے انداز اور اس کی بلندی فکری پر متعدد شعراء نے نظمیں لکھی ہیں۔ خاص طور سے علامہ اقبال نے شاعر کو دیدۂ بینائے قوم کہا ہے۔

اس نظم میں کل نو اشعار ہیں اور شاعری کی دس صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

ا۔ شاعر انسان تو انسان ذرات خاکی کو نظر کی روشنی بخشتا ہے۔

۲۔ وہ چاہے تو برگ گل میں لوہے کی طاقت دیدیے۔

۳۔ اس کا تخیل ظلمت شب کو سحر کی تجلی بانٹتا ہے۔

۴۔ جب عالم کی تباہی کی سازش ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے وہی اس

سازش کو بے نقاب کرتا ہے۔

۵۔ جب ظلم جمہوریت کا گلا کاٹنے کے لئے بڑھتا ہے تو شاعر بے گناہ عوام کی مدد کرتا ہے۔

۶۔ شاعر حسن فطرت کا عاشق ہے اگر فطرت اس سے سر طلب کرے تو وہ سر کٹانے پر تیار رہتا ہے۔

۷۔ شاعر خود تہی دامن ہے مگر اپنے اخلاص سے تہذیب انسانی کا دامن بھر دیتا ہے۔

۸۔ وہ تھکی ہوئی انسانیت کو ذوق سفر بخشتا ہے۔

۹۔ شاعر کو خدا نے عشق کی طاقت دی ہے جس کے زور سے وہ لوہے کو موم کر دیتا ہے۔

۱۰۔ شاعر اپنی قوت ادراک سے موت کو تسخیر کرلیتا ہے اور پھر لوگوں کو جینے کا ہنر دیتا ہے۔

مرحوم نے جمہوریت، تضاد فکر، ابلیس کی قیل و قال، نیا دور، نفس مطمئنہ، رسول امن، سرکار پھر سرکار ہے، اور نہ جانے کتنی اور نظمیں تخلیق کیں لیکن آج ان نظموں کا ایک مصرعہ بھی دستیاب نہیں۔ مجھے ان کے چھوٹے بیٹے اختر ہاشمی نے بتایا کہ لاہور اور کراچی کے چند حضرات ان کی غزلیں اور نظمیں نقل کرنے کے لئے ان سے مانگ کر لے گئے۔ لیکن اصل مسودہ آج تک واپس نہ کیا۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مرحوم کی نظموں میں نہ گھن گھرج ہے نہ للکار نہ طوفانوں کا جوش و خروش ہے نہ انقلاب انقلاب کا نعرہ مگر ایک ایسی شیریں اور نرم لے ہے جو اپنی نزاکت اور میانہ روی سے قلوب دو عالم تسخیر کرلیتی ہے۔

غزل گوئی

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس شخص نے ۱۹۳۰ء سے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی جس نے لکھنؤ، سیتا پور، کان پور، فیض آباد، بارہ بنکی، جونپور، جھانسی، بنارس، الہ آباد، کلکتہ، پٹنہ، جمیر پور، جالون، مچھلی شہر آگرہ اور غازی آباد کے مشاعروں میں طرحی اور غیر طرحی غزلیں پڑھیں اور پھر لاہور آ کر جس نے متعدد غزلیں کہیں اور کتنے احباب کو شاعر بنا دیا جس نے لاہور کینٹ میں پاکستان کے مستند شاعر سید عابد علی عابد کی انجمن کے مقابلے میں متعدد شعراء پر مشتمل انجمن آرزو قائم کی اور پہلو بہ پہلو غزلیں کہیں آج اس کی صرف چودہ غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ میں نے کئی بار ان سے غزلوں کا دیوان شائع کرنے کی فرمائش کی لیکن وہ ہاں ہوں کہہ کر ٹالتے رہے یہاں تک کہ ان کی اور میری غیر حاضری میں ان کے کینٹ والے کمرے کی چھت شدید بارش کی وجہ سے ایسی گری کہ اہم کتابیں اساتذہ کے دواوین اور بیاضیں تلف ہو گئیں۔

سیتا پور میں آرزو لکھنوی کی صدارت میں طرحی مشاعرہ تھا۔ قوالی، الجھن، مدفن اور ردیف ہے تھی مرحوم نے بڑے اہتمام اور پوری قوت اور قابلیت صرف کر کے سات اشعار کہے اور اپنے استاد آرزو لکھنوی کے پاس غزل برائے اصلاح لکھنؤ روانہ کی استاد نے اصلاح کیے بغیر یہ لکھ کر غزل واپس کر دی کہ مشاعرے میں صدارت میری ہے فکر کی کوئی بات نہیں۔

بھائی صاحب مشاعرے کی تاریخ سے دو تین دن قبل جب لکھنؤ پہنچے تو وہاں کچھ اور ہی سماں نظر آیا۔ جگر مراد آبادی مرحوم اور ان کے سوا سو متعلقین مشاعرے میں شرکت کی تیاری کر رہے تھے۔ جبکہ آزاد مرحوم کے ہمنواؤں کی تعداد پندرہ افراد سے زیادہ نہ تھی۔ بھائی صاحب اور آرزو کے دیگر شاگردوں نے تین دنوں میں ڈیڑھ سو افراد

شاگرد بنائے اور سب کو لے کر مشاعرے میں پہنچے۔ مشاعرے میں نشست کی عجیب صورت تھی۔ اسٹیج پر اساتذہ فروکش تھے۔ دائیں جانب جگر مرحوم کے طرفدار اور بائیں جانب آرزو مرحوم کے ہمنوا مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے جبکہ ان دونوں پارٹیوں کے پیچھے عوام الناس تھے جب دائیں جانب کا کوئی شاعر شعر پڑھتا تھا تو اسی طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور بائیں جانب والے بالکل خاموش رہتے تھے اور جب بائیں جانب کا کوئی شاعر شعر پڑھتا تھا تو دائیں جانب والے منقار زیر پر ہو جاتے تھے۔ اسی رسہ کشی میں ایک بجے رات کے قریب بھائی صاحب مرحوم نے ترنم سے اپنی غزل شروع کی اب کیا تھا ان کی اپنی پارٹی والوں نے چیخ چیخ کر داد دی۔ مرحوم نے دوسرا یہ شعر پڑھا۔

قفس سے چھوٹ کر اپنا نشیمن ڈھونڈنے والے
جہاں بجلی گری ہے جا وہیں تیرا نشیمن ہے

مجمع نے تو شعر کو سر پر اٹھالیا اور مکرر مکرر کی آوازیں بلند ہونے لگیں لیکن اسی عرصے میں آرزو مرحوم نے پہلے مصرع کو اس طرح دہرایا۔

اندھیری رات میں اپنا نشیمن ڈھونڈنے والے

جب مرحوم نے اس تبدیل شدہ مصرع کے ساتھ شعر پڑھا تو شعر کی کم اصلاح کی داد زیادہ ہوگئی۔ افسوس کہ مرحوم کی یہ مضبوط ترین غزل بھی نہ مل سکی۔

جس زمانے میں مرحوم نے غزلیں کہنا شروع کیں آرزو لکھنوی کے علاوہ صفی، ثاقب، اثر، حسرت، دل، سیماب، ناطق، بیخود، عزیز، آغا شاعر، سائل، بے خود دہلوی، وحشت، شفیق، جونپوری، سراج، قدیر، منظر، جگر اور علامہ اقبال بساط شعر پر چھائے ہوئے تھے لیکن مرحوم نے آرزو کی شاگردی اختیار کر کے گویا یہ تسلیم کرلیا کہ وہ ذہن و عقل و تخیل کے مقابلے میں دلی جذبات اور زبان کی شاعری پسند کرتے ہیں وہ خود کہا کرتے تھے کہ

اگر میں آرزو مرحوم کی شاگردی اختیار نہ کرتا تو ثاقب لکھنوی کا شاگرد ہو جاتا۔

ان کی ابتدائی غزلوں میں وہی لکھنوی رنگ جھلکتا ہے۔ لفظوں کا برمحل استعمال چست مصرع محاورات کی بہتات جذبات کا اظہار، عشق کی مختلف کیفیات کا نقشہ، محبوب سے چھیڑ چھاڑ وفا اور جفا کے تذکرے طعن و تشنیع اور بات سے بات پیدا کرنے کا ہنر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں مرحوم کا کیفی اور سردار جعفری سے میل جول بڑھا ترقی پسند مصنفین نے اردو شاعری کا رخ بدل کر سیاسی کر دیا۔ انھوں نے ایک طرف تو قدیم الفاظ کے نئے معنی پہنائے دوسری طرف ایسے ایسے محاورات اور ایسی ایسی تراکیب وضع کیں جنھیں سن کر جوان طبقہ بڑا متاثر ہوا مرحوم کی ۱۹۳۶ء کی درج ذیل غزل شاید اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتی ہے۔

حکمِ حاکم ہے عزمِ سفر کاٹ دو
قید ہونے سے پہلے ہی پر کاٹ دو

اس ایک ہی غزل میں حکم حاکم، اہل افلاس، سر کاٹنا، والی شہر، ایوانہائے بلند، روشنی غریبوں، رنگِ سحر، طاقت، ناطاقتی، خود پناہی، گلوئے بشر، دستِ ہنر، کاٹنا جیسے الفاظ و تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔ اس غزل کی خود ردیف کاٹ دو بتاتی ہے کہ اس کا مرجع و منبع حلقۂ ترقی پسند مصنفین ہے۔ اگر مرحوم کی کہی ہوئی اس دور کی غزلیں موجود ہوتیں تو معلوم ہو سکتا تھا کہ مرحوم نے اس رنگِ تغزل کو کہاں تک نبھایا۔

۱۹۵۳ء میں لاہور میں مارشل لا لگ گیا۔ بڑے بڑے جید علما گرفتار کر کے قید میں ڈال دیے گئے۔ مولانا مودودی جیسے مشہور عالم کو سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ مذہبی طاقت پر فوجی طاقت غالب آ گئی۔ صرف لاہور نہیں پورے پاکستان کے مسلمانوں کو یہ عمل اچھا نہ لگا اور وہ خاموش احتجاج کرتے رہے۔ اگلے سال ۱۹۵۴ء

میں گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی توڑ کر ساری طاقت اور سارا اختیار اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ابھی سال گزشتہ کا مذہبی ہیجان ختم نہ ہوا تھا کہ یہ سیاسی ہیجان رونما ہوگیا۔ علم و عالم ذلیل ہونے لگے جہل و جاہل ملک کی قسمت کے مالک بن گئے۔ مرحوم بھی بتقاضائے علم اس صورت حال سے پریشان تھے اور بار بار حافظ شیرازی کا یہ مصرعہ دہرایا کرتے تھے۔

طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

معلوم ہوتا ہے کہ ملکی حالات اور حافظ شیرازی کی مذکورہ غزل سے متاثر ہو کر مرحوم نے بھی وہ غزل کہی جس کا مطلع درج ذیل ہے۔

مہبط عشق کو گریاں بخدای بینم
بند ہوتے ہوئے بازار وفا می بینم

مرحوم ۱۹۵۳ء میں ہندوستان سے پاکستان آگئے اور لاہور میں مستقل قیام کیا۔ لاہور ایک عرصے سے جدید لہجے کا شہر تھا۔ ملکی حالات کی سنگینی نے مزاحمتی رجحان شدید سے شدید تر کردیا۔ فیض اور ندیم تو پہلے ہی ترقی پسند گروہ میں شامل تھے۔ احسان دانش جیسا کلاسیکل شاعر بھی مزاحمتی غزل کہنے پر مجبور ہوگیا۔ ان کی ۱۹۵۸ء کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

جوان خون نئے کھیت کو مفید سہی
زمین فصل کو خود کھاگئی تو کیا ہوگیا
نہ رہنماؤں کی محفل میں لے چلو مجھ کو
میں بے ادب ہوں ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

لاہور ہی کے ایک اور کلاسیکل شاعر محسن برلاس کا مقطع ملاحظہ فرمائیں۔

تمناؤں کا پھر اک قافلہ لیکر چلے محسن
اگر لوٹا گیا یہ بھی سر منزل تو کیا ہوگا

مرحوم کی غزلوں میں یہی رجحان طبع در آیا ورنہ لکھنو اسکول کے شعراء کی غزلوں میں اس ڈھب کے اشعار شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے۔

انسان سے رخصت ہوا معیار فضیلت
دستار تو لاکھوں ہیں مگر سر نہیں ملتا

برق و باراں کی جو سازش میں ہے مدت سے شریک
آشیانہ اسی ڈالی پہ بناتے کیوں ہو

یہ کیا والئی شہر نے فیصلہ
جو جھکاتا نہیں سر تو سر کاٹ دو

فیض پائے نہ طاقت سے ناطاقتی
رشتۂ آفتاب و قمر کاٹ دو

دھوپ جب صحرا میں تڑپانے لگے
ایک ٹہنی کا بھی ہے سایا بہت

مرے ہی باغ وفا سے نہ پھل ملے مجھ کو
مگر میں خوش ہوں کہ کچھ ڈالیوں کے سائے ہیں

حبیب ان کو کبھی رہزنوں کا خوف نہیں
جو اپنے گاؤں میں کچے مکان بناتے ہیں

۱۹۷۶ء کے بعد مرحوم لاہور سے کراچی منتقل ہوگئے کراچی میں ان پر وہ افتاد

پڑی کی شعر وشاعری کی فرصت ہی نہ ملی وہ آخر دم تک میر حسن کا یہی شعر گنگناتے رہے۔

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

اپنی تما دشواریوں پریشانیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان کی غزلوں میں قدیم اور جدید رنگوں کا حسین امتزاج ہے اگر ایک طرف عشق و عاشقی کے مسائل کی تشریح و توضیح ہے تو دوسری طرف قوم کو خواب سے بیدار کرنے کا جذبہ ہے۔ ہر دو صورتوں میں نہ ان کی غزلوں میں جرأت کی چوما چاٹی ہے نہ رند اور صبا کا ابتذال ہے ان کی غزلیں مختلف ادوار کا آئینہ دکھاتی ہیں جس میں سوز وغم بھی ہے اور رجائیت کے ساتھ آزادی کی تڑپ رکھنے والے مجاہد کی للکار بھی ہے۔

طنز کی رو غالب و مومن سے ہوتی ہوئی یگانہ چنگیزی تک پہنچی مرحوم کے کلام میں اور ان کے لہجے میں جو تیزی ہے ممکن ہے وہ یگانہ ہی کی صحبت کا اثر ہو کیوں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ یگانہ کی محفلوں اور مجلسوں میں کثرت سے شرکت کرنے لگے تھے۔ یگانہ کی غزل کا درج ذیل شعر اس دور میں بہت مشہور تھا۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ خدا بنا گیا

اس سلسلے میں مرحوم کے چند طنزیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

انداز دلبری کے دکھا کر کریں گے کیا
آئے وہ میرے بعد تو آ کر کریں گے کیا

آ تو جاتے کہ وقت آخر تھا
میرے مرنے ہی کی دعا کرتے

ذرا بتائیں جو فرقت میں ہم پہ بیت گئی
یہ وقت آپ پہ پڑتا تو آپ کیا کرتے

کوئی سنتا نہیں تسبیح کے دانوں کی پکار
دست زہاد میں آلات غنائی ہیں

پھر دیکھنا سفید پروں پر سیاہ داغ
روشن کبھی تو ہوگی مری بے بسی کی آگ

مرحوم نے غزل قصیدہ اور نظموں کے علاوہ قطعات، رباعیات اور گیت بھی لکھے ہیں موجودہ دیوان میں گیارہ رباعیات، سترہ قطعات اور صرف ایک گیت ہے۔ قطعات و رباعیات کا اسلوب قدیم ہے ان میں مذہبی ملکی معاشرتی جذباتی اور سیاسی رنگوں کی آمیزش ہے جہاں کہیں طنزیہ یا اصلاحی پہلو آ گیا ہے تو خیالات کی رسائی اور شاعر کی اپنی فنکارانہ قابلیت کا گہرا عکس نظر آ جاتا ہے۔ مثلاً

شمشیر سے امید نوازش کیسی
بدبخت سے توفیق سفارش کیسی
شاعر ہے تو کر ژرف نگاہی پیدا
جب ابر نہیں ہوگا تو بارش کیسی

آئے ہوئے لب پہ لفظ تو لے گا
موتی نہ کبھی مثل خذف رولے گا
لازم ہے کہ دل ہو آئینے کے مثل
آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا

مغموم طبیعت کو روانی دے دو
پیری جو طلب کرے جوانی دے دو
جب کھیت کی آغوش ہو سبزے سے تہی
قسمے میں نہیں ہوا تو پانی دے دو

قصیدہ نگاری

لکھنؤ میں غزل کے علاوہ قصیدوں اور مرثیوں کا بھی بڑا شہرہ تھا۔ مرحوم نے چھ سال کی قلیل مدت میں اپنے استاد آرزو لکھنوی کے زیر تربیت اپنے مخصوص ترنم کی وجہ سے غزل میں اچھا خاصا نام پیدا کیا لیکن ۱۹۳۶ء تک ان کا کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔

۱۹۳۵ء میں والد مرحوم کا تبادلہ جون پور سے مچھلی شہر ہوگیا۔ ۱۹۳۶ء میں اختر حسین سروش مچھلی شہری مجھے انگریزی پڑھانے پر مقرر ہوئے جناب سروش اور ان کے برادر خود نیر حسین جوش غزل اور قصیدے میں ممتاز شعرا میں شمار ہوتے تھے ان دونوں بھائیوں نے تیسری شعبان ۱۹۳۶ء میں ولادت امام حسین کے سلسلے میں ایک عالیشان محفل کا انعقاد کیا اور دور دراز سے متعدد شعراء مدعو کئے گئے۔ محفل کے انعقاد سے ایک ہفتہ قبل بھائی صاحب مرحوم لکھنؤ سے مچھلی شہر پہنچے ماسٹر اختر حسین نے انہیں محفل میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ محفل محلہ سید واڑہ کے امام باڑے میں ہوئی۔ ابتداء میں میں نے بھی والد مرحوم سے پانچ اشعار لے کر پڑھے تھے گیارہ بجے رات کو بھائی صاحب مرحوم نے ایک قطعہ اور اکیس اشعار کا قصیدہ پڑھا میں نے دیکھا کہ محفل کا ہر آدمی لہک لہک کر داد دے رہا ہے۔ قطعہ چونکہ بار بار پڑھا گیا اس لئے مجھے بھی یاد ہوگیا۔

لہو سے سارے زمانے کو لالہ زار کریں
حسین آئیں تو اسلام استوار کریں

تھپیڑے کھائے کشتی تو کون روکے گا

نبی سے کہہ دو نواسے کا انتظار کریں

قصیدے کے مطلع کا دوسرا مصرع ذہن میں رہ گیا۔

اب نہ پائے گا زمانہ نہ کوئی رہبر ایسا

مرحوم نے کل چودہ قصیدے کہے تھے لیکن مجھے ان کے شاگردوں کی بیاضوں سے صرف آٹھ قصیدے ملے ہیں جن میں ۱۹۳۶ء کا مذکورہ قصیدہ نہیں ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ یہ قصیدہ استاد کی اصلاح کے بغیر تھا۔ اس لئے مرحوم نے اسے کسی جگہ پھر نہ پڑھا۔ نہ بیاض میں محفوظ کیا۔

مرحوم کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں جلال، نظم، طبا طبائی، محشر، صفی، عزیز اور آرزو کی قصیدہ گوئی کا عام چرچا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ عزیز، محشر اور صفی مرحومین سے مرحوم ملاقاتیں بھی کرچکے تھے۔ وہ اکثر اپنی گفتگو میں عزیز کی قادر الکلامی کا تذکرہ بھی کیا کرتے تھے اور انہی کے کلام سے مرعوب تھے۔

مرحوم کے یہ آٹھوں قصیدے آئمہ، طاہرین کی مدح میں ہیں اسی بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قصیدے کسی طمع یا دنیاوی لالچ کی غرض سے نہیں کہے گئے بلکہ ان قصائد کی بنیاد خلوص وعقیدت پر رکھی گئی ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک شعر سے محبت و مروت کے دریا ابلتے نظر آتے ہیں نہ خیالات میں رکاکت ہے نہ تخیل میں ابتذال ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاک ہستیوں کا تذکرہ پاک فضا میں کیا جارہا ہے۔ یہ قصائد طویل نہیں نہ ان میں ممدوح کی سیرت وصورت کی تفصیل ہے۔ اشارے اور کنائے میں وہ تمام باتیں کہی گئی ہیں جو سامعین کے قلوب کو معطر اور ان کے ذہنوں کو کشادہ کردیں۔

قصیدوں کی تشبیب میں غزل کا عنصر کارفرما ہے یہی سبب ہے کہ زبان میں مٹھاس

اور لہجے میں دھیما پن آ گیا ہے۔ عزیز لکھنوی کو سودا اور ذوق کا انداز پسند تھا لیکن مرحوم کا رجحان میر اور غالب کے قصائد سے متاثر ہے ان کے ایک قصیدے کی تشبیب ملاحظہ ہو۔

ابھی آغاز الفت ہے ابھی کچھ عہد و پیماں ہے
جو نبھ جائے تو جانو منہ سے کہہ دینا تو آساں ہے
لٹا کر کربلائے عشق میں سرمایۂ ہستی
چلا ہوں سر کٹانے یوں کہ خود قاتل بھی گریاں ہے
جوانی لا کے پیغام اجل خود مجھ پہ روتی ہے
اجل اب دیکھ کر صورت مری خود ہی پریشاں ہے
ارے او آنے والے تربت دل ہر قدم پر ہے
سنبھل کر پاؤں رکھنا دیکھنا گور غریباں ہے
سفینہ حسرتوں کا ڈوبتا ہے آج خشکی میں
جہاں پانی کی موجیں ہیں نہ دریا ہے نہ طوفاں ہے

ایک قصیدے کی تشبیب میں صبح کا منظر اور دو قصیدے براہ راست مدح کے اشعار سے شروع ہوئے ہیں۔ قصیدوں میں گریز کی منزل انتہائی مشکل ہے۔ اس مقام پر عام شعراء کے قدم ڈگمگا گئے ہیں لیکن مرحوم نے اس میدان کو اس خوبی سے سر کیا ہے کہ ان کی عظمت شاعری کا لوہا ماننا پڑتا ہے اور ان کے اس جوہر کی داد دینا پڑتی ہے۔ اسی مندرجہ ذیل بالا قصیدے میں غزل کے آخری شعر کے بعد گریز ملاحظہ فرمائیے۔

کہاں تک اے حبیب زاد ذکر غم خبر بھی ہے
پھر آئی تیری شعباں کہ ہر وادی گلستاں ہے

امام حسنؑ کے ایک قصیدے میں بہاریہ تشبیب ہے اس کے آخری شعر کے بعد یوں گریز کیا ہے۔

چلو سیر چمن کو تم حبیب راز سنتے ہیں
گلوں نے بزم میلاد حسن گلشن میں برپا کی

حضرت علیؑ کے ایک قصیدے میں بارہ اشعار پر مشتمل ایک غزل ہے اس کا آخری شعر اور گریز کا شعر یوں ہے۔

نہ کھلنے سے جو قفل در نہ مل سکتا ہو پیمانہ
چلو ٹکرا کے سر ہی شق کریں دیوار میخانہ
ہو مشکل تو بلالیں فاطمہ کو کھول دیں آکر
ہمارے میکدے کو جیسے حیدر کا زچہ خانہ

قصیدے کا اصل مقصد ممدوح کی مدح سرائی ہے۔ قدیم شعراء مدح کرتے ہوئے زمین و آسمان کے قلابے ملادیتے تھے اور تعریف و توصیف اس انداز سے کرتے تھے کہ سامعت ششدر و حیران ہوجاتی تھی۔ چونکہ مبالغہ ایک دل پسند صفت تھی۔ اس لئے ہر شاعر مدح میں ایسی مبالغہ آرائی کرتا تھا کہ دل و زباں سے واہ نکلنے کے بجائے ہنسی آجاتی تھی۔ مرحوم کے کلام میں مبالغے کا عنصر ناپید ہے ان کے مدحیہ اشعار صاف شفاف رواں دواں اور اصلیت سے نزدیک تر ہیں جہاں کہیں مبالغہ یا انہونی بات نظر آتی ہے وہ حضور رسالت مآب یا آئمہ طاہرین کے اقوال ہیں شاعر نے اپنی طرف سے ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کیا۔

حضرت علیؑ کی مدح کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جب شوق عبادت میں واں بنتِ اسد آئیں
ہنستی ہوئی کعبے کی دیوار نظر آئی

کعبے ہی میں بچے کے تیور کے اشارے ہیں
کچھ بڑھ کر کرے گا یہ کونین پہ دارائی
ہاتھوں کو جھٹکتا ہے رہ رہ کے ہمکتا ہے
اصنام و تکتا ہے لے لے کے یہ انگڑائی
آغوش میں احمد نے جس دم لیا بھائی کو
ملتی ہوئی صورت سے تصویر نظر آئی
مسجد سے نظر جس کی افلاک کے پردوں تک
جبریل کو دیکھ آئی اللہ ری بینائی
اے احمد لاثانی کیا چاہئے اب تم کو
زہرا سی ملی بیٹی حیدر سا ملا بھائی

قدیم قصیدہ نگاروں نے اپنے قصیدوں میں تلمیحات سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے کبھی رسول خدا کی حدیث اور آئمہ کے اقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے شعروں میں نہایت چابکدستی اور فنکاری سے تلمیحات کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً حضور کی ایک مشہور حدیث ہے کہ میں اور علی دونوں ایک ہی نور سے ہیں۔

اسی کے ذیل میں حضرت علی کا ایک قول ملتا ہے کہ "میں نے تمام انبیاء کی پوشیدہ طور پر مدد کی ہے۔ ان اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے مرحوم نے حضرت علی کی مدح میں اس قسم کے اشعار کہے ہیں۔

علی کا نور حق ہے عالم پر یہ روشن ہے
مؤید میرے دعوے کی حدیثیں ہیں پیمبر کی

یہ شمع حسن خالق مختلف فانوس میں آئی
بنے کون و مکاں قندیل اک مصباح انور کی
کبھی پیشانی آدم میں چمکا یہ بصد عزت
بھی وہ امر رب تھا جو بنا تھا روح پیکر کی
سفینہ بن کے طوفاں سے نکالا نوح کو اس نے
وگرنہ کیا بچالیتیں انہیں موجیں سمندر کی
نکالا چاہ سے یوسف کو بھی حبل متیں بن کر
بچائی جاں علی کے عشق نے اس حسن پیکر کی
کبھی نمرود کا آتش کدہ گل کردیا اس نے
کبھی مفلوج کردی خود سری فرعون کے سر کی
کبھی داؤد کی رگ رگ میں نغمہ بن کے یہ دوڑا
کبھی بنایا موم لوہے کو خبر لو باب خیبر کی
ہوئے خاموش سب نغمے چہ عبرانی چہ سریانی
صدائے کعبے میں دی حیدر نے جب اللہ اکبر کی

اب نہ وہ قصیدہ نگار رہے نہ وہ قصیدے، جب مرثیوں کے بند کی تعداد دو ڈھائی سو سے گھٹ کر ساٹھ ستر ہوگئی اور انہیں بھی سننے والے سامعین نہیں ملتے تو طویل قصیدوں کو سننے والے کہاں سے آئیں گے یہی سبب ہے کہ طویل قصیدے تقریباً ختم ہوگئے اور ان کی جگہ منقبت نے لے لی ہے اور ان کی ہیئت بھی سلام سے ملتی جلتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حبِ حبیب

پروفیسر سحر انصاری

ہر عہد اور ہر علاقے کا ایک کلچر ہوتا ہے اور اس کلچر کے مظاہر اس کے شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں نظر آتے ہیں۔ ہمارے حصے میں جو تاریخی تجربہ آیا ہے اس نے قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد کی دنیا کو عجیب طرح تقسیم کردیا ہے یوں ہی جیسے غالب نے ۱۸۵۷ کے "رستا خیز لے جا" کے بعد مرزا تفتہ کو لکھا تھا کہ ہر چند یہ دنیا اور اس کے رہنے والے وہی ہیں لیکن ایک بات بھی اس، زمانیکی نہیں پائی جاتی۔ تحریک آزادی کی جدوجہد نے ہمیں آزادی جیسی نعمت سے ضرور سرفراز کیا لیکن کلچر کے بہت سے منطقے ہم سے بچھڑ بھی گئے۔ انہی میں سے ایک جونپور بھی ہے۔ اس کی تاریخ اور سلاطین شرقی کے تہذیبی آثار سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ اس خطے نے برصغیر میں نامور علما اور اہل دانش پیدا کیے ہیں۔ یادش بخیر پروفیسر مجتبیٰ حسین کا تعلق بھی جونپورر سے تھا۔ میں مدتوں ان کے ساتھ رہا۔ میں نے یہی دیکھا کہ جب وہ خود یا کوئی اور جونپور کا نام اپنی زبان سے ادا کرتا تو مجتبیٰ صاحب مرحوم سینے پر داہنا ہاتھ رکھ کر سر کو تعظیماً جھکا دیا کرتے تھے۔ اس عمل میں میں نے انہیں کبھی غافل نہیں پایا۔

اسی جون پور کے ایک ادب دوست اور علم پرور خانوادے کی ایک قابل ذکر شخصیت کا تذکرہ اس وقت مقصود ہے۔ نام نامی مولانا محبوب الحسن صاحب، تخلص حبیب جونپوری، آپ ایک جید عالم دین اور خوش فکر شاعر تھے۔ استعدادِ زمانہ اور ہجرت کے متعلقات نے

شاعری کے سرمایے کو محفوظ نہ رہنے دیا۔ تاہم مقام مسرت ہے کہ مولانا کے خاندان کے بعض افراد جو خود بھی علم وفضل کی دولت سے بہرہ یاب ہیں، حبیب جونپوری صاحب کا کلام محنت اور جانفشانی سے یکجا کیا ہے۔ ان حضرات میں مشہور شاعر اور مرثیہ نگار جناب وحید الحسن ہاشمی اور مولانا سید محمد باقر زیدی صاحب کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی حبیب جونپوری صاحب کے برادر خرد اور مولانا سید محمد باقر زیدی صاحب کے خلف اکبر ہیں۔ مجھے ان ہر دو شخصیتوں سے ملاقاتوں اور نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔ ان کے علم وفضل اخلاق و اخلاص کا دل سے قائل ہوں۔ انہی حضرات نے حبیب جونپوری صاحب کا کلام اور مختصر حالات زندگی فراہم کیے ہیں اور یہ سعادت میرے حصے میں آئی کہ میں حبیب جونپوری صاحب کی حیات وفن کی نسبت سے کچھ خامہ فرسائی کرسکوں۔

دور جدید میں شاعر کے ذاتی کوائف اور حالات زندگی کے ضمن میں دو واضح رویے چل رہے ہیں۔ ایک طبقے کا کہنا ہے کہ جب تک شاعر کے مزاج، اس کی تعلیم و تربیت، پسند و ناپسند کے معیارات، میلانات ونظریات کا علم نہ ہو، کلام کی مکمل تفہیم ممکن نہیں۔ یہ طبقہ شاعری کو شاعری شخصیت کا آئینہ سمجھتا ہے۔ دوسرا طبقہ جس کا سرخیل ٹی ایس ایلیٹ کو سمجھنا چاہئے اس امر پر یہ مصر ہے کہ کلام کو اس کے شعری متعلقات کے ساتھ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ شاعری شخصیت کے اظہار کا نہیں بلکہ شخصیت سے گریز کا نام ہے تاہم ہماری روایات شعر وسخن میں شخصیت اور اس کی شناخت کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ مولانا حبیب جونپوری صاحب کے کلام پر اظہار رائے سے قبل ان کی ذاتی اور خاندانی پس منظر کا مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

سید محبوب الحسن ہاشمی ۱۹۱۸ء میں بمقام جونپوری پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی سید شبیر حسن صاحب خود بھی شاعر تھے اور صفا الہ آبادی تخلص فرماتے تھے۔ اس دور کے عام رواج کے مطابق محبوب صاحب نے دینیات اور ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ پھر ٦ سال سے

۹ سال تک مڈل کے امتحان کے لئے درسی تعلیم بھی مکان پر ہی ہوئی۔ والد صاحب کی نیت تھی کہ لڑکا پیدا ہوگا تو عربی پڑھاؤں گا۔ چنانچہ جونپور کے ناصریہ اسکول میں فقہ ادب تاریخ حدیث قرآن کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔اس اسکول کے پرنسپل مولانا شبر فیض آبادی تھے جن کے بیٹے مولانا عابد شبر ریڈیو پاکستان میں عربی اور فارسی کے نیوز کاسٹر تھے۔

محبوب صاحب کے والد ۱۹۲۶ء میں زیارت کربلا کے لئے جانے لگے تو لکھنو میں اپنے عزیز سید کاظم حسین ایڈووکیٹ کے سپرد کر گئے۔ ان کی وساطت سے محبوب صاحب نے تفسیر، حدیث، فقہ کی تعلیم حاصل کی، لکھنؤ میں قیام کے دوران وہاں کے ادبی ماحول سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی۔ حبیب تخلص اختیار کیا اور آرزو لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا۔

لکھنؤ میں قیام کے دوران حبیب جونپوری صاحب نے اردو میں ادیب، ماہر اور ادیب کامل کی اسناد حاصل کیں۔ اس کے بعد فارسی میں منشی، منشی کامل اور منشی فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ اسی طرح عربی میں مولوی، مولوی عالم اور مولوی فاضل کی اسناد حاصل کیں۔ ان اسناد کے حصول کا زمانہ ۱۹۳۷ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔

حبیب صاحب کی متاہلانہ زندگی کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۳۳ء میں بعمر ۱۶ سال مولوی سید مہدی علی صاحب کی دختر کنیز زہرا سے شادی ہوئی۔ ان سے پہلی اولاد مولانا سید محمد باقر زیدی ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ حبیب صاحب کے تین صاحبزادے سید معصوم رضا، سید منقاد حیدر، اختر ہاشمی اور سید منصور حیدر ہیں۔ صاحبزادیوں کے نام سیدہ شمیم فاطمہ اور سیدہ اعجاز فاطمہ ہیں۔

حبیب صاحب کو تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیلوں سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ شادی سے قبل کے برسوں میں ہاکی، فٹ بال، والی بال وغیرہ میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں الہ آباد کے ایک اسکول میں عربی اور فارسی کے مدرس کی حیثیت سے ملازمت

لی۔ ضلع جالون کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں انہی مضامین کے مدرس مقرر ہوئے۔

برصغیر پاک و ہند میں تیسری دہائی تک آزادی وطن کی تحریک بہت زور پکڑ چکی تھی۔ اس وقت کے نوجوان اپنے اپنے میلان طبع کے مطابق اس سے متاثر تھے ہاشمی صاحب بھی کانگریس کی مخالفت میں دو ماہ جیل میں رہے۔

۱۹۴۳ء میں لیبر آفیسر ہو کر کلکتہ چلے گئے۔ ۱۹۴۵ء میں چھیونکی ضلع الہ آباد کنٹونمنٹ میں بحیثیت لیبر آفیسر ملازمت کرلی۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں سید سجاد حیدر یلدرم کے شہر نہٹور کے ایک اسکول میں عربی فارسی کے مدرس کی حیثیت سے ملازمت کرلی۔ ۱۹۸۴ء میں نیشنل انٹر کالج مودہا ضلع میرپور میں پرشین کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں ترک وطن کر کے لاہور آگئے۔ جہاں پہلے سے ان کے بھائی سید وحید الحسن ہاشمی اور دیگر اعزہ موجود تھے۔ اسی سال گورنمنٹ ہائی اسکول، آر اے بازار میں عربی فارسی ٹیچر ہوگئے۔ ۱۹۷۶ء تک اسی عہدے پر فائز رہ کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں کراچی منتقل ہوگئے۔ ۱۹۷۷ء میں سجادیہ مسجد و امام بارگاہ میں پیش امام مقرر ہوئے۔ اس منصب پر ۱۹۸۷ء تک فائز رہنے کے بعد ۱۹۸۷ء ہی میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا محبوب الحسن علم جفر، علم رمل، علم الاعداد، اور علوم نجوم جاننے کی وجہ سے خدمت خلق کے طور پر قرآنی آیات سے روحانی علاج کرتے رہے جس میں انہیں بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ آج کل مولانا باقر زیدی صاحب اسی فریضے کو انجام دے رہے ہیں۔

مولانا محبوب الحسن کے ان کوائف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی متنوع واقعات کا مجموعہ تھی۔ انہوں نے زندگی کے تجربات کو محسوس کیا اور خدمت خلق اور تخلیق شعر کے ذریعے دنیا کی رہنمائی بھی کی۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ لیکن دوسری

جنگ عظیم کے دوران جوش ملیح آبادی، سردار جعفری اور احسان دانش سے متاثر ہو کر نظم نگاری کی طرف آئے اور متعدد نظمیں کہیں۔

ان کی ایک نظم "بیوہ کی خودکشی" بہت اثر انگیز ہے اور اسی عہد میں اس طرح کے موضوعات اور اسالیب میں لکھی جانے والی نظموں سے کسی طرح کم نہیں۔ لطافت اظہار، نزاکت احساس اور محاکات کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔

چند تارے ہیں بھی تو بے نور پتھرائے ہوئے
جیسے باسی ہار میں ہوں پھول کمہلائے ہوئے
کھپ گیا ہے یوں گھٹا میں چاندنی کا صاف رنگ
جس طرح مایوسیوں میں دب کر رہ جائے امنگ
چھا رہا ہے ایک سناٹا سا باغ دہر پر
آنکھ جھپکالی ہے نرگس نے اداسی دیکھ کر
بے خودی میں اک جہاں خاموش ہے سرشار ہے
گوش بلبل کو چٹخنا بھی کلی کا بار ہے

اس طرح کی نظموں میں تشبیہات و استعارات کی ندرت کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری اور منظر کشی پر بھی قدرت ملتی ہے، انسانی نفسیات سے آگاہی کے بعد ہی ایسے اشعار کی تخلیق ممکن ہو سکتی ہے۔

آنکھ میں آنسو بھرے ہیں دل میں پنہاں درد ہے
لگ گئی ہے چپ سی اک چہرے کی رنگت زرد ہے
دل سنبھلتا ہی نہیں ہے سینۂ صد چاک سے
پھول سا چہرہ اٹا ہے بیوگی کی خاک سے

اڑ چلی ہے رنگ رخ بن کر حیات مستعار
ہو رہا ہے قلب مردہ میں جوانی کا فشار
حسرتیں دم توڑتی ہیں یاس کی آغوش میں
سیکڑوں شکوے مچلتے ہیں لب خاموش میں
سوگ کے کپڑوں میں نازک جسم کفنائے ہوئے
رو رہی ہے دل میں ارمانوں کو دفنائے ہوئے

مصرعوں کی ساخت، روانی اور قدرت کلام ان نظموں کی خاص سطح کا تعین کرتی ہے اور اسی سے مولانا کی انفرادیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔

اسی طرح اس مجموعے کی دوسری نظمیں ''نامعلوم حسرت'' ''شکست حسن'' ''حسرت دیدار'' ''عہد ماضی'' ہر اعتبار سے لائق مطالعہ نظمیں ہیں۔ ان میں ذاتی کیفیات قلب کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کے کئی پہلوؤں کی تصویر کشی ملتی ہے۔ رومان حسن و عشق، سماجیات کے ساتھ ساتھ حبیب صاحب کی نظمیں، آزادی وطن کی جدوجہد سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔ ''نواکھلی'' کے فساد سے متاثر ہو کر ۱۹۴۶ء میں ایک نظم ''لاشیں'' لکھی تھی جو شاید آج بھی اتنی ہی اثر انگیز ہے جتنی ۱۹۴۶ء میں تھی۔

صبر کیوں کر ہو دیکھ کر لاشیں
جا بجا خون در بدر لاشیں
آسماں ان پہ خون روئے گا
یہ نہ سمجھو ہیں کم اثر لاشیں
دیکھ کر مہروش شہیدوں کو
کرنیں گزری ہیں چوم کر لاشیں

آرزوئے حصول مقصد میں
سو رہی ہیں زمین پر لاشیں
آج اہل نظر نے پھر دیکھا
عرش پر خون، فرش پر لاشیں
دیکھتے آئے ہیں یونہی ہم لوگ
عمر بھر دھوپ، عمر بھر لاشیں

ایک اور نظم ''فرنگی'' باغیانہ خیالات کی حامل ہے۔ انگریز قوم کی شاطرانہ چالوں، منافقت اور حکمرانی کے نت نئے طریقوں اور چیرہ دستیوں کو طنز و بغاوت کے پیرائے میں لکھا ہے۔ یہ نظم بھی آزادی کی جدوجہد کے پس منظر میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اور صرف نظموں ہی میں نہیں بلکہ غزلوں میں بھی انگریز کی مسلط کردہ غلامی کے خلاف ایک ردعمل ملتا ہے۔ اس شعر کے لئے مولانا نے خود وضاحت کردی ہے کہ ''سفید پروں'' سے مراد انگریز ہے۔

پھر دیکھنا سفید پروں پر سیاہ داغ
روشن کبھی تو ہوگی مری بے بسی کی آگ

جیسا کہ کہا جاچکا ہے مولانا بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ آپ کے یہاں ایک رنگ کبھی کبھی اپنے استاد آرزو لکھنوی کا بھی بڑی خوبی سے جھلک اٹھتا ہے۔ مثلاً یہ غزل۔

تقدیر بگڑتی جاتی ہے گو بات بنائے جاتے ہیں
وہ اتنا ہی روٹھے جاتے ہیں ہم جتنا منائے جاتے ہیں

اب جا کے نہیں آنے والے کچھ طور یہ پائے جاتے ہیں

ہنستے ہیں تسلی دینے کو اور اشک بھی آئے جاتے ہیں

لیکن اس طرح کی غزلوں میں بھی مولانا کی سیاسی وابستگی اور قومی شعور کسی نہ کسی شعر میں نمایاں ہو ہی جاتا ہے۔

ان کو ہے چمن سے کیا مطلب یا پھول کھلیں یا آگ لگے

جن تنکوں نے رشتہ جوڑا تھا چن چن کے جلائے جاتے ہیں

مولانا کے رنگ غزل کی نمائندگی کسی ایک رخ کے اشعار کے انتخاب سے ممکن نہیں۔ ان کی غزلیں بھی پہلو دار ہیں اور غور و فکر کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات کی تپش بھی رکھتی ہیں۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جو سطح آب پہ ابھرا، ابھر کے ٹوٹ گیا

وہ میری عمر کا آئینہ تھا حباب نہ تھا

اسے پسند نہ آیا خلوص دل نہ سہی

حبیب تیری وفا کا کوئی جواب نہ تھا

بحر ہستی سے تباہی کی شکایت ہے عبث

نقش بہتے ہوئے پانی پہ بناتے کیوں ہو

درد کی لے کا نہیں لحن سکوں سے کوئی ربط

میری آواز سے آواز ملاتے کیوں ہو

ذرے سے جو سنتا ہوں میں سورج کی کہانی

یہ آگہی مدت کی ریاضت سے ملی ہے

گاہکوں نے مرے سر کی تو لگائی قیمت
میری الفت کے نہ دنیا میں خریدار ملے

حبیب صاحب نے ایک نظم "شاعر" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اسے ان کا منشور شاعری کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے نہایت سلیقے سے شاعر کے منصب اور اس کی سماجی و تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر کو معاشرے کی ایک فعال اور انقلاب آفریں شخصیت سمجھتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر تعمیری، مقصدی اور مثبت ہے۔ یوں تو یہ نظم کتاب میں شامل ہے لیکن میں چاہوں گا کہ اس پر یہیں توجہ مرکوز ہوجائے تو بہتر ہے۔ یہ ۱۹۳۹ء کی نظم ہے۔

شاعر

خاک کے ذروں کو تنویر نظر دیتا ہے وہ
پھول کی پتی کو لوہے کا جگر دیتا ہے وہ
جب اسے مہمیز کرتی ہے تخیل کی ادا
ظلمت شب کو تجلی سحر دیتا ہے وہ
سازش بربادی عالم جہاں جب بھی ہوئی
ساری دنیا جاگ جاتی ہے، خبر دیتا ہے وہ
جب رگ جمہوریت کو کاٹنے بڑھتا ہے ظلم
بے گناہی صبر کرتی ہے اثر دیتا ہے وہ
اس قدر فطرت کے حسن دلربا پر ہے فدا
طالب سر ہو اگر فطرت تو سر دیتا ہے وہ

خود تہی دامن سہی لیکن زر اخلاص سے
دامن تہذیب انسانی کو بھر دیتا ہے وہ
عظمت آدم سے کرکے منضبط اپنا سخن
غمزدوں کو جرأت ذوق سفر دیتا ہے وہ
قلب شاعر کو ملی ہیں عشق کی سب برکتیں
عشق ہی سے قلب آہن موم کردیتا ہے وہ
موت کو تسخیر کر کے قوت ادراک سے
مردنی چہروں کو جینے کا ہنر دیتا ہے وہ

اس نظم کی فصاحت و بلاغت دیدنی ہے۔ اس میں ذرے سے لے کر آفتاب اور موت سے لے کر حیات تک کے وسیع دائرے کو نہایت ایجاز کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ عام طور پر اردو میں "شاعر" کے بارے میں جو کلام ملتا ہے اس کی ردیف "میں" رہی ہے جیسے۔

شاعر فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

ہر چند کہ اس کا "میں" واحد متکلم کے ساتھ ساتھ ایک "آفاقی میں" (Universal I) بھی ہے جو نوع آدم کی نمائندگی کرتا ہے تاہم اس میں تعلّی کا پہلو بہر حال نکل آتا ہے۔ مولانا حبیب کی نظم اس سے پاک ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے۔

مولانا محبوب الحسن حبیب جونپوری لکھنؤ میں قیام کے دوران وہاں کے ماحول سے متاثر ہوئے اور قصیدہ نگاری بھی کی اور اپنے لئے ایک خاص مقام اس صنف سخن میں پیدا کیا۔ نظم نگاری پر انہیں قدرت تو تھی۔ جب قصیدے کی طرف توجہ ہوئی تو اس میں بھی

انفرادیت کے جوہر نمایاں کئے۔ حضرت علیؑ، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اور حضرت امام زمانہؑ کی شان میں جو قصائد کہے ہیں ان میں حبیب صاحب کے اسلوب کی ندرت قلب وذہن کے لئے باعث کشش ہے۔ ان کا مطالعہ ایک الگ باب تحسین کا متقاضی ہے۔

مولانا محبوب نے اپنے کلام کی اشاعت، ترتیب و تدوین پر بہت کم توجہ دی۔ اگر وہ دیگر شعراء کی طرح ایک منظم انداز میں اپنی شاعری تخلیقات کی اشاعت فرماتے تو بلاشبہ انہیں ادب میں وہ مقام ملتا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ لوگ مولانا حبیب جونپوری کے مقام و مرتبہ سے ان کی زندگی میں آگاہ نہیں تھے، روش زمانہ تو یہی ہے جس کی طرف غالب نے بڑی خوبی سے اشارہ کیا ہے۔

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی

مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

قیام لاہور کے درمیان آر۔ اے بازار کے قریب پروفیسر عابد علی عابد اپنے متعدد شاگردوں کے ساتھ نشست فرماتے تھے اور لاہور کے ادبی ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ مولانا محبوب کی پختہ کلامی کو دیکھتے ہوئے بہت سے شاعر ان کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ اس طرح لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں ایک محاذ آرائی کی کیفیت پیدا ہوگئی جو اردو غزل کو آگے بڑھانے میں مدد و معاون ثابت ہوئی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا محبوب الحسن حبیب جونپوری کے اس مجموعہ کلام کو زیادہ سے زیادہ ادبی حلقوں میں پہنچایا جائے تاکہ اہل ذوق حضرت ان کے کلام کے محاسن سے مستفیض ہوسکیں۔

☆☆☆☆☆

حبیب جونپوری۔ ایک مطالعہ

پروفیسر عبدالکریم خالد

فیروز شاہ تغلق کے بسائے ہوئے شہر جون پور کی علمی و ادبی، مذہبی اور تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ سینکڑوں ایسی بلند پایہ اور عظیم شخصیات ہیں جنکے قدوم میمنت لزوم نے اس شہر کو اعتبار بخشا اور تاریخ نے اسے "شیراز ہند" کے نام سے سرفراز کیا۔ آج بیسویں صدی کے آخری دہے میں شاید جونپوری کو وہ مقام حاصل نہ رہا ہو، جو ماضی میں تھا۔ دہلی، لکھنؤ، آگرہ، الہ آباد اور ان جیسے نہ جانے کتنے شہر ہیں جو اپنے روشن خیال اور عالی دماغ اسلاف کے حوالے سے ہمارے دلوں میں بستے ہیں۔ زمانے کی تیز ہواؤں نے ان چراغوں کو بجھادیا مگر ان کی چھوڑی ہوئی روشنی آج بھی ان دیاروں کو تابندہ رکھے ہوئے ہے۔ ان شہروں سے منسوب اکا دکا شخصیتیں نظر آتی ہیں تو اس مٹی کی سوئی ہوئی خوشبو جاگ اٹھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ سب لوگ زندہ ہو کر کلام کرنے لگتے ہیں جن کی قبروں کے نشان بھی مٹ چکے ہیں۔

بیسویں صدی کے پہلے دہے میں جب جونپور کی قدیم تہذیبی اور علمی روایت نئے سانچوں میں ڈھل رہی تھی اور ہندوستان کا پرانا ریاستی نظام آخری سانسیں لے رہا تھا۔ تو پانچ صدی پیشتر ہمایوں بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آنے والے میر درویش علی مرحوم کی ساتویں پشت میں مولوی سید شبیر حسن ایسے صاحب علم شاعر اور روضہ خواں جونپور کی نئی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ مولوی شبیر حسن پیدا تو الہ آباد میں ہوئے مگر

جونپور کی مٹی انہیں اپنی جانب کھینچ لائی۔ یہیں ان کی شادی ہوئی اور ان کے علم و دانش اور فہم و بصیرت سے براہ راست فیض پانے والے سید محبوب الحسن نے ان کی آنگن میں خوشبوئیں بکھیر دیں۔ سید محبوب الحسن اور سید وحید الحسن ہاشمی اپنے اپنے رنگ میں خوب جچے۔ شعر و ادب میں ایک منفرد پہچان کے حوالے سے یہ دو نام بیسویں صدی کی ادبی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

سید محبوب الحسن نے تحصیل علم کا آغاز ہی ایک عربی اسکول سے کیا۔ جہاں عربی زبان و ادب، فقہ، منطق اور حدیث کے علوم سے بہرہ ور ہوئے۔ علم کا ایسا چسکا پڑا کہ جونپور سے نکل کر لکھنؤ جا پہنچے۔ جہاں علوم شرقیہ کی تمام اسناد حاصل کیں۔ یہ وہ دور تھا جب لکھنؤ میں صفی لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا اور ملک کے گوشے گوشے سے تبدیلی اور انقلاب کی ہوا چل رہی تھی۔ آرزو لکھنوی، اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، بے خود موہانی، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی جیسے شعراء داد سخن لے رہے تھے اور شاعری میں اصلاح پسندی کا رجحان غالب تھا۔ حبیب جونپوری کو نہ صرف اس دور کے مشاعروں میں شریک ہو کر ان شعراء کو سننے کا موقع ملا بلکہ انہیں ان نابغۂ روزگار شخصیتوں سے ملاقات کے مواقع بھی میسر آئے۔ شاعری انہیں ورثے میں ملی تھی۔ ان شعراء کے اثر نے ان کے طبعی رجحان کو صیقل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں انہوں نے آرزو لکھنوی سے اصلاح لینا شروع کی۔ آرزو لکھنوی کا شمار اساتذہ لکھنؤ میں ہوتا تھا۔ ان کے ادبی و شعری کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے نہ صرف زبان کو وسعت دی۔ بلکہ شاعری میں فکر کے نئے در وا کئے۔ ان کے صالح موضوعات فکر اور دلکش رنگ تغزل نے انہیں ایسی انفرادیت بخشی تھی کہ وہ اردو شاعری میں تنہا ایک اسکول تھے حبیب جونپوری آرزو لکھنوی کی شاگردی میں اردو شاعری کے ایک نئے آہنگ سے آشنا ہوئے۔ ۱۹۴۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ملازمت کے سلسلے میں انہیں بجنور، کلکتہ، الہ آباد اور کئی دوسرے مقامات پر جانا پڑا۔ جس کی وجہ سے شاعری میں وہ یکسوئی حاصل نہ

ہوسکی جو بڑے شاعروں کی صحبت میں رہ کر میسر آتی ہے۔ تاہم اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ مختلف شہروں کی فضا اور ماحول میں رہ کر انہیں بعض ایسے تجربات حاصل ہوئے جو ان کی شعری بوطیقا کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ عربی استاد، لیبر انسپکٹر اور فوج کی ملازمت نے بھی تجربات کے حوالے سے ان کی شعری آفاق کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اپنے اہل خانہ کو کراچی روانہ کردیا اور خود ۱۹۵۳ء میں پاکستان آئے تو لاہور میں عربی فارسی استاد کی حیثیت سے آرائے بازار ہائی اسکول میں پڑھانے لگے۔ یہاں ان کی شاعری کے جوہر خوب چمکے اور شاگردوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ بن گیا۔ لاہور میں عابد علی عابد کا اپنا ایک شعری حلقہ تھا۔ چنانچہ دونوں حلقوں میں ٹھن گئی اور یک عرصے تک شاعرانہ مجادلے ہوتے رہے۔ لیکن حبیب جونپوری نے اپنی روایتی شرافت اور وضعداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انہوں نے ہمیشہ عابد علی عابد کا دل سے احترام کیا اور دیگر ادبی محفلوں میں انہیں عزت کا مقام دیا یہاں تک کہ ان کی وفات پر ایک قطعہ بھی کہا۔

درد کی ٹیسوں نے دل کو کرلیا آماجگاہ
دل تو ٹوٹا تھا مرا پہلے ہی والد کے بغیر
حسرت نظارگی کچھ مضمحل سی ہوگئی
اٹھ گیا لطف سخن گوئی بھی عابد کے بغیر

لاہور میں تقریباً بائیس برس گزارنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں وہ کراچی چلے گئے۔ کراچی میں انہوں نے جتنا عرصہ بھی گزارا۔ اس میں شعر و شاعری کا سلسلہ موقوف نظر آتا ہے اور وہ مذہب کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ امام بارگاہ و مسجد حسینیہ سجاد کی خطابت، مجالس خوانی اور قصیدہ خوانی نے ان کی شخصیت کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ اور انہوں نے شاعری سے مکمل طور پر ہاتھ اٹھالیا۔ ۱۹۸۷ میں انہتر برس کی عمر میں انتقال کیا اور

کراچی ہی میں مدفون ہوئے۔

حبیب جونپوری کی شاعری

بیسویں صدی کا شعری منظر نامہ، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالت کے تناظر میں نئے نئے رجحانات اور امکانات سے ترتیب پاتا ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات نے روایتی شاعری کی بساط لپیٹ کر زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ غزل سمیت تقریباً ہر صنف سخن نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق نئے موضوعات کو قبول کیا اور اصلیت و واقعیت کی بنیاد پر حسن و عشق کے فرسودہ مضامین کے بجائے مسائل حیات اور تلخی ایام کو جگہ دی۔ حبیب جونپوری کا عہد شاعر میں موضوعی اعتبار سے نئے تجربوں کا عہد تھا اس دور میں نئے سرے سے شاعری کا مفہوم متعین ہوا اور اسے محض دل بہلانے کی شے سمجھنے کے بجائے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے ایک مفید ذریعہ تسلیم کیا گیا۔ ''اعلیٰ مقاصد سے مراد یقیناً وہ خواب تھے جو سماج کو بدلنے کی زبردست خواہش کی صورت میں اس دور کے شعراء دیکھ رہے تھے۔ قوم کی سماجی اور معاشی زبوں حالی کو ختم کرنے، رہن سہن کے انداز بدلنے، معاشرت کے طور طریقوں کی درستی اور خوب سے خوب تر کی جستجو نے شاعری کے پرانے معیارات کو بدل کے رکھ دیا۔ اور شعراء نے فنی اور سماجی شعور سے بہرہ ور ہو کر اردو شاعری کو نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔ یہ نئے رجحانات سماجی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر ان خارجی عوامل سے ترتیب پاتے ہیں جنہوں نے تخلیق کار کے دو دن میں جذبے اور احساس کی ایک نئی دنیا تشکیل دی۔ ماحول کی آویزش اور زمانے کی تلخیوں نے اپنے اظہار کے لئے ایک ایسا پیرایہ اختیار کیا جو روایت سے اکتساب کر کے جدید فکر و عمل کے رنگ میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ حبیب جونپوری اس پورے منظر نامے میں ایک، نئے اور منفرد طرز احساس کو ساتھ لے کر

چلتے ہیں۔ یوں تو یہ نیا طرز احساس ہمیں اجتماعی سطح پر بھی ملتا ہے لیکن حبیب جونپوری کی شاعری کی مذہبی اوراخلاقی فضا ان کے بطن میں نمو پانے والی روحانیت اور مذہبیت سے اثر پذیر ہو کر اپنا الگ رنگ جماتی ہے۔ انہوں نے قطعہ، غزل، نظم اور قصیدہ سمیت اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان تمام اصناف میں ان کی طبیت کا رنگ معمولی بیش وکم سے تقریباً ایک سا نظر آتا ہے۔ غزلیں انہوں نے کم کہی ہیں لیکن جتنی بھی کہی ہیں ان میں ان کا اپنا ایک خاص انداز اور روایت کی پاسداری مل جل کر نئے لہجے کی خبر دیتے ہیں۔

خود بڑھے تھے وہ ہماری سمت پیا نہ بکف
دیکھئے ان کا کرم یا روئے توبہ دیکھئے
چار دن میں اپنی صورت ہی نہ پہچانی گئی
ہم کہاں سے زندگی لاتے کہ دنیا دیکھئے

ان کو ہے چمن سے کیا مطلب یا پھول کھلیں یا آگ لگے
جن تنکوں نے رشتہ جوڑا تھا چن چن کے جلائے جاتے ہیں
بتلائیں حبیب زار تمہیں کیا شام فراق میں ہائے چراغ
کس طرح جلائے جاتے ہیں کس طرح بجھائے جاتے ہیں

درج ذیل اشعار میں لہجے کا بانکپن اور انفرادیت صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

دیکھ کر مجھ کو وہ گھبرایا بہت
ایک آنسو میرے کام آیا بہت
قلب کا آئینہ ٹوٹا تو مگر
غم کے ہر پتھر سے ٹکرایا بہت

وہ تو میرے دل کے اندر تھا کہیں
طور پر میں جا کے پچھتایا بہت

یہ کیا والیٔ شہر نے فیصلہ
جو جھکا تھا نہیں سر تو سر کاٹ دو

دیکھنے دو نہ ایوان ہائے بلند
آنکھ والوں کا تارِ نظر کاٹ دو

فیض پائے نہ طاقت سے ناطاقتی
رشتۂ آفتاب و قمر کاٹ دو

مشکلیں آتی ہی رہتی ہیں محبت میں حبیبؔ!
کیا ضروری ہے کہ ہر راستہ ہموار چلے

ممکن ہے دل کے جلنے سے روشن ہو شہرِ غم
پی لو نظر جو آئے کہیں دوستی کی آگ

بحرِ ہستی سے تباہی کی شکایت ہے عبث
نقش بہتے ہوئے پانی پہ بناتے کیوں ہو

درد کی لے کا نہیں لحنِ سکوں سے کوئی ربط
میری آواز سے آواز ملاتے کیوں ہو

اک حشر ہے اس کا کسی کوچے سے گزرنا
رفتار کی حد حد قیامت سے ملی ہے

مشکل کی ہر اک شکل پہ میرا ہے تصرف
مجھ کو یہ سند شاہ ولایت سے ملی ہے
جو سطح آب پہ ابھر ابھر کے ٹوٹ گیا
وہ میری عمر کا آئینہ تھا حباب نہ تھا
کلیم طور کی حالت بدل گئی جس سے
وہ اک نظر کی کرامت تھی انقلاب نہ تھا

درج بالا اشعار کے انتخاب میں کسی خاص ترتیب کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ تاہم اس جستہ جستہ انتخاب سے بھی یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ بیسویں صدی کی غزل جس ڈھب پر اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس میں حبیب جونپوری کا زیادہ نہ سہی لیکن ایک قابل اعتبار حصہ ضرور بنتا ہے۔ انہوں نے حالی اور ان کے معاصر لکھنوی شعراء کے زیر اثر اصلاح غزل کے کام کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ ایک ایسے انداز میں غزل کی صورت گری کی وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں زندگی کے ناپائیدار اور فانی ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اسے بسر کرنے اور برتنے کا سلیقہ بھی موجود ہے۔ بے عملی اور زندگی سے فراریت کا رجحان جو اس دور کے اکثر شعراء کے ہاں نظر آتا ہے حبیب جونپوری کی غزل میں ایک حقیقت پسندانہ انداز میں مشکلوں اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صورت میں ملتا ہے۔

مشکلیں آتی رہتی ہیں محبت میں حبیب
کیا ضروری ہے کہ ہر راستہ ہموار ملے
مشکل کی ہر اک شکل پہ میرا ہے تصرف
مجھ کو یہ سند شاہ ولایت سے ملی ہے

بیسوی صدی کی صنعتی زندگی نے جہاں انسان کو سیاسی انتشار اور معاشی بدحالی سے دو چار کیا وہاں ہر شے کو مادیت کے پیمانوں میں رکھ کر ذہنی اور جذباتی خلفشار کو بھی ہوا دی۔ اس صورت حال میں غیر فطری جذباتیت کا پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ لیکن حبیب جونپوری اس صورت حال سے صاف بچ نکلتے ہیں اور اپنی داخلی روحانیت سے توانائی حاصل کر کے زندگی کی تلخیوں، پیچیدگیوں اور الجھنوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف زندگی کا گہرا شعور رکھتے ہیں بلکہ اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے وسیع سماج کی تبدیلیوں سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔ انھیں غالب کی طرح غزل کی تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے اور اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعت درکار ہوتی ہے۔ تو وہ نظم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غزل کو ازکار رفتہ صنف سخن جان کر اس سے دست کش ہو جاتے ہیں بلکہ غزل میں موضوعات کے نئے تجربات کے ساتھ ساتھ وہ نظم میں ذرا کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی پابند نظمیں اپنے عہد کے آشوب اور تغیر پذیر صورت حال کی آئینہ دار ہیں۔ حبیب جونپوری کا دور نظم نگاری کے لئے بہت سازگار تھا۔ یہ پورا عہد بنیادی طور پر موضوعاتی شاعری کا تھا۔ سیاسی، اخلاقی، مذہبی، اصلاحی اور فطرت کے موضوعات پر لکھی گئی نظموں کا ایک وافر ذخیرہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شاعر اپنے بند خول سے نکل کر خارجی مشاہدات کے ذریعے کائنات کے وسیع آفاق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے۔ یہ تلاش اس جدوجہد کے ہمرکاب چلتی ہے جو اپنے دامن میں شدید بے چینی اضطراب اور عدم اطمینانی کو لئے ہوئے ہے۔ حبیب جونپوری بھی شاعروں کے اس کارواں میں نمایاں نظر آتے ہیں جو اپنے حال سے ناآسودہ ہیں اور اپنے گرد و پیش میں بکھرے ہوئے دکھوں اور غموں کی داستان کو کرب انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں "بیوہ کی خودکشی" "نوجوان ساتھی کی موت" لاشیں، فرنگی، شاعر، نامعلوم حسرت، مفلس طالب علم، حسرت دیدار، اور "کشمکش" سماجی اور تہذیبی

شعور کی آئینہ دار ہیں جو شاعر کے قلب و روح میں رچا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم، ''مفلس طالب علم'' صرف ایک طالب علم کی مفلسی اور غربت کا نقشہ ہی پیش نہیں کرتی بلکہ اس نظم میں ایک پورے عہد کا درد اور کرب سمٹ آیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

مفلسی نے اس طرح کردی ہے کچھ مٹی خراب
غیر تو کیا اپنے سائے سے بھی آتا ہے حجاب

یاس میں استاد کی بھی بدلی نظریں بھانپ کر
تلملا اٹھتا ہے رہ جاتی ہے ہمت کانپ کر

حوصلے کیا چھوڑے تن میں جان بھی رکھتی نہیں
مفلسی انسان کو انسان بھی رکھتی نہیں

اے حبیب اندھی ہوا میں شمع جل سکتی نہیں
یہ زمین ہند ہے کہ کروٹ بدل سکتی نہیں

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ نظم فکری اور فنی اعتبار سے چالیس کے دہے میں لکھی جانے والی اعلیٰ ترین نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ شدت تاثر اور موضوع کے حوالے سے یہ نظم نہ صرف ہندوستان کی اقتصادی صورت حال کو سامنے لاتی ہے بلکہ جبر اور استحصال کے شکنجے میں جکڑے ہوئے انسانوں کا نوحہ بھی ہے۔ نظم ''بیوہ کی خودکشی'' عورت پر ہونے والے ظلم وستم اور ان معاشرتی رسم و رواج کا پتہ دیتی ہے جنھوں نے حالی کو ''چپ کی داد'' لکھنے پر مجبور کیا۔ پچاس اشعار پر مشتمل یہ نظم ایک بیوہ عورت کے شکستہ جذبات اور معاشرے کی ستم ظریفیوں کی روداد اس انداز میں پیش کرتی ہے کہ پڑھتے ہوئے دل دہل جاتا ہے۔ حبیب جونپوری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک مظلوم عورت کے جذبات کی عکاسی اس خوبصورتی سے کی ہے کہ اس ہنر مندی پر انہیں بے

اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

حبیب جونپوری کی دیگر نظموں میں "حسرت دیدار، شکست حسن، عہد ماضی، اور جدائی" اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک مختلف صورت حال کا پتہ دیتی ہیں۔ ان نظموں میں شاعری کا انفرادی احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ حبیب کے ذاتی تجربات اور واردات و کیفیات ان نظموں کی اساس ہیں۔ فنی اور معنوی حوالے سے ان نظموں کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ تاہم حبیب جونپوری کی وہ نظمیں جو اپنے دامن میں اجتماعی طرز احساس لئے ہوئے ہیں زیادہ اثر انگیز ہیں کہ ان کے مشاہدے کی وسیع کائنات ان نظموں میں سمٹ آئی ہے۔

حبیب جونپوری نے قطعات اور قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ان اصناف میں بھی ان کی شاعرانہ مہارت اور فنی پختگی پورے طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ قطعات زیادہ تر اخلاقی نوعیت کے ہیں جبکہ قصائد مذہبی معتقدات کو نمایاں کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اور حضرت امام زمانہؑ کی مدح میں لکھے گئے قصائد جوش محبت اور عقیدت سے پر ہیں اور ان عظیم ہستیوں سے شاعر کی والہانہ وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

حبیب جونپوری کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ انہوں نے متنوع اصناف سخن خصوصاً نظم اور غزل میں ایک ایسے پیرایہ شاعری کو متعارف کرایا ہے جو ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہی نہیں بلکہ ان کی پہچان کا ذریعہ بھی ہے۔

حبیب جونپوری کا کلام کتاب کی صورت میں پہلی بار منظر عام پر آرہا ہے۔ اہل دانش اور ادب فہم اس پر کیا رائے دیتے ہیں۔ یہ الگ معاملہ ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک بھولا ہوا شاعر پھر سے زندہ ہورہا ہے۔

☆☆☆☆☆

حبیب جونپوری

حسین اعظمی

یہ بات اکثر مشاہدے میں آئی ہے کہ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں قدرت متعدد غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازتی ہے۔ ان کی ان صلاحیتوں کا مناسب وقت پر اظہار ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی بعض خوبیاں اور صلاحیتیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں یا بالعموم عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ حبیب جونپوری بھی انہی شخصیتوں میں سے ایک تھے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ انہیں قدرت نے مختلف صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا جن کا اظہار وقتاً فوقتاً مناسب اوقات میں ہوتا بھی رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی اہم خوبیاں اور صلاحیتیں پس منظر میں چلی گئیں یا انہوں نے از خود انہیں نظر انداز کردیا۔ آخری عمر میں وہ ایک عالم باعمل اور عامل باعلم کی حیثیت سے جانے پہچانے گئے کراچی اور سندھ میں ان کے بیشتر حلقہ بگوش انہیں اسی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے۔

جب بھی کسی محفل میں ان کا ذکر چھڑتا ہے تو لوگ اب انہیں ایک بے لوث نیک طینت اور پریشان لوگوں کے مخلص اور ہمدرد کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح لاہور اور پنجاب میں ان کے بیشتر جاننے والے انہیں ایک ذی علم، طلبا کا ہمدرد اور فروغ تعلیم کا حامی ماہر درسیاب کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

ان کی زندگی اور شخصیت کے بیشتر دل آویز اور پرکشش پہلو عام لوگوں کی

نظروں سے اوجھل رہے حالانکہ وہ ایک بہت اچھے شاعر مقرر دینی اور مذہبی تعلیم میں انقلابی اصلاحات کے حامی بلکہ رہنما تھے کسی نیک کام کے لئے لوگوں کو منظم کرنے اور اپنا ہمنوا بنانے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے تحریک چلانے کی غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ اگر وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے تو ان کا شمار بھی ملک کے معروف اور مشہور شعرا میں ہوتا یا اگر وہ ملک کی کسی سیاسی سماجی یا مذہبی تحریک میں حصہ لیتے تو ان کا شمار صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا۔

آیئے سب سے پہلے ان کے ماضی کے واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالیں جن سے بخوبی اندازہ ہوسکے گا کہ قدرت نے انہیں کتنا بیدار دل دماغ اور کتنا بلند حوصلہ دیا تھا اور اس سلسلے میں انہیں کتنی زہرہ گداز مشکلوں سے دو چار ہونا اور صلاح و ترقی دشمن پہاڑوں سے ٹکرانا پڑا، اس کا اندازہ آج کے حالات میں لگانا مشکل ہے۔ بہر حال انہی کا دل گردہ تھا کہ بقول میر

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

مولانا محبوب الحسن ہاشمی جونپور کے ایک چھوٹے زمیندار گھرانے کے چشم وچراغ تھے ان کے خاندان میں دینی تعلیم کا بڑا چرچا تھا ان کے والد اس پوزیشن میں تھے کہ ہاشمی صاحب کو انگریزی تعلیم دلاتے لیکن ۱۹۲۶ء میں جب وہ سفر عراق کے لئے روانہ ہوئے تو اپنے ساتھ مولانا محبوب الحسن کو بھی لکھنؤ لیتے گئے انہوں نے یہاں اپنے ماموں سید کاظم حسین ایڈووکیٹ کے گھر میں قیام کیا۔ عربی فارسی اور اردو کے امتحانات پاس کئے اور آرزو مرحوم کے شاگرد ہوگئے۔ فقط شاگرد ہونا کوئی اہم بات نہیں، اہمیت کے قابل یہ بات ہے کہ انہوں نے نہ جانے کتنے غیر اہم شاعروں کو اپنے استاد کا شاگرد

: کر اہم شاعر بنادیا۔ میں نے اکثر انہیں صفی مرحوم کی بیٹھک میں شعری مسائل پر گفتگو کرتے پایا کبھی کبھار ثاقب مرحوم اور یاس چنگیزی کے یہاں بھی ملاقات ہوجاتی تھی۔

مولانا ہاشمی شعرو شاعری کے دلدادہ تھے۔ عربی فارسی کی استعداد وافر ہونے کی وجہ سے ان کے کلام میں علوم و متداولہ کی گہری معنویت پیدا ہوگئی اور ہر محفل اور ہر مشاعرے میں وہ اس لئے بھی چھا جاتے تھے کہ خوش گلو تھے اس کے علاوہ کیفی اعظمی اور سردار جعفری کی دوستی سے ان کے رنگ سخن میں انقلاب خیز فضا پیدا ہوگئی۔ ان کی خوش فکری اور زود گوئی کا یہ عالم ہوگیا کہ وہ غزلیں اور قصیدے کہہ کر نوجوان شعراء کو دیتے تھے۔ میں نے اکثر ان کے پاس نوجوانوں کا جمگھٹا دیکھا۔ انہیں میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی صاحب کتاب "حیاتِ دبیر" بھی تھے۔ مولانا ہاشمی لکھنؤ سے الہ آباد چلے گئے اور مختلف مدرسوں میں عربی اور فارسی استاد کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگے۔

جب میں ۱۹۴۷ء میں لکھنو سے بی اے کرنے کے بعد لاہور ہوتا ہوا کراچی ے روزنامہ امروز میں چراغ حسن حسرت اور ایوب کرمانی کے ساتھ کام کرنے لگا تو معلوم ہوا کہ مولانا ہاشمی بھی لاہور میں چند سال قیام کرنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں کراچی آگئے ہیں۔ کراچی میں انہوں نے درس و تدریس کو خیر باد کہہ کر پریشاں حال لوگوں کی دنیوی، ذہنی اور روحانی پریشانیوں اور مشکلوں کو قرآنی عملیات اور آئمہ معصومین علیہ السلام کی ادعیہ و وظائف کے ذریعے ازالے کا سلسلہ شروع کیا۔ جس میں انہیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

کراچی میں میری ان سے سجادیہ امام بارگاہ میں دو مرتبہ ملاقات ہوئی ایک مرتبہ سخن فتح پوری کے ہمراہ دوسری مرتبہ ان سے تنہا ملا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے درس و تدریس اور شاعری کا سلسلہ ترک کرکے عملیات کی راہ کیوں اختیار کی تو انہوں نے بڑے افسردہ لہجے میں فرمایا۔ بھائی اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اب نہ مجھ

میں حوصلہ ہے نہ توانائی نہ وسائل ہیں جن کی مدد سے میں کوئی اصلاحی تحریک چلا سکوں۔ عمر کی آخری منزل میں ہوں اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ پریشان حال اور مصیبت زدہ لوگوں کی پریشانیوں کا قرآنی عملیات اور آئمہ معصومین کے وظائف و اوراد کے ذریعے ازالہ کرنے کی کوشش کروں مجھے خوشی ہے کہ میری یہ کوشش کامیاب رہی جس کا اندازہ آپ یہاں آنے والے لوگوں کی روز افزوں تعداد سے لگا سکتے ہیں۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی اس میں شبہ نہیں کہ مولانا محبوب الحسن ہاشمی ایک ہمہ صفت موصوف انسان تھے۔ فارسی، عربی، اردو اور دینی علوم کے ماہر اور عالم ہونے کے علاوہ ایک شعلہ نوا مقرر اعلیٰ درجے کے شاعر نہایت خوش خلق اور ملنسار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا یہ اور بات ہے کہ قوم نے ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ملتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

☆☆☆☆☆

میرا بھائی محبوب الحسن

پروفیسر اقبال حسین

بھائی محبوب الحسن میرے عزیز دوست، ہمدم اور ہمجولی تھے وہ میرے برادر بزرگ مولوی ابو محمد کے ہمسن اور مجھ سے عمر میں تین سال بڑے تھے لیکن اپنے قد اور کاٹھ کے لحاظ سے بہت بڑے معلوم ہوتے تھے۔ ہم دس بارہ دوستوں کی کمانڈ انہی کے ہاتھ میں تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ہم تمام نوعمر ساتھی ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے خوفزدہ رہتے تھے۔ سید محمد حسن مرحوم ہمارے عزیزوں میں تھے اور محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ انہیں قوم کی تعلیم کا بے حد خیال رہتا تھا۔ اسی خیال کے تحت انہوں نے دس بچوں پر مشتمل اپنے گھر محلہ سپارہ جونپور میں ایک مکتب خانہ کھولا اور بیگم گنج کی امام بارگاہ کے مولوی ہادی حسین کو دس پندرہ روپے ماہوار پر استاد مقرر کیا۔ مولوی صاحب بڑے سخت گیر تھے اور ذرا ذرا سی کوتاہی پر طلبا کو سخت سزائیں دیتے تھے چونکہ شرارت میں بھائی محبوب الحسن اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اس لئے دوبار انہیں بھی سزا ملی۔ ادھر مولوی صاحب اپنی سخت گیر پالیسی پر گامزن تھے ادھر طلبا نے بے سوچے سمجھے مدرسے سے غائب ہونا شروع کردیا۔ بھائی محبوب الحسن نے ایک دن موقع پاکر چپکے سے وہ بید غائب کردی جس سے مولوی صاحب اپنی سزا کا ہنر دکھاتے تھے۔ مولوی صاحب تاڑ گئے کہ یہ کام محبوب الحسن کا ہے۔ جب ان کے والد مولوی شبیر حسن سے شکایت کی گئی تو موصوف نے بڑی صفائی سے یہ کہہ کر اقرار کرلیا کہ مولوی صاحب کی مار سے طلبہ پڑھائی سے بددل ہو کر مکتب

سے غیر حاضر ہوجاتے ہیں اس دن سے مولوی صاحب نے سزا دینا بند کردی۔ دو تین سال کے عرصے میں مولوی صاحب نے بیس تک کا پہاڑہ اردو کی دوسری تیسری کتاب، نماز اور اس کے مسائل جوڑ باقی ضرب تقسیم اور اعشاریہ کی مشقتیں ختم کرادیں۔ تمام طلبا نے اسی عرصے میں ناظرہ قرآن پڑھ لیا اور بعض طلبا کو جن میں بھائی محبوب بھی شامل تھے۔ چدرہ مختصر سورتیں زبانی یاد ہوگئیں۔

جب سید محمد محسن نے شیعہ اسکول کی بنیاد رکھی تو مکتب خانے کے کچھ طلبا شیعہ اسکول میں انگریزی پڑھنے چلے گئے لیکن میرے بھائی ابو محمد، محبوب الحسن اور قربان علی ناصریہ اسکول جونپور میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہوگئے۔ اس مدرسے میں محبوب الحسن کے داخلے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جناب اعلم العلما مولانا سبط حسین مرحوم ومغفور نے مولوی شبیر حسین کو رائے دی تھی کہ اس بچے کو عربی کی تعلیم دلائیں۔ بڑا ہوکر ایک اچھا اور ہونہار مقرر بنے گا۔ مولوی شبیر حسن مولانا مرحوم کے فن شعر میں شاگرد تھے اس لئے وہ اپنے استاد محترم کا کہا ٹال نہیں سکتے تھے۔

اس وقت ناصریہ مدرسے میں بڑے پائے کے عالم تھے جنہوں نے پوری محنت اور جانفشانی سے ان طلبہ کو فقہ، حدیث اور علم کلام کی تعلیم دی۔ مولانا شبر صاحب مرحوم فیض آبادی بڑے پائے کے عالم تھے علم فقہ میں ان کا جواب نہ تھا۔ مولوی شبیر حسن سے ان کے گہرے مراسم تھے اس لئے انہوں نے محبوب الحسن کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اس توجہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بھائی محبوب الحسن بڑے خوش الحان تھے انہیں اساتذہ کے قصائد سلام اور نوحے ازبر تھے وہ محلے کی انجمن کے صاحب بیاض بھی تھے اور نئی نئی دھنوں سے نوحہ پڑھنے میں اس وقت ان کا کوئی جواب نہ تھا ناصریہ مدرسے میں دور دور سے شعراء آتے تھے یہ محفل ۹ بجے رات سے شروع ہوکر صبح چار بجے تک جاری رہتی تھی۔ اس محفل میں بھائی محبوب الحسن بھی اپنے والد سے دس بارہ اشعار لے کر

جب ترنم سے پڑھتے تھے تو محفل کے لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔ مدرسے کے اساتذہ اس لئے بھی بھائی محبوب الحسن سے خوش تھے اور ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ بہرحال ۱۹۳۶ء تک انہوں نے علوم کی کئی منزلیں طے کرلیں۔

ان کی تعلیم و تربیت میں ان کی نانی سیدہ بانو بی بی مرحومہ کا بھی بڑا ہاتھ تھا چونکہ یہ مرحومہ کے پہلے اور واحد نواسے تھے اس لئے ماں سے زیادہ انہیں اپنی نانی مرحومہ سے محبت و شفقت ملی۔ وہ پوتوں کے مقابلے میں نواسے کو زیادہ پیار کرتی تھیں۔ اور ان کے ناز اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھیں۔ وہ بھی انہیں کے پاس رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ صرف رات کے وقت اپنی والدہ کے پاس آجاتے تھے۔ مرحومہ خود عالمہ اور تہجد گزار تھیں اس لئے نواسے کو بھی عجیب عجیب ترغیبوں سے دینی مسائل سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔ بھائی محبوب کو جو زیادہ قرآنی سورتیں یاد ہوگئی تھیں وہ انہیں پاک نہاد مرحومہ کا فیض تھا۔ ایک بار وہ شدید بیمار ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ مرحومہ مسجدوں اور امام باڑوں میں جا کر جا کر دعائیں مانگتیں۔ جب نواسہ صحت یاب ہوا تو ڈھیروں منتیں بڑھائیں۔ اور ہم بچوں نے بار بار شیرینی کا لطف اٹھایا۔ چونکہ ان کے دادا دادی کا ان کی پیدائش سے قبل الہ آباد میں انتقال ہوچکا تھا۔ اس لئے ان کا رجحان ننھیال کی طرف ہونا فطری تھا۔ یہی سبب تھا کہ بڑے ہوکر انہوں نے اپنے تخلص کے ساتھ جونپوری کا لاحقہ استعمال کیا حالانکہ ان کے والد اپنے تخلص کے ساتھ الہ آبادی لکھتے تھے۔

بھائی محبوب الحسن کو بیت بازی کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے بچپن ہی سے اساتذہ کے مشہور اور نایاب اشعار یاد کرلئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ پہلا شعر انہوں نے کب کہا لیکن اتنا یاد ہے کہ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے خود غزل کہی اور پڑھی۔

میری پیدائش سے قبل مولوی شبیر حسن کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جو دو

سال زندہ رہ کر وفات پا گئی۔ مولوی صاحب نے دعا مانگی تھی کہ اگر لڑکا پیدا ہوگا تو اسے عالم دین بناؤں گا محبوب بھائی کے ناصریہ مدرسے میں داخلے کا یہ بھی ایک سبب تھا۔

جونپور کے مشہور شعراء شفیق جونپوری، وامق جونپوری، نامی جونپوری، کامل جونپوری، ظفر جونپوری سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ اور یہ تمام شعراء ان کے علم و فضل اور شعری صلاحیت کے قائل تھے میں نے ان کا کلام سنا ہے دیکھا نہیں۔ اس لئے کلام پر تبصرہ نہیں کرسکتا۔

مجھے اس بات کی حیرت ہے کہ ایک طرف وہ والی بال اور فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے دوسری طرف انہوں نے ۱۶ سال کے سن میں الہ آباد لکھنؤ اور آگرہ یونیورسٹیوں سے تمام علوم مشرقیہ کی ڈگریاں حاصل کرلیں۔ ایک طرف شعر و شاعری میں نامور شاعروں کی صف میں شامل تھے تو دوسری طرف فن تقریر میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ جب میں ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلے کے لئے پہنچا تو بھائی محبوب اپنے ماموں سید کاظم حسین ایڈووکیٹ کے گھر میں مقیم تھے۔ یہی کاظم حسین ایڈووکیٹ بعد میں شیعہ یتیم خانہ لکھنؤ کے جنرل سیکریٹری ہوئے۔

بھائی محبوب پر اس وقت شاعری سوار تھی۔ وہ آرزو لکھنوی کے شاگرد ہوچکے تھے اور دوسرے لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ بھی آرزو لکھنوی کی شاگردی اختیار کریں۔ میں نے انہیں ترنم سے غزلیں پڑھتے بھی سنا اور ان کی تقاریر کا جادو بھی دیکھا۔ کاش کہ وہ کسی ایک شعبے میں لگ لپٹ کر محنت کرتے۔ تو آج یا وہ عظیم شاعر ہوتے یا عظیم شعلہ بیان مقرر۔ شعری صلاحیت تو انہیں وراثت میں ملی تھی کیونکہ ان کے والد مولوی شبیر حسن صفا الہ آبادی جونپور کے نامی گرامی شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا سید سبط حسین مرحوم و مغفور سے اکتساب فن کی وجہ سے ان کی بڑی قدر تھی۔ صفا الہ آبادی فارسی اردو اور ہندی زبانوں میں بڑی روانی سے شعر کہتے تھے ان کا اثر آخر ان کی اولاد

میں آنا فطری تھا۔ تقریر کا فن انہیں کلب عباس ایڈووکیٹ اور کلب مصطفیٰ سے ملا تھا۔ میں نے اپنے احباب سے سنا کہ جہاں کلب عباس ایڈووکیٹ تقریر کرتے تھے بھائی محبوب الحسن کا وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ میں نے اکثر دیکھا کہ وہ نہ، البلاغہ، نہج الفصاحت، آب حیات، دربار اکبری اور عرفی قاآنی، حافظ اور سعدی شیرازی کے دیوانوں سے جملے اور اشعار زبانی یاد کررہے تھے مجھے بعد میں علم ہوا کہ وہ ان جملوں اور اشعار سے اپنی تقاریر میں زور اور برجستگی پیدا کرتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں ۱۶ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔ آج ان کے ماشاء اللہ چار بیٹے اور دو بیٹیاں بقید حیات ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا ڈاکٹر سید محمد باقر زیدی ہیں جو آج کل امام بارگاہ سجادیہ کراچی کے خطیب ہیں اور والد مرحوم کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی انتھک کوشش کررہے ہیں۔

اب میں خود بہتر سال کا ہوچکا ہوں جب مجھے ان کے بچپن اور جوانی کے ادوار یاد آتے ہیں تو سوائے آنسو بہانے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔

شاعر ہے تو دل کرلے نگینوں کی طرح
بازار وفا میں رہ تو ہیروں کی طرح
دل میں ہو اگر حب الٰہی کا جمال
اشعار نکلتے ہیں نگینوں کی طرح

حبیب جونپوری

☆☆☆☆☆

محبوب الحسن حبیب جونپوری کا

کلام

مفلس طالب علم

جستجوئے علم میں باندھے ہوئے کس کر کمر
آ رہا ہے درسگہ کی سمت مفلس کا پسر

کچھ اڑا سا رنگ رخ کا کچھ پریشاں سر کے بال
دل ہجوم غم میں ڈوبا منحنی غمگین چال

انتہائے یاس میں گردن کو نہوڑائے ہوئے
جوشش گریہ سے بوجھل ہونٹ تھرائے ہوئے

روز کے فاقوں نے یوں چوسا ہے رگ رگ کا لہو
اٹھ نہیں سکتا دل مردہ سے بار آرزو

تھرتھرتا ہے وفور ضعف سے جسم نزار
چھوٹی پڑتی ہیں کتابیں ہاتھ سے بے اختیار

گل سے چہرے پر غبار مفلسی چھایا ہوا
جسم مردہ ملگجے کپڑوں میں کفنایا ہوا

ٹوپی کچھ چکٹی ہوئی جوتی پھٹی کرتا پھٹا
کوٹ بھائی کا پرانا جس پہ دھبے جا بجا

کالر ادھڑا کہنی مسکی مونڈھے بھی مسکے ہوئے
آستیں ہاتھوں پر ڈھلکی ہے بٹن ٹوٹے ہوئے

جتنا ہوتا جا رہا ہے درسگہ سے متصل
پاؤں رکتے جا رہے ہیں بیٹھتا جاتا ہے دل

فیس باقی ہے تو ایسا چور بجھتے دل میں ہے
مٹتی جاتی ہے چمک وہ بھی جو مستقبل میں ہے

جبر یہ کچھ مسکراتا رنج و غم ٹالے ہوئے
سیدھا درجے میں چلا جاتا ہے سر ڈالے ہوئے

چہچہے کرتے ہیں جب اسکول کے سب گلعذار
دیکھ لیتا ہے کنکھیوں سے بکثرت بار بار

اقتضائے سن سے اٹھی بھی تبسم کی جو لہر
ہائے قسمت بن گئی ہونٹوں تک آتے آتے زہر

چھیڑتے ہیں ساتھ کے لڑکے جو غمگیں دیکھ کر
مسکرا دیتا ہے لیکن جھینپ جاتی ہے نظر

مفلسی نے اس طرح کردی ہے کچھ مٹی خراب
غیر تو کیا اپنے سائے سے بھی آتا ہے حجاب

یاس میں استاد کی بدلی نظریں بھانپ کر
تلملا اٹھتا ہے رہ جاتی ہے ہمت کانپ کر

حوصلے کیا چھوڑتے تن میں جان بھی رکھتی نہیں
مفلسی انسان کو انساں بھی رکھتی نہیں

بجھ گیا دل کھپ گئی جاں سعی زیبا کیا کرے
کوئی سمجھا دے مجھے پڑھ لکھ کے مردہ کیا کرے

اے حبیب اندھی ہوا میں شمع جل سکتی نہیں
یہ زمین ہند ہے کروٹ بدل سکتی نہیں

بیوہ کی خودکشی

یہ اندھیری رات یہ ساری فضا سوئی ہوئی
پتی پتی منظرِ خاموش میں کھوئی ہوئی

موجزن ہے بحرِ ظلمت تیرگی کا جوش ہے
شام ہی سے آج قندیلِ فلک خاموش ہے

چند تارے ہیں بھی تو بے نور پتھرائے ہوئے
جیسے باسی ہار میں ہوں پھول کمہلائے ہوئے

کھپ گیا ہے یوں گھٹا میں چاندنی کا صاف رنگ
جس طرح مایوسیوں میں دب کے رہ جائے امنگ

جب چمک اٹھتی ہیں بادل میں مچلتی بجلیاں
رات کے سینے سے اٹھنے لگتا ہے گھٹ کر دھواں

امڈی ہے کالی گھٹا دنیا ڈبونے کے لئے
یا چلی ہے بال کھولے رانڈ رونے کے لئے

چھا رہا ہے ایک سناٹا سا باغ دہر پر
آنکھ جھپکالی ہے نرگس نے اداسی دیکھ کر

بے خودی میں اک جہاں خاموش ہے سرشار ہے
گوش بلبل کو چٹخنا بھی کلی کا بار ہے

پھرتی ہے ٹھنڈی ہوا پتوں کو کھڑکاتی ہوئی
ننھی ننھی چھاتیاں غنچوں کو دھڑکاتی ہوئی

اونگھ کر سر رکھ دیئے ہیں خود گلوں نے خار پر
نیند سی منصور کو یا آگئی ہے دار پر

وہ بھیانک سی گھٹن اشجار پر چھاتی ہوئی
ہر لچکتی شاخ اک ناگن ہے لہراتی ہوئی

آگیا ہے سارا عالم خامشی کی لہر میں
سانس لینے کی صدا اٹھتی نہیں ہے شہر میں

جتنی ہے گنجان بستی اتنی ہی ویران ہے
ہر گلی خاموش ہے ہر راستہ سنسان ہے

تیرگی میں اونچے نیچے کل مکاں کھوئے ہوئے
ذرے ذرے مست ہیں سب بام و در سوئے ہوئے

لوٹ لی ہے رات نے سارے مکانوں کی بہار
چھپ گئے ہیں پردۂ ظلمت میں کل نقش و نگار

اک مکاں سے بھی مکیں کی کچھ خبر ملتی نہیں
چلمنیں اٹھتی نہیں زنجیر در ہلتی نہیں

گھر کی چل پھر بند ہے ہنگامہ دریا بند
کھڑکیاں دروازے سارے روزن دیوار بند

ہاتھ بھالے پر ہے بھالا دوش پر رکھے ہوئے
اونگھتا ہے پاسباں زانو پہ سر رکھے ہوئے

سو رہے ہیں مست و بیخود گھر کے کل پیر و جواں
ہوگئی ہیں بند حسن و عشق میں سرگوشیاں

ہاں مگر اک سمت اک گوشے میں کوئی نوحہ گر
لے رہی ہے کروٹیں پیہم کلیجہ تھام کر

آنکھ میں آنسو بھرے ہیں دل میں پنہاں درد ہے
لگ گئی ہے چپ سی اک چہرے کی رنگت زرد ہے

دل سنبھلتا ہی نہیں ہے سینہ صد چاک میں
پھول سا چہرہ اٹا ہے بیوگی کی خاک میں

اڑ چلی ہے رنگ رخ بن کر حیات مستوار
ہو رہا ہے قلب مردہ میں جوانی کا فشار

حسرتیں دم توڑتی ہیں یاس کی آغوش میں
سینکڑوں شکوے مچلتے ہیں لب خاموش میں

سوگ کے کپڑون میں نازک جسم کفنائے ہوئے
رو رہی ہے دل میں ارمانوں کو دفنائے ہوئے

عمر آمادہ نہیں مردہ پرستی کے لئے
بار ہے یہ زندہ میت دوشِ ہستی کے لئے

کھا رہا ہے سینۂ زخمی میں دل یوں پیچ و تاب
اور ابلا پڑ رہا ہے رخ سے طوفانِ شباب

روکتی ہے لاکھ قابو دل پہ پاتی ہی نہیں
ہائے رے ظالم جوانی بس میں آتی ہی نہیں

تھرتھرا کر کرتی ہے جب سونے بستر پر نظر
لے کے اک کروٹ ٹیک دیتی ہے وہ تکیہ پہ سر

دوپہر کی چھاؤں دور شادمانی ہوگیا
پیاس بھی بجھنے نہ پائی ختم پانی ہوگیا

لے رہی ہے کروٹوں پر کروٹیں با اضطرار
آگ پر پارہ ہے یا بستر پہ جسم بے قرار

سو رہی ہے اک آہ کرنے رو کے اٹھ بیٹھی کبھی
انگلیوں میں لے کے زلف خم بہ خم اینٹھی کبھی

آ کے ہونٹوں پر کبھی مایوس آہیں تھم گئیں
اور کبھی سونی کلائی پر نگاہیں جم گئیں

اتنی دنیا میں کہیں اپنی جگہ پاتی نہیں
پاس اس حد کی کہ شوہر کی بھی یاد آتی نہیں

جب کھنک اٹھتی ہیں سوتی لڑکیوں کی چوڑیاں
آہ بن کر اٹھنے لگتا ہے کلیجے سے دھواں

آ رہے ہیں یاد پیہم سانس نندوں کے سلوک
اٹھ رہی ہے ہوک پر بیتاب مضطر دل میں ہوک

ہوگئی بیوہ کی خاطر نیند بھی جیسے حرام
مختصر سا عہد رحلت دے گیا سوز دوام

اپنی ماں بہنوں کا بھی آنکھیں چرانا یاد ہے
ایسی دنیا میں کسی کا چھوڑ جانا ہے

باغباں تو قبر میں ہے کون اب دیکھے بہار
خود اسی کو تیر اس کے کرنے والے ہیں شکار

جب نظر آتا نہیں دیتا کوئی بیکس کا ساتھ
زہر کی شیشی کی جانب خود بخود بڑھتا ہے ہاتھ

دل تڑپ کر کہہ رہا ہے جلد اس دنیا کو چھوڑ
چوڑیاں توڑیں تو پھر زنجیر ہستی کو بھی توڑ

دم اگر نکلا تو کھوئی زندگی مل جائے گی
چاہے رونا چاہیے ہنسنا پھر نہ روکے گا کوئی

سوگ کھپ جائے گا تیرا موت کی آغوش میں
لب کشائی کا نہیں ڈر خلوت خاموش میں

واں سب اہل درد ہیں سب صاحبِ انصاف ہیں
رہبر آگے جا چکا راہیں بھی تیری صاف ہیں

دل انہیں باتوں میں الجھا تھا کہ دل گھبرا گیا
ہاتھ لے کر زہر کی شیشی لبوں تک آ گیا

تلملاتی، آنکھ جھپکاتی، جھجکتی، کانپتی
پی گئی کل زہر شیشی کا سسکتی کانپتی

موت نے جھٹکا دیا کل عضو ڈھیلے ہوئے
سانس اکھڑی نبض ڈوبی ہونٹ نیلے ہوگئے

اشک ٹپکا آنکھ جھپکی ہچکی آئی کھوگئی
موت کی آغوش میں اک آہ بھر کر سوگئی

اور کر اک آہ ٹوٹے ہند کی رسموں کا دام
اے جوانا مرگ بیوہ تجھ پہ ہو میرا سلام

(۱۹۳۹)

نامعلوم حسرت

میں ہوں کہ گھٹا جاتا ہوں دل ہے کہ حزیں ہے
مایوس فضائیں ہیں شب تار زمیں ہے

اس درد کا اس غم کا ٹھکانا بھی کہیں ہے
میں چاہتا ہوں کیا مجھے معلوم نہیں

منزل پہ پہنچ کر بھی ہوئیں ختم نہ راہیں
ہنستا ہوں تو ہونٹوں سے برس پڑتی ہیں آہیں

کیا جانے کیا ڈھونڈتی ہیں میری نگاہیں
ارمان بھی اپنا مجھے معلوم نہیں ہے

فرقت ہے کبھی وصل کبھی وصل ہے فرصت
ملنا بھی قیامت ہے نہ ملنا بھی قیامت

کیا جانے وہ قاتل ہے کہ قاتل ہے محبت
مقتول ہوں کس کا مجھے معلوم نہیں ہے

ہر لحظہ تفکر ہے ہر اک لمحہ تو ہم
موجود ابھی ہوں ابھی نظروں سے ہوں میں گم

آہوں میں ڈھلی جاتی ہیں امواج تبسم
ہنسنے کا طریقہ مجھے معلوم نہیں ہے

ہر سانس میں اک لے کی کمی دیکھ رہا ہوں
ہر جام میں کچھ مے کی کمی دیکھ رہا ہوں

ہر شے میں کسی شے کی کمی دیکھ رہا ہوں
میں ڈھونڈتا ہوں کیا مجھے معلوم نہیں ہے

یہ کشمکش غم یہ دھڑکتا ہوا سینہ
ساحل پہ ابھی ہے ابھی موجود میں سفینہ

آیا نہ ابھی تک مجھے جینے کا قرینہ
سچ یہ ہے کہ جینا مجھے معلوم نہیں ہے

آتا ہے نظر کبھی پیار سے بہتر
روتا ہوں کبھی ظلم کو بھی پیار سمجھ کر

آزردہ وہ بالیں سے چلے جاتے ہیں اکثر
افسوس منانا مجھے معلوم نہیں ہے

الفت کی شکایت ترا شکوہ نہیں پیارے
میں جانتا ہوں ظلم کسی کا نہیں پیارے

پوری ہو تمنا تو تمنا نہیں پیارے
بس اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہے

شکستِ حسن

کھوئے ہوئے ہیں سر کو جھکائے ہوئے ہیں آپ
جیسے کہ بارِ عشق اٹھائے ہوئے ہیں آپ

دل میں کسک نگہ میں جھجک تن میں ارتعاش
رنگینیوں میں آج نہائے ہوئے ہیں آپ

بوٹا سا قد وہ بھولی سی صورت بدن گداز
اف کتنی دلفریبی چھپائے ہوئے ہیں آپ

رنگینیٔ جہاں میں الجھتی نہیں نگاہ
اللہ کس کو اپنا بنائے ہوئے ہیں آپ

کس کو تلاش کرتی ہے بھٹکی ہوئی نگاہ
کس پر سکونِ قلب لٹائے ہوئے ہیں آپ

یہ کس کی یاد سینے میں لیتی ہے چٹکیاں
یہ کس کی دھن میں خود کو بھلائے ہوئے ہیں اپ

کس کے لئے یہ آنکھوں میں آنسو جگر میں درد
کس کا خیال دل سے لگائے ہوئے ہیں آپ

آنسو کے کانپتے ہوئے قطرے میں کون ہے
سہمی نظر میں کس کو چھپائے ہوئے ہیں اپ

کس کے بھرے ہیں رنگ یہ قوسِ حیات میں
کس کو نفس نفس میں چھپائے ہوئے ہیں آپ

کیا مل گئیں حبیب سے آنکھیں خطا معاف
جیسے شکست عشق سے کھائے ہوئے ہیں آپ

(۱۹۴۰)

فرنگی

تم تو خدمت کے جذبے سے سرشار تھے
تم تو نکبت مٹانے پہ تیار تھے

تم تو امن و اماں کے طرفدار تھے
تم تو کشور کشائی سے بیزار تھے

تم تو قوموں کے حق کے نگہدار تھے
تم تو مجبور و بیکس کے غمخوار تھے

تم تو آقا تھے مالک تھے سردار تھے
تم تو قوموں کی کشتی کے پتوار تھے

تم تو حسن تدبر کے شہکار تھے
تم تو ناچار بندوں پہ خونبار تھے

تم تو عظمت کے لشکر کے سالار تھے
تم تو گلہائے حکمت کی مہکار تھے

تم تو انسانیت کے پرستار تھے
اب تمہارے عمل سے یہ عقدہ کھلا

تم حقیقت میں شاطر تھے مکار تھے
تم منافق تھے فاسق تھے بدکار تھے

تم عداوت کے پتلے تھے خونخوار تھے
تم بڑے شعبدہ باز ہوشیار تھے

تم مسلماں کے خوں کے طلبگار تھے
تم شہیدوں کے دشمن تھے غدار تھے

تم ازل سے سیہ دل سیہ کار تھے
تم فدائے تماشائے اوباد تھے

تم مہذب فضا میں گنہگار تھے
تم اصالت میں رہزن تھے خرکار تھے

تم ہر اک مکر و فن میں گرفتار تھے
تم مثال فراعین خطا کار تھے

تم برہنہ بدن کے خریدار تھے
تم مثالی سزا کے سزا وار تھے

ہم بتاتے ہیں جو کچھ ذرا دیکھ لو
اپنے کردار کا آئینہ دیکھ لو

تم نے لوٹا ہے اسلام کا بانکپن
آرزؤں کے گل زندگی کا چمن

رونق نازنیناں گلوں کی پھبن
حسن پنجاب تہذیب گنگ و جمن

مقبروں کی ضیائیتوں کا کفن
سیدوں کا چشم عظمت برہمن

تم نے دفنادیا اہل مشرق کا فن
جوہر آدمی اعتزاز وطن

سطوت مرد سرمایۂ حسن زن
شہسواروں کے دل سورماؤں کے تن

قلب بے باک بازوئے شمشیر زن
ساری دنیا میں ممتاز رنگِ سخن

اپنی فتح دو روزہ پہ پھولے ہو کیوں
خبث باطن کا انجام بھولے ہو کیوں

(۱۹۴۲ء)

لاشیں

(نواکھلی میں مسلمانوں کی لاشیں دیکھ کر)

صبر کیوں ہو دیکھ کر لاشیں
جا بجا خون در بدر لاشیں

اپنی جنت الگ بسائیں گی
یہ مسلماں کی معتبر لاشیں

آسماں ان پہ خون روئے گا
یہ نہ سمجھو ہیں کم اثر لاشیں

دیکھ کر مہروش شہیدوں کی
کرنیں گزری ہیں چوم کر لاشیں

آرزوئے حصول مقصد میں
سو رہی ہیں زمین پر لاشیں

آج اہل نظر نے پھر دیکھا
عرش پر خون فرش پر لاشیں

یہ دکھائیں گی منزلوں کا نشاں
جن کو کہتے ہیں بے بصر لاشیں

دیکھتے آئے ہیں یونہی ہم لوگ
عمر بھر دھوپ عمر بھر لاشیں

(۱۹۴۶)

عہد ماضی

یاد ہے آغاز الفت کا زمانہ یاد ہے
ڈال کے بانہوں میں بانہیں مسکراتا یاد ہے

خم بہ خم زلفوں کا وہ چہرے پہ میرے لوٹنا
بھینی بھینی نکہتوں میں ڈوب جانا یاد ہے

سرخیوں سے وہ جھلک اٹھنا رخ ضوریز سے
لیتے لیتے نام میرا جھینپ جانا یاد ہے

آگے بڑھ بڑھ کر پلٹنا اور پھر رکنا میرا
اس طرح دل کا مچلنا تلملانا یاد ہے

وہ مری بیتابی دل سے تری بے تابیاں
وہ مرے شکووں پہ تیرا سر جھکانا یاد ہے

وہ مری پژمردنی سے تیراں ہوجانا اداس
وہ مجھے بھولی ہوئی اداؤں سے ہنسانا یاد ہے

گر کبھی خلوت میں چھیڑا قصہ شام فراق
مسکرانا مسکرا کر ٹال جانا یاد ہے

بے جھجک ملتے تھے مجھ سے پاس آتے تھے مرے
وہ گھڑی دو وقت وہ دلکش زمانہ یاد ہے

سوچ کر انجام الفت کچھ جھجکنا خود بخود
دم بہ دم گھبرا کے مجھ کو آزمانا یاد ہے

وہ مرا جذبات سے گھبرا کے تجھ سے روٹھنا
آبدیدہ ہو کے وہ تیرا منانا یاد ہے

یاد جس کی خون کے آنسو رلائے گی حبیب
وہ حکایت یاد ہے اور وہ فسانہ یاد ہے

کشمکش

نہ جانے اب ترا دل بے قرار ہے کہ نہیں
وہ جستجو وہ محبت وہ پیار ہے کہ نہیں

نظر جمی ہے اسی طرح پردۂ در پہ
اسی طرح سے مرا انتظار ہے کہ نہیں

بچھڑ کے بھی وہی باقی ہے زعم الفت کا
خزاں میں بھی وہی کیفِ بہار ہے کہ نہیں

نظر میں اب بھی قیمت دلِ شکستہ کی
غریب عشق کا اب بھی وقار ہے کہ نہیں

کھٹک نے جس کی تری خود نمائیاں لوٹیں
وہ تیر اب بھی کلیجے کے پار ہے کہ نہیں

بدل رہا ہے زمانہ بری طرح کروٹ
نہ جانے رشتہ دل استوار ہے کہ نہیں

تری امید پہ ٹھکرا رہا ہوں دنیا کو
تجھے بھی اپنے پہ یہ اعتبار ہے کہ نہیں

وہ مے جو پی تھی کبھی آستان فطرت پہ
کہو کچھ آج بھی اس کا خمار ہے کہ نہیں

بتا قسم ہے اس عہد دلنشیں کی تجھے
ترے بھی قلب میں اگلا سا پیار ہے کہ نہیں

توہمات سے پھر دور کر حبیب کو بھی
نظر ملا کے تشفی تو دے غریب کو بھی

حسرت دیدار

مرتا ہوں کاش پھر تجھے اک بار دیکھ لوں
پھر اپنے بخت خفتہ کو بیدار دیکھ لوں

پھر ذرے ذرے میں وہی جلوے ہوں ضو فگن
پھر گھر کو اپنے مطلع انوار دیکھ لوں

پھر پرفشاں ہوں حد نظر تک تجلیاں
پھر دونی رونقِ در و دیوار دیکھ لوں

پھر آئے مسکراتا ہوا تو. مرے قریب
پھر برق پاش آتشیں رخسار دیکھ لوں

پھر تیری چشم مست سے برسے شراب عشق
پھر خود کو مست و بے خود و سرشار دیکھ لوں

پھر شوخی و حجاب میں پیدا ہو کشمکش
پھر اک نہیں میں سینکڑوں اقرار دیکھ لوں

پھر حسن کو شکست ہو پھر عشق کو ظفر
کچھ کجلاہ قیصر خود دار دیکھ لوں

دل ٹکڑے ٹکڑے ہے خلش ناتمام سے
اس تیر نم کش کو کبھی پار دیکھ لوں

آ زندگی کے واسطے تجھ پر مروں گا میں
نقش قدم پہ آخری سجدہ کروں گا میں

آ اور حجاب ناز کے پردے اٹھا کے آ
دنیا کے انتظار کو رنگیں بنا کے آ

مایوس ہو کے ٹوٹنے کو ہے دل حبیب
کچھ اس دل حبیب ہی پہ رحم کھا کے آ

آؤ گیت گائیں

آؤ الفت کے گیت ہی گائیں
عام سر خوشی میں کھوجائیں

مسکراہٹ کے پھول بھول برسائیں
زندگی کو طرب میں نہلائیں

آؤ الفت کے گیت ہی گائیں
اتنا قلب وفا کو گرمائیں

خشک شاخوں سے گل نکل آئیں
اہل دنیا خبر نہ کچھ پائیں

ایسی رنگینیوں میں کھوجائیں
آؤ الفت کے گیت ہی گائیں

عشق فیضان لا مکانی ہے
غنچۂ باغِ شادمانی ہے

معنیٔ لفظ کامرانی ہے
عشق اگر ہے تو نوجوانی ہے

آؤ الفت کے گیت ہی گائیں
ہائے یہ چاند ہائے یہ تارے

یہ فضا مست نظارے
جیسے چھٹتے ہیں مے کے فوارے

وقت کا اعتبار کیا پیارے
آؤ الفت کے گیت ہی گائیں

(۱۹۳۵)

نوجوان ساتھی کی موت

ہو گیا ہے اشک افشاں آج کیوں یہ آسماں
مجھ کو بدلا سا نظر آتا ہے کیوں رنگِ جہاں

تمتماتی ہے فضا اور خوں بداماں ہے اماں
خاک اڑاتی ہے ہوا سر دھن رہی ہے آندھیاں

زندگی میں کیا کمی آئی کہ گھبراتا ہے دل
یا الٰہی یک بیک کیوں بیٹھتا جاتا ہے دل

نوجوانان چمن کے رخ سے ہے حسرت عیاں
قمریاں ماتم کناں ہیں بلبلیں گریہ کناں

سبزۂ خوابیدہ بھی لیتا نہیں انگڑائیاں
یا الٰہی کیا ہوا گریان ہے ہر پیر و جواں

کون چھوٹا کس کے غم میں گل گریباں چاک ہے
خاک ملتی کس کی خاطر نرگس بے باک ہے

میرے استعجاب و حسرت پر یہ کلیوں نے کہا
رنگ محفل مرنے والا ساتھ اپنے لے گیا

سونی محفل ہوگئی اور حسرتوں کا خوں ہوا
اس لئے ہے آہ وزاری نالہ و شیون بکا

صبر کا دامان نہ کیوں ہاتھ سے پھر چھٹنے لگے
دل کی دنیا سامنے آنکھوں کے جب لوٹنے لگے

(۱۹۳۹)

جدائی

تاکید ضبط غم کی نہ فرما کے جایئے
تڑپوں گا حشر تک مجھے تڑپا کے جایئے

کچھ انتظار آپ کے وعدوں کا کرسکوں
تدبیر اتنی زیست کی بتلا کے جایئے

آنکھوں ہی آنکھوں میں پیوں گا دم وداغ
ہاں ہاں شراب حسن کو چھلکا کے جایئے

اتنا کرم تو کیجئے ممکن نہیں جو کچھ
باتوں ہی باتوں میں مجھے بہلا کے جایئے

مچلے گا طفل دل تو مناؤں گا کس طرح
رستہ سکون و ضبط کا بتلا کے جایئے

آنسو رواں ہیں ٹوٹے ہیں قلب و جگر حبیب
غیروں کی طرح آپ نہ ٹھکرا کے جایئے

(۱۹۳۲)

اُردو

خطۂ ارض پہ کیا شان ہے تیری اردو
تو مری زیست کا ارمان ہے میری اردو

تجھ کو بخشا گیا دنیا میں معلّٰی کا خطاب
تو وہ جوہر ہے کہ تیرا نہیں دنیا میں جواب

گلشن دہر میں موجود ہے خوشبو کی طرح
تو ہے صحرائے خیالات میں آہو کی طرح

تیری عظمت کوئی اشرف کی زباں سے پوچھے
نفسِ مضمون ترا خسرو کے بیاں سے پوچھے

یوں تو کہنے کو وطن ہے ترا یہ برصغیر
مگر اے لیلیٰ جاں تیرا ہر اک دل ہے اسیر

تجھ پہ نازاں تھی قلی قطب کے جذبات کی رو
کبھی دلی تو کبھی لکھنؤ پہنچی تری ضو

تجھ کو اعزاز عجب شاہجہاں نے بخشا
لطف شائستگی سودا کی زباں نے بخشا

آ گیا دل میں ترے میر تقی میر کا سوز
دے گیا درد کی لذت تجھے دلگیر کا سوز

مومن و ذوق کے افکار تجھے راس آئے
ذہن غالب کے خیالات ترے پاس آئے

آ گیا تیرے کف دست میں عالم کا ضمیر
کر گئے تجھ کو سر افراز انیس اور دبیر

داغ نے تجھ کو دیئے عشق کے انداز نئے
فکر اقبال سے کیا کیا نہ ملے راز نئے

جوش کی شعلہ بیانی نے تجھے دی وسعت
آرزو کی ہمہ دانی نے تجھے دی وقعت

کر گیا تجھ کو بلند آل رضا کا اسلوب
دے گیا لہجہ تو فیض کا دھیما اسلوب

شادی و غم میں تجھے یاد کیا کرتے ہیں
تیری آواز میں فریاد کیا کرتے ہیں

شاعر

خاک کے ذروں کو تنویرِ نظر دیتا ہے وہ
پھول کی پتی کو لوہے کا جگر دیتا ہے وہ

جب اسے مہمیز کرتی ہے تخیل کی ادا
ظلمتِ شب کو تجلی سحر دیتا ہے وہ

سازشِ بربادئ عالم جہاں میں جب بھی ہوئی
ساری دنیا جاگ جاتی ہے خبر دیتا ہے وہ

جب رگِ جمہوریت کو کاٹنے بڑھتا ہے ظلم
بیگناہی صبر کرتی ہے اثر دیتا ہے وہ

اس قدر فطرت کے حسنِ دلربا پر ہے فدا
طالبِ سر ہو اگر فطرت تو سر دیتا ہے وہ

خود تہی دامن کی سہی لیکن زرِ اخلاص سے
دامنِ تہذیب انسانی کو بھر دیتا ہے وہ

عظمتِ آدم سے کر کے منضبط اپنا سخن
غم زدوں کو جرأتِ ذوقِ سفر دیتا ہے وہ

موت کو تسخیر کر کے قوتِ ادراک سے
مردنی چہروں کو جینے کا ہنر دیتا ہے وہ

قلبِ شاعر کو ملی ہیں عشق کی سب برکتیں
عشق ہی سے لبِ آہن موم کر دیتا ہے وہ

(۱۹۳۹)

میر انیس

عظمت اردو کا جس نے رکھ لیا وہ انیس
شاعری کو دے گیا جو رنگ کامل وہ انیس

عمر بھر وہ مرثیہ گوئی میں مستغرق رہا
جس کے دل پہ شعر خود ہوتا تھا نازل وہ انیس

شاعروں کو اک نیا رنگ ثنا خوانی دیا
کر دیا جس نے ہر اک اسلوب باطل وہ انیس

جو کیا اس نے طلب اس کے خدا نے دیدیا
جو ہوا دنیا میں دنیا کا نہ سائل وہ انیس

دے کے لفظوں کو ترنم حرف سادہ کو مزا
کردیئے جس نے عیوب شعر زائل وہ انیس

جو گزر گاہ اب وجد پر چلے وہ اور ہیں
جس نے اپنائے ہیں جدت کے فضائل وہ انیس

خانۂ دل میں بسا کر کربلا کی داستاں
جس نے طے کی درد کی ہر ایک منزلہ وہ انیس

علامہ اقبال

باتوں میں تھی دلیل حوالہ سخن میں تھا
تو تھا تو گفتگو کا مزا انجمن میں تھا

قرآن کی فضا میں پلا تھا ترا شعور
اسلام کا مزاج ترے بانکپن میں تھا

دلدادۂ علوم فرنگی تھا دل ترا
لیکن خیال خطہ ارض وطن میں تھا

جہل خزاں کا دور گلوں سے تھا دور دور
جب تک ترا وجود فضائے چمن میں تھا

لکھی وہ داستان غم دجلہ و فرات
چکھا وہ ذائقہ بھی جو گنگ و جمن میں تھا

سارا سمٹ کے آگیا تیرے کلام میں
جتنا بھی حسن لالہ و سرو سمن میں تھا

اس سے بڑھ کے بس میں ترے تھا بھی کچھ نہیں
ملت کو دیدیا وہ لہو جو بدن میں تھا

راہ عمل دکھاتا رہا قوم کو مگر
تو مطمئن تھا دل ترا رنج و محن میں تھا

ہر دم مدینہ ونجف و کربلا کی فکر
تیرا کہاں جواب محبت کے فن میں تھا

(۱۹۶۸)

غزلیں

☆

تقدیر بگڑتی جاتی ہے گو بات بنائے جاتے ہیں
وہ اتنا ہی روٹھے جاتے ہیں ہم جتنا منائے جاتے ہیں

اب جا کے نہیں آنے والے کچھ طور یہ پائے جاے ہیں
ہنستے ہیں تسلی دینے کو اور اشک بھی آئے جاتے ہیں

رہ رہ کے دھڑک اٹھتا ہے جگر اور سانس بھی اکھڑی جاتی ہے
اے موت ٹھہر تعجیل نہ کر دم بھر میں وہ آئے جاتے ہیں

باتوں میں مروت کے رشتے وہ توڑ رہے ہیں ہنس ہنس کر
آنکھوں سے محبت کے ساغر رہ رہ کے پلائے جاتے ہیں

ان کو ہے چمن سے کیا مطلب یا پھول کھلیں یا آگ لگے
جن تنکوں نے رشتہ جوڑا تھا چن چن کے جلائے جاتے ہیں

بتلائیں حبیب زار تمہیں کیا شام فراق میں ہائے چراغ
کس طرح جلائے جاتے ہیں کس طرح بجھائے جاتے ہیں

(۱۹۳۴)

☆

دیکھ کر مجھ کو وہ گھبرایا بہت
ایک آنسو میرے کام آیا بہت

دھوپ جب صحرا میں تڑپانے لگے
ایک ٹہنی کا بھی ہے سایا بہت

ترکِ الفت پر مجھے بھی رنج تھا
اور وہ ظالم بھی پچھتایا بہت

قلب کا آئینہ ٹوٹا تو مگر
غم کے ہر پتھر سے ٹکرایا بہت

درد و غم عشق بتاں ضبط فغاں
اب ہے میرے پاس سرمایا بہت

وہ تو میرے دل کے اندر تھا میں
طور پر میں جا کے پچھتایا بہت

جب جوانی میں بڑھیں محرومیاں
میرا بچپن مجھ کو یاد آیا بہت

وقت آخر یہ نظر آیا حبیب
کم ہی کھویا دہر میں پایا بہت

☆

حکم حاکم ہے عزم سفر کاٹ دو
قید کرنے سے پہلے ہی پر کاٹ دو

چھاؤں حق ہی نہیں اہل افلاس کا
سایہ دیتے ہیں جو وہ شجر کاٹ دو

یہ کیا والی شہر نے فیصلہ
جو جھکاتا نہیں تو سر کاٹ دو

دیکھنے دو نہ ایوانہائے بلند
آنکھ والوں کا تار نظر کاٹ دو

روشنی کا غریبوں سے کیا واسطہ
آسمانوں سے رنگ سحر کاٹ دو

فیض پائے نہ طاقت سے ناطاقتی
رشتۂ آفتاب و قمر کاٹ دو

خود پناہی میں کوئی مزاحم نہو
اس کی خاطر گلوئے بشر کاٹ دو

اے حبیب اب خوشامد ہے اصل سخن
خود ہی تم اپنا دست ہنر کاٹ دو

☆

دنیا کو پھونک دے گی یہی خامشی کی آگ
دیکھی کہاں کسی نے ابھی زندگی کی آگ

پھر دیکھنا سفید پروں پر سیاہ داغ
روشن کبھی تو ہوگی مری بے بسی کی آگ

موقع ملے تو تیرگیِ دل بھی دیکھنا
پہچانتے ہو تم تو فقط روشنی کی آگ

طبع بشر میں عنصر آتش بھی ہے نہاں
اکثر بھڑک بھی جاتی ہے سادہ دلی کی آگ

ہلکی سی گدگدی نے جلائے ہیں لاکھ تن
ملکوں کو راکھ کر گئی اک دل لگی کی آگ

سارے جہاں کو قطع محبت کی دھمکیاں
تنہا رہو گے پال کے دل میں خودی کی آگ

ممکن ہے دل کے جلنے سے روشن ہو شہرِ غم
پی لو نظر جو آئے کہیں دوستی کی آگ

اے دوست اس ادا پہ فدا ہے دل حبیب
پیاری ہے تجھ سے بڑھ کر تری برہمی کی آگ

(۱۹۷۴)

☆

جس کا مجھے ارماں ہے وہ اکثر نہیں ملتا
میں ہوش میں ہوں اور مجھے گھر نہیں ملتا

انسان سے رخصت ہوا معیار فضیلت
دستار تو لاکھوں میں ہیں مگر سر نہیں ملتا

پیشانیاں ڈھونڈیں تو کہاں اپنا ٹھکانہ
سجدوں کا جو مرکز تھا وہی در نہیں ملتا

جو چاہے سنے ہے یہ مرے قلب کی آواز
جو حق ہے مرا سب کے برابر نہیں ملتا

جب تک طلب صبر تھی دل نے نہ دیا ساتھ
اب ذوق ستم ہے تو ستم گر نہیں ملتا

دیوانگی شوق کا کیسے ہو نظارہ
سر پھوڑنا چاہوں بھی تو پتھر نہیں ملتا

تم کو تو حبیب اس نے صدا دی ہے کئی بار
ایسا تو کسی کو بھی مقدر نہیں ملتا

(۱۹۶۹)

☆

یہ شان وفا غم کی حکایت سے ملی ہے
دولت مجھے یہ درد محبت سے ملی ہے

عالم کو بہاراں ہے کئے اس کی تمنا
گلشن کو مہک پھول کی صحبت سے ملی ہے

اک حشر ہے اس کا کسی کوچے سے گزرنا
رفتار کی حد، حد قیامت سے ملی ہے

ذرے سے جو سنتا ہوں میں سورج کی کہانی
یہ آگہی مدت کی ریاضت سے ملی ہے

مشکل کی ہر اک شکل پہ میرا ہے تصرف
مجھ کو یہ سند شاہ ولایت سے ملی ہے

اس قوم کے اب کوئی بھٹکنے کا نہیں ڈر
منزل جسے صدیوں کی مسافت سے ملی ہے

تم یاد نہ رکھو مجھے لیکن یہ رہے یاد
شہرت تمہیں میری ہی محبت سے ملی ہے

(۱۹۵۷)

☆

ذرا سے دل میں محبت کا سوز لائے ہیں
جو اٹھ سکا نہ کسی سے وہ بار اٹھائے ہیں

جہاں جہاں ترا نقش قدم نظر آیا
کسی نے بیٹھ کے آنسو وہیں بہائے ہیں

ہمارے قتل کا تم پر ہی آئے کیوں الزام
تمہارے نام کے ساتھ اور نام آئے ہیں

اب آگے حشر میں کیا ہوگی بود و باش حیات
ہم اس مقام تک انسانیت کو لائے ہیں

مرے ہی باغِ وفا سے نہ پھل ملے مجھ کو
مگر میں خوش ہوں کہ کچھ ڈالیوں کے سائے ہیں

حبیب ان کو کبھی رہزنوں کا خوف نہیں
جو اپنے گاؤں میں کچے مکاں بنائے ہیں

(۱۹۸۲)

☆

کسی طرح بھی وہ تکمیل مدعا کرتے
وفا کی خو جو نہیں تھی تو پھر جفا کرتے

ادائے حسن تو طالب ہے جانثاری کی
کلیم کیسے تجلی کا سامنا کرتے

تمام عمر خدا سے یہی دعا مانگی
وہ دن بھی آتا کہ وہ مجھ سے التجا کرتے

ہمیں کسی کی طلب کا بھرم تو رکھنا تھا
جو ہم یہ جان نہ دیتے تو اور کیا کرتے

فقط تحفظ کشتی کا دھیان تھا ورنہ
ہم اور منتِ احسانِ ناخدا کرتے

ذرا بتائیں جو فرقت میں ہم پہ بیت گئی
یہ وقت آپ پہ پڑتا تو آپ کیا کرتے

میں ان کے لب کی دعا کا اٹھاؤں کیوں احسان
جو دیکھنے کو نہ آئے وہ کیا دعا کرتے

وفا ہے آج بھی ھَل مِن مَزِید کی طالب
حبیب مر گئے کتنے وفا وفا کرتے

(۱۹۷۱)

☆

انداز دلبری کے دکھا کر کریں گے کیا
آئے وہ میرے بعد تو آ کر کریں گے کیا

الفت کے تذکروں پہ ہوں پابندیاں جہاں
اس بے وفا کی بزم میں جا کر کریں گے کیا

مجبوری حیات کے پھیلے ہوئے ہیں پاؤں
ایوانِ خواہشات سجا کر کریں گے

خود داریٔ وفا کو طلب سے ہے جب عناد
مدہوشیوں کو ہوش میں لا کر کریں گے کیا

اس کو پسند ہی نہیں گلگونیٔ حیات
بے فائدہ لہو میں نہا کر کریں گے کیا

بیگانۂ رسوم پرستش ہے جب یہ دل
کعبہ بسا لیا تو بسا کر کریں گے کیا

جب ان کے شغل کو ہے اندھیروں سے اجتناب
ہم مشعلِ حیات بجھا کر کریں گے کیا

جب آرزو ہی اٹھ گئے دنیا سے اے حبیب
ہم بانسری ادب کی بجا کر کریں گے کیا

(۱۹۵۶)

☆

یہ تو ممکن نہ تھا وفا کرتے
آپ مل کر بھی مجھ سے کیا کرتے

ڈر گئے برق کی چمک سے کلیم
بات تو جب تھی سامنا کرتے

آ تو جاتے کہ وقت آخر تھا
میرے مرنے ہی کی دعا کرتے

نہ ملے وہ نہ حسرتیں نکلیں
کٹ گئی عمر مدعا کرتے

ہجر محبوب کا علاج تو تھا
زخمِ حسرت کیا دوا کرتے

جو ہیں نا آشنائے حرفِ وفا
وہ کسی سے کہاں وفا کرتے

ان کے آنے سے میں نہ جی جاتا
رسمِ دنیا تو وہ ادا کرتے

خلق کی یہ صدا بھی سن لو حبیب
سفرِ دشتِ کربلا کرتے

(۱۹۶۵)

☆

میں تج کے بیٹھا ہوں جس روز سے زمانے کو
سنا رہا ہے زمانہ مرے فسانے کو

قسم ہر ایک نے کھائی ہے حفظِ گلشن کی
اب آ کے برق جلائے تو آشیانے کو

وہی زمانہ جو ہنستا تھا زندگی پہ مری
چلا ہوں چھوڑ کے روتے اسی زمانے کو

لبوں سے جن کے برستے تھے قہقہے دن رات
وہ لوگ آج ترستے ہیں مسکرانے کو

مجھے تو آپ کے ہر فیصلے پہ چلنا ہے
جو حکم دیں تو بدل دوں ابھی زمانے کو

سوالِ عشق پہ جن و ملک رہے خاموش
ہمیں چنے گئے یہ بارِ غم اٹھانے کو

ادب کے چاند ستاروں کا آسماں یہ ہے
شرف یہ حق سے ملا ہے غریب خانے کو

(۱۹۸۷)

☆

ایسا اک عہد کہ جس کا کوئی جواب نہ تھا
وہ میرے شوق کی تکمیل تھی شباب نہ تھا

یہ کس نے دن میں ہٹالی نقاب چہرے سے
نظر اٹھا کے جو دیکھا تو آفتاب نہ تھا

تمام عمر مری آنکھ سے وہ دور رہا
یہ وہ چمن تھا جو منت کش گلاب نہ تھا

جو سطحِ آب پہ ابھرا ابھر کے ٹوٹ گیا
وہ میری عمر کا آئینہ تھا حباب نہ تھا

وہ آئے بزم میں میرے سوا ملے سب سے
جو میں نے خواب میں دیکھا وہ کوئی خواب نہ تھا

کلیمِ طور کی حالت بدل گئی جس سے
وہ اک نظر کی کرامت تھی انقلاب نہ تھا

اسے پسند نہ آیا خلوصِ دل نہ سہی
حبیب تیری وفا کا کوئی جواب نہ تھا

(۱۹۳۶ء)

☆

میری خود دار طبیعت کو جاگتے کیوں ہو
جب مجھے بھول چکے سامنے آتے کیوں ہو

جب یہ طے ہے کہ گرادینگے خزاں کے جھونکے
صحن گلشن میں یہ دیوار اٹھاتے کیوں ہو

برق و باراں کی جو سازش میں ہے مدت سے شریک
آشیانہ اسی ڈالی پہ بناتے کیوں ہو

بحرِ ہستی سے تباہی کی شکایت ہے عبث
نقش بہتے ہوئے پانی پہ بناتے کیوں ہو

میرے مشرب میں محبت کی نمائش ہے حرام
بزمِ اغیار سے شکوہ ہے تو جاتے کیوں ہو

شیوہ حسن نہیں راز کا افشا کرنا
تم جسے سن نہیں سکتے ہو سناتے کیوں ہو

درد کی لے کا نہیں لحن سکوں سے کوئی ربط
میری آواز سے آواز ملاتے کیوں ہو

جن کے سننے کو جہاں میں کوئی تیار نہیں
تم حبیب ایسے فسانے کو سناتے کیوں ہو

(۱۹۵۶)

☆

شام وعدہ گاہ روتا گاہ ہنستا دیکھتے
آپ تو آئے نہیں ورنہ تماشا دیکھتے

حوصلہ دل کا اٹھا کر تم یہ پردا دیکھتے
جذب کرلیتے تمہیں اپنے میں اتنا دیکھتے

اپنی صورت اپنا پرتو اپنا جلوا دیکھتے
آپ دل کو توڑ دیتے تو تماشا دیکھتے

دید کی حسرت تھی موئیٰ ذوقِ نظارہ نہ تھا
ورنہ اپنے آئینے میں ان کا جلوا دیکھتے

خود بڑھے تھے وہ ہماری سمت پیمانہ بکف
دیکھتے ان کا کرم یا روئے توبہ دیکھتے

چار دن میں اپنی صورت ہی نہ پہچانی گئی
ہم کہاں سے زندگی لاتے کہ دنیا دیکھتے

سر جھکا کر لے گیا گردن پہ خود خونِ وفا
کس طرح چہرے سے ان کے رنگ اڑتا دیکھتے

روک لی چلو میں توبہ توڑ کر بے اختیار
ہائے کن آنکھوں سے ہم ساغر چھلکتا دیکھتے

کاش جو انجام موئیٰ پر ہیں نازاں اے حبیب
ایک دن میرا بھی وہ ذوقِ نظارہ دیکھتے

(۱۹۳۸)

☆

جاتے جاتے رخ محبوب کا دیدار ملے
میری نظروں سے کبھی وہ نگہ یار ملے

جانے وہ کون تھا جس کو کہیں سایا نہ ملا
کچھ نشاناتِ محبت پس دیوار ملے

ان کی نظروں سے تو گھائل ہیں طلبگار حیات
اور دل کی یہ طلب ہے وہی تلوار ملے

دل کی دھڑکن سے بس اک نام کی آتی ہے صدا
مدتیں ہوگئیں ان سے مجھے یکبار ملے

گاہکوں نے مرے سر کی تو لگائی قیمت
میری الفت کے نہ دنیا میں خریدار ملے

عمر بھر راز تمنا کو چھپایا میں نے
مٹ گیا میں تو مرے عشق کے آثار ملے

ایک میں تھا کہ چلا بار تمنا لے کر
جو ملے راہ میں مست مئے پندار ملے

مشکلیں آتی ہی رہتی ہیں محبت میں حبیب
کیا ضروری ہے کہ ہر راستہ ہموار ملے

(۱۹۷۴)

☆

مہبطِ عشق کو گریاں بخدا می بینم
بند ہوتے ہوئے بازار وفا می بینم

بے حجابی کا یہ انداز الٰہی توبہ
نازنینوں سے جدا شرم و حیا می بینم

عمل خیر ہے اللہ کے بندوں پہ گراں
فکر انساں میں سبک جرم و خطا می بینم

کوئی سنتا نہیں تسبیح کے دانوں کی پکار
دستِ زہاد میں آلاتِ غنامی بینم

عالمِ وقت کی تضحیک ہے امت کا شکار
حاکمِ وقت کی اب مدح و ثنا می بینم

بھیس اپنائے ہے شاہیں کا ہر اک زاغ و زغن
حق نوائی کی جگہ مکرو دغامی بینم

پستی ذوق مسلماں نے وہ کھائے ہیں فریب
سرنگوں اب علم صدق و صفا می بینم

مدحت زر میں حبیب اتنے ہیں مشغول ادیب
باغ افکار میں مسموم ہوا می بینم

(۱۹۵۴)

☆

دیکھ کر مجھ کو وہ گھبرایا بہت
ایک آنسو میرے کام آیا بہت
وقت آخر یہ نظر آیا حبیب
کم ہی کھویا دہر میں پایا بہت

حبیب جونپوری

قصائد

قصیدہ در مدح ساقیِ کوثر حضرت علیؑ

صدقے ترے سر مستِ انداز خود آرائی
ہاں ہاں اسی صورت سے پھر اور اک انگڑائی

کہنے سے نہیں تیرے جن جن کی قضا آئی
ہاں کہہ کے دکھا ان کو اعجازِ مسیحائی

اک وہ ہیں کہ کل عالم جن کا ہے تماشائی
اک ہم ہیں کہ مونس ہے جس کی شب تنہائی

خود کھل گیا وہ دیکھو قفل در زنداں بھی
وحشت میں اسیروں نے زنجیر جو کھڑکائی

وحشت جو ہوئی زاہد سر سنگ سے ٹکرا کر
صحرا کی زمیں خوں سے رنگنے لگے سودائی

اتنے میں خبر جا کر یہ باد صبا لائی
گلزار امامت میں اک تازہ بہار آئی

اک مژدۂ جاں پرور جب لے کے بہار آئی
لی ساقی کوثر کے رندوں نے بھی انگڑائی

ہر ذرہ چمکتا ہے ہر سبزہ لہکتا ہے
ہر پھول مہکتا ہے کہہ کہہ کر بہار آئی

کلیاں بھی لکھیں جیسے دیوار حرم شق ہو
یا ہنس دے کوئی مہر و ہنگام خود آرائی

تاخیر نہیں زیبا ہے وقت کرم ساقی
خم خانۂ وحدت سے دے ساغر صہبائی

تقدیر کی خوبی ہے یا لطف الٰہی سے
لو اور پیو رندو کعبے میں بہار آئی

جب شوق عبادت میں واں بنت اسد آئیں
ہنستی ہوئی کعبے کی دیوا رنظر آئی

کعبے ہی میں بچے کے تیور کے اشارے میں
کچھ بڑھ کے کرے گا یہ کونین پہ دارائی

ہاتھوں کو جھٹکتا ہے رہ رہ کے ہمکتا ہے
اصنام کو تکتا ہے لے لے کے یہ انگڑائی

آغوش میں احمد نے جس دم لیا بھائی کو
ملتی ہوئی صورت سے تصویر نظر آئی

موسیٰ کا ید بیضا جاں بخش دم عیسیٰ
کعبے میں ہوا پیدا خود دیکھ لیں عیسائی

یوسف نے جسے دیکھا برہان کی صورت میں
صدقے میں ملی جس کے یعقوب کو بینائی

جو نوح کی کشتی کو طوفاں سے بچا لایا
ایوب کو دیتا تھا جو درسِ شکیبائی

موسیٰ کو سکھاتا تھا انداز تکلم کا
عیسیٰ کو بتاتا تھا جو طرزِ مسیحائی

مسجد سے نظر جس کی افلاک کے پردوں تک
جبریل کو دیکھ آئی اللہ ری بینائی

اے احمد لاثانی کیا چاہیے اب تم کو
زہرا سی ملی بیٹی حیدر سا ملا بھائی

تربت میں علی آئے تو ساتھ ملائک کے
محبوب اٹھتا کہتا روحی لاک مولائی

(۱۹۳۹ء)

قصیدہ در مدحِ حیدرِ کرّار

بشر سے کیا ثنا ممکن ہو داماد پیمبر کی
جمالِ ایزدی کا آئینہ ہے ذات حیدر کی

علی کا نور نورِ حق ہے عالم پر یہ روشن ہے
موید مرے دعوے کی حدیثیں ہیں پیمبر کی

یہ شمعِ حسنِ خالق مختلف فانوس میں آئی
بنے کون و مکاں قندیل اک مصباح انور کی

کبھی پیشانی آدم میں چمکا یہ بصد عزت
کبھی وہ امر رب تھا جو بنا تھا روح پیکر کی

سفینہ بن کے طوفاں سے نکالا نوح کو اس نے
وگرنہ کیا بچالیتیں انہیں موجیں سمندر کی

نکالا چاہ سے یوسف کو بھی حبل متیں بن کر
بچائی جاں علی کے عشق نے اس حسن پیکر کی

کبھی نمرود کا آتش کدہ گل کر دیا اس نے
کبھی مفلوج کر دی خود سری فرعون کے سر کی

کبھی داؤد کی رگ رگ میں نغمہ بن کے یہ دوڑا
بنایا موم لوہے کو خبر لو باب خیبر کی

ہوئے خاموش سب نغمے چہ عبرانی چہ سریانی
صدا کعبے میں دی حیدر نے جب اللہ اکبر کی

کبھی موسیٰ کو گھر سے ساحل مقصود تک لایا
مگر قسمت میں کھائی تھی ہوا فرعون کے گھر کی

مگر مکے میں آتے ہی مجسم نور حق بن کر
نبی کی گود میں آیا یہ قسمت تھی پیمبر کی

نبی کے ساتھ یہ چمکا کبھی لاکھوں کے مجمع میں
کبھی تنہا شب ہجرت بنا زینت یہ بستر کی

کبھی مہتاب کے ٹکڑے اڑائے چھوٹ نے اس کی
کبھی منزل بدل دی دفعتاً خورشید خاور کی

کبھی بزم تولا میں ہوا اس درجہ ضو افگن
کہ صورت دیکھنی مشکل ہوئی رندوں کو ساغر کی

کبھی عرش بریں پر بات کی حق کے پیمبر سے
کبھی زینت زمیں بن گیا اللہ کے گھر کی

غرض دونوں جہاں روشن ہیں اس کی نور خیزی سے
ضیا عالم میں پھیلی ہے جمال روئے حیدر کی

بلالو اپنے روضے پر حبیب زار کو مولا
یہی ہے آرزو اک عمر سے اس مدح گستر کی

(۱۹۴۰)

قصیدہ در مدح علیؑ عقدہ کشا

ہٹی ظلمت عروس صبح نکلی بے حجابانہ
برے راہداری مل گیا سورج کو پروانہ

ہٹا کر شب کا گھونگھٹ روئے بانوئے سحر دیکھا
جوانان چمن نے دے کے پر اخلاص نذرانہ

چلے بستر سے اٹھ کے اہل دیں شوق عبادت میں
مسلماں جانب مسجد برہمن سوئے بت خانہ

جنہیں پاس ادب سے بولنا مشکل تھا مجمع میں
غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں باآواز مستانہ

غزل

وفورِ غم میں جب بھی چھیڑتا ہوں اپنا افسانہ
کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہے دیوانہ

گلے پر تیغ رکھ دو خطرۂ روزِ جزا کیسا
وہاں بھی حسبِ عادت قتل سے میرے مکر جانا

ہمیں جب جان ہی دینی ہے چل کر آج ہی دیدیں
اجل کا راستہ دیکھے وہ کیوں جس کو ہو مرجانا

اجل نے پردہ پوشی کی رہے جذبات دل مخفی
وگرنہ آچکا تھا راز تالب ہائے دیوانہ

صبا کہنا مری جانب سے حالت غیر کیا جانے
مزا جب ہے سنو میری زباں سے میرا افسانہ

تمہارے حسن فتنہ ساز نے لاکھوں کی جاں لے لی
نہ جلتی شمع محفل میں نہ مرتا اس پر پروانہ

وہ میرا دل ہے جو گور غریباں حسرتوں کا ہے
وہ میں ہوں ان کی محفل میں جسے کہتے ہیں دیوانہ

خدا کو جب ہوئی منظور تحقیق دل عاشق
بنایا لفظ کن نے آگ سے الفت کا پیمانہ

یہی ہے رسم الفت کو کون پوچھے جا کے قاتل سے
عداوت چاہنے والوں سے غیروں سے ہے یارانہ

خدا جانے ملے القاب کتنے راہ الفت میں
خراب و خستہ و رسوا غلام عشق دیوانہ

بلا ہے زلف پیچاں آنکھ ان کی عین آفت ہے
انہی دونوں نے مل جل کر بنایا مجھ کو دیوانہ

نہ کھلنے سے جو قفل در نہ مل سکتا ہو پیمانہ
چلو ٹکرا کے سر ہی شق کریں دیوار میخانہ

ہو مشکل تو بلالیں فاطمہ کو کھول دیں آ کر
ہمارے میکدے کو جیسے حیدر کا زچہ خانہ

وہ حیدر جب تعلق تھا نہ خلقت کا مشیت سے
انہی کے نور سے آباد تھا قدرت کا کاشانہ

وہ حیدر تابع فرماں ہے جس کے حوض کوثر بھی
وہ حیدر جس کی الفت میں ملے جنت کا پروانہ

انہی کے نور نے عزت بڑھائی خاک کی ورنہ
بہت دشوار تھا آدم کا قبلہ گاہ بن جانا

چھڑایا بحر میں یونس کو قید بطن ماہی سے
سکھائے مصر میں یوسف کو آداب ملوکانہ

جو ماں کی گود میں انگڑائی لی بچے نے تھرا کر
بتوں پر بت گرے یوں جیسے پروانے پہ پروانہ

اٹھا کر ہاتھ پر بھائی کو دی منہ میں زبان اپنی
محمد نے کئے تعلیم اخلاق کریمانہ

نبی کے گھر میں زوجہ جس کی پیدا ہونے والی ہو
ضروری تھا خدا کا گھر بنے اس کا زچہ خانہ

حبیب زار مشکل سی بھی مشکل میں نہ گھبراؤ
علی عقدہ کشا ہیں سہل ہے عقدے کا کھل جانا

(۱۹۳۰)

قصیدہ در مدح حضرت علیؑ

تا بہ خلوت کہِ وحدت گئے جانے والے
پھر بھی پردے میں رہے حسن چھپانے والے

قاب قوسین کی منزل پہ کوئی غیر نہ ہو
کاش پردہ نہ ہو معراج کے جانے والے

مطمئن کردیا یُعْطِیکَ فَتَرْضیٰ کہہ کر
یونہی روٹھے کو مناتے ہیں منانے والے

وقت دیدار ہے دل چاہئے پتھر ہونا
طور پہ نقش قدم اپنا جمانے والے

اے مٹی قبر پہ ٹھوکر کے لگانے والے
ہیں یہیں دفن ترے ناز اٹھانے والے

صاف انکار کئے دیتے ہیں دل لے کے مرا
شاہ بنتے ہیں مرے دل کو چرانے والے

نزع کے وقت وہ بالیں پہ نہ آئے ہوں کہیں
وہ علی تو نہیں مردوں کو جلانے والے

وہ علی جو کہ ہوئے خلق سے پہلے پیدا
جب زمانہ ہی نہ تھا کیسے زمانے والے

عرش پہ اپنے مصلے کو بچھانے والے
مدتوں علم کے دریا میں نہانے والے

خاک سے پاک زلیخا کو بنانے والے
مکر سے حضرت یوسف کو بچانے والے

دست موسیٰ کو ید بیضا بنانے والے
عہد عیسیٰ میں صدا اپنی سنانے والے

آخرش زینتِ اصلاب رہے گا کب تک
چھپ کے بگڑے ہوئے کاموں کو بنانے والے

آئی آواز کہاں پہلا قدم میں رکھوں
بڑھ کے کعبے نے کہا آ یہاں آنے والے

تجھ سے نورانی ہوئی مردمک چشم حرم
نور بن کر مری آنکھوں میں سمانے والے

جشنِ غدیر

پیام موت اس جانب ادھر وعدہ ہے وصلت کا
کدھر جاؤں خدایا سامنا ہے سخت آفت کا

ہمیں کیا کون آیا کون رویا کس نے سر پٹکا
اسیر موت سے پوچھو مزہ آغوش تربت کا

سنبھل کر چلنے والے زلزلہ پیدا ہے مرقد میں
کہیں ٹھوکر سے برپا ہو نہ ہنگامہ قیامت کا

فرشتو ہٹ کے بیٹھو مشل موسیٰ غش نہ آجائے
حبیب راز کی تربت میں جلوہ ہے امامت کا

سلامت میکدہ موقع نہیں اظہار حاجت کا
خدا رکھے تجھے ساقی پلادے جام الفت کا

وہ مے پینا پلانا قدرت حق جس کا منشا ہے
وہ مے کہتے ہیں جس کو باب علم و فضل و حکمت کا

جسے پیتے ہی خالق کی زباں پر کن ہوا جاری
جسے پیتے ہی پہنا نور نے ملبوس خلقت کا

وہ مے ہر قطرہ جس کا رحمت خلاق عالم ہے
وہ مے ہر جام جس کا قدرتی پیکر ہے عصمت کا

کبھی تھا علم خلاق جہاں میں میکدہ جس کا
کبھی معنی کن بن کر ہوا محبوب قدرت کا

حجب میں، علم کے دریا میں جنت میں رہا برسوں
بنے اولاد آدم بن گیا منشا شرافت کا

کیا آتش کدہ گلزار جس کے ایک چھینٹے نے
بنے لقماں بنا ہر قطرہ جس کا درس حکمت کا

ید موسیٰ ید بیضا بنا رونق سے جس مے کی
سلیماں کو سلیقہ جس نے سکھلایا حکومت کا

دوبالا حسن یوسف ہوگیا جس مے کے پینے سے
نبی جو آنکھ میں یعقوب کی سرمہ بصارت کا

خم وحدت میں بن کر چھنی مریم کے دامن میں
بٹی کعبے میں جب تھا جشن ساقی کی ولادت کا

دوبارہ پھر ہوئی تقسیم جب دعوت کا وقت آیا
سہ بارہ پھر ہوئی تقسیم جب موقع تھا ہجرت کا

یونہی موقع بہ موقع پیتے پیتے وقت وہ آیا
غدیر خم میں رندوں نے کیا صدقہ سخاوت کا

مرے ساقی لٹادے آج اپنا میکدہ سارا
کہ رندوں کی تصدق چاہیئے تیری خلافت کا

نبی منبر پہ آئے وحی آئی مرتضیٰ آئے
سر اقدس پہ حیدر کے بندھا سہرا خلافت کا

ملک اترے نبی اترے ولی بن کر علی اترے
عداوت سے جلا جاتا تھا دل اہل شقاوت کا

حبیب آیا ہے شرکت کے لئے جشن غدیری میں
کرم پیش نظر بالائے سر سایا ہے رحمت کا

قصیدہ در مدح امام حسنؑ

فضا اچھی نہیں معلوم ہوتی آج صحرا کی
بہار جا نفزا نے آ کے وحشت اور پیدا کی

ابھرنا کیا مرا میں تو غریق بحر حسرت ہوں
نہیں آسان آزادی گرفتار تمنا کی

احبا ہو گئے رخصت لحد میں چھوڑ کر تنہا
سر تربت مری حسرت مجھے تا حشر رویا کی

وہ جن کی محفلیں معمور تھیں اسباب راحت سے
کفن کے واسطے اغیار نے چادر مہیا کی

جنھیں افشاں کے ذرے بار تھے حد نزاکت پر
انہیں کے جسم پر دیکھو پڑی ہے خاک صحرا کی

وہ عالم ہو کا ہر جانب وہ سناٹا سا تربت میں
جہاں ہیبت سے خود شمع لحد بھی جھلملایا کی

نہ اتنا تھا کوئی تربت پہ دو آنسو بہا دیتا
فقط اک رونے والی شمع مدفن تھی جو رویا کی

وہ نقشہ ہوں مٹوں گا میں نہ دنیا کے مٹانے سے
وہ قطرہ ہوں فنا ہو کر بنوں گا موج دریا کی

جگہ جس دل میں پائی اس نے دشمن ہو گیا اس کا
زمانہ اس کا شیدا ہے مگر ہر شخص ہے شاکی

نکالا خلد سے آدم کو اور دنیا میں پھر بھیجا
بنائی بھی بگاڑی بھی جہاں تصویر حوا کی

اسی نے حکم دے کر انبیاء سے کعبہ بنوایا
اسی نے پھر ضیائے نفس پیغمبر ہویدا کی

مجھے لکھنا جو تھی مدحت حسن کے روئے زیبا کی
سیاہی اپنی اپنی آنکھ کی حوروں نے یکجا کی

دوات خلد لائے جب ملک تحریر مدحت کو
قلم بن کر چلی افلاک سے اک شاخ طوبیٰ کی

بہار آئی نہ کھولا باب زنداں ہائے ظالم نے
قفس میں غم رسیدہ بلبل ناشاد تڑپا کی

غشی طاری ہوئی جب سے نہ مجھ کو ہوش پھر آیا
گلاب جنت الفردوس لا کے حور چھڑکا کی

یونہی کیا کم تھی صحن باغ میں نزہت کہ اس پر بھی
نگاہ نرگس شہلا بڑی حیرت سے دیکھا کی

خزاں کی فوج کو دے کر شکست فاش گلشن پر
ہوا وہ حکمراں جس کی قبا ہے سبز دیبا کی

نگار باغ نے پہنا ہے شاہانہ لباس نو
مبارک ہو جوانی پھر پلٹ آئی زلیخا کی

چلو سیر چمن کو تم حبیب زار سنتے ہیں
گلوں نے بزمِ میلاد حسن گلشن میں برپا کی

زمیں سے تا فلک غل تھا حسن کی آمد آمد کا
مگر شب بھر نبی کی لاڈلی بستر پہ سویا کی

برائے خدمت سبط پیمبر گھر میں زہرا کے
سواری آچکی مریم و حوا و سارا کی

زمیں کیسی حریم ناز قدرت بھی ہوا روشن
ضیا افلاک تک پہنچی حسن کے روئے زیبا کی

وہ نور حق کہ جس کو دیکھ کر موسیٰ کو غش آیا
ملا دی خاک میں تصویر جس نے طور سینا کی

بنا تھا تو وہ مطلوب دو عالم قطب عالم میں
وگرنہ قابل سجدہ نہ ہوتا پیکر خاکی

حبیب اب سارا عالم ایک زباں ہو کر یہ کہتا ہے
حسن نے زیر کی ہے شام کے حاکم کی چالاکی

(۱۹۳۸)

قصیدہ در مدح امام حسینؑ

ابھی آغاز الفت ہے ابھی کچھ عہد و پیماں ہے
جو نبھ جائے تو جانو منہ سے کہہ دینا تو آساں ہے

نہ جانے کیسی بے چینی ہے میری روح بے کل ہے
کہ قاتل چپ کھڑا ہے خنجر قاتل پشیماں ہے

لٹا کر کربلائے عشق میں سرمایۂ ہستی
چلا ہوں سر کٹانے یوں کہ خود قاتل بھی گریاں ہے

جوانی لا کے پیغام اجل خود مجھ پہ روتی ہے
اجل اب دیکھ کر صورت مری خود ہی پریشاں ہے

عروس مرگ کا شائق بنا نو شاہ دل اپنا
برائے رونمائی پاس نقد جان بیجاں ہے

حبیب اپنا نہ مونس ہے نہ یاور ہے کوئی باقی
ہزاروں میں اکیلا اس پہ قصد کوئے جاناں ہے

یہ بکھرے بال آنکھیں سرخ چہرہ خاک آلودہ
ابھی زندہ ہوں پھر کس کے ماتم کا یہ ساماں ہے

ارے او آنے والے تربتِ دل ہر قدم پر ہے
سنبھل کر پاؤں رکھنا دیکھنا گور غریباں ہے

سفینہ حسرتوں کا ڈوبتا ہے آج خشکی میں
جہاں پانی کی موجیں ہیں نہ دریا ہے نہ طوفاں ہے

کہاں تک اے حبیب زار ذکر غم خبر بھی ہے
پھر آئی تیری شعباں کہ ہر وادی گلستاں ہے

یہ جلسہ تیسرا ہے آج گلزار امامت کا
تعجب ہے کہ گل کے روبرو گلچیں بھی شاداں ہے

وہی ہے بات گر معصوم کے لب سے نکل جائے
لئے پوشاک دیکھو خود ہی دروازے پہ رضواں ہے

اگر پوشاک اک معصوم کے کہنے سے آئی ہے
تو ہے یوسف کا دامن اور احمد کا گریباں ہے

نبی زادی کی گودی میں ہے اک بچہ کہ مہ پارہ
حسین ابن علیؑ ہیں یا مہ کامل درخشاں ہے

یہی ہے حسن میں یوسف یہی ہے زہد میں عیسیٰ
یہی ہیبت میں موسیٰ ہے یہ ابن کل ایماں ہے

یہ خود جنباں ہے یا کوئی ملک جھولا جھلاتا ہے
کہ دست قدرتِ رب العلا گہوارہ جنباں ہے

مجھے تو شرم لاحق ہے مگر دنیا یہ کہتی ہے
نبی کے لاڈلے تیرا حبیب اب تک پریشاں ہے

(۱۹۳۷)

قصیدہ در مدح امام زمانہؑ

یہ اچھا کھیل ہے آفت زدوں کا دل دکھا دینا
کسی کو دکھ کسی کو درد وہ بھی لا دوا دینا

جو سر دینا مجھے یارب تو سودائے فنا دینا
جو دل دینا مرے پہلو میں تو درد آشنا دینا

خلاف ضبط غم ہے ورنہ یہ بھی کوئی مشکل تھا
در و دیوار زنداں اپنی آہوں سے ہلا دینا

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں چلو رہنے دو جاؤ بھی
کوئی مشکل نہ تھا غیروں کو پہلو سے اٹھا دینا

دل مشتاق کا روز ازل سے یہ تقاضا ہے
ہمیں جو درد دینا یا الٰہی لا دوا دینا

مداوا چاہئے دشمن بھی گر آجائے ملنے کو
گلے کا فرض ہے خنجر کو اپناں خوں پلا دینا

دل بلبل کی آہوں نے لگائی آگ تنکوں کو
یہی ہے اپنے ہاتھوں خود ہی اپنا گھر جلا دینا

بہار آئی چمن میں جام مے ہاں ساقیا دینا
جو مے پیتے رہے ہیں اہل ایماں وہ پلا دینا

وہ مے نشے نے جس کے جزر و مد پیدا کیا دل میں
وہ مے آتا ہے قطرے کو جسے دریا بنا دینا

فرشتوں کو جھکایا جس نے آدم کی طرف وہ مے
کرشمہ جس کا ہے انسان کو قبلہ بنا دینا

سفینۂ نوح کا جس دم پھنسا موج حوادث میں
اسی کا کام تھا طوفاں سے کشتی کو بچا دینا

مناسب کب ہے ساقی ایک اک ساغر پلا دینا
سخی کو چاہئے ہے خم کے خم منہ سے لگا دینا

ولادت آخری معصومؑ کی ہے آج عالم میں
اگر کچھ بچ رہے اپنوں سے غیروں کو پلا دینا

یہ دور آخری ہے اب نہ کوئی اور آئے گا
تجھے لازم ہے ساقی آج میخانہ لٹا دینا

امام منتظرؑ نور نظر حیدرؑ کا آیا ہے
وہ جس کا کام ٹھکرا کے مردوں کو جلا دینا

کبھی قرآن کو نقطے کی صورت میں دکھا دینا
کبھی تفسیر بسم اللہ کو دریا بنا دینا

صف اعدائے دیں کو چیر کر ہلچل مچا دینا
کبھی جنگاہ میں اللہ اکبر کی صدا دینا

امام عصر ہو لازم ہے اب جلوہ دکھا دینا
جو غش آجائے مجھ کو اپنے دامن کی ہوا دینا

مری طینت کا ہر اک ذرہ مشتاق زیارت ہے
حجاب غیب کے ساکن رخ روشن دکھا دینا

جو مرجائے کوئی عالم میں مثل امت موسیٰ
تو خود کھا کر ترس تم قم باذنی کی صدا دینا

یہ مانا ہے خلاف مصلحت پردہ اٹھا دینا
تو کیا مشکل ہے تسکین دلِ درد آشنا دینا

دلِ مداح آیا ہے عریضہ لے کے تا ساحل
تمہیں سوچو تمہیں لازم ہے کیا اس کا صلہ دینا

عریضہ ہے کہ دفتر حسرتوں کا پیش ہے مولا
کریم النفس ہو سائل کو حاجت سے سوا دینا

امام وقت ہونے میں اگر کرتا ہے شک کوئی
تو جاء الحق کا کتبہ اپنے بازو پر دکھا دینا

کریں اخفائے نورِ حق میں اعدا کوششیں لیکن
یہ وہ صباح ہے جس کا نہیں ممکن بجھا دینا

بھٹکتا پھر رہا ہو سامرہ میں جب یہ دیوانہ
حبیب زار کو مولا درِ دولت دکھا دینا

قطعات

رباعیات

بہشت ناز کی کلیوں کو توڑ دے ساقی
فدا میں قلب شکستہ کو جوڑ دے ساقی
چھلک گئی مرے حصے کی بیخودی میں شراب
اب آستین ہی اپنی نچوڑ دے ساقی

دل لے کے مرا درد مجھے تول دیا
انمول لیا مال اور انمول دیا
دے دے کر ہاک گام پہ الفت کا سبق
تو نے مری ہستی کا سبب کھول دیا

اپنا ہمیں کہہ کہہ کے نظر موڑ رہے ہو
جس دل کو بڑھایا ہے اسے توڑ رہے ہو
بس ایک نظر دیکھ لو پھر دوست سمجھ کر
آخر تو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہے ہو

درد میں ڈوبا فسانہ چاہیے
اور سننے کو زمانہ چاہیے
دوست دشمن سب عیادت کر چکے
وہ نہ آئے جن کو آنا چاہیے

دل یہ کہتا ہے کہ قطرہ نہ ٹپکنے پائے
تم یہ کہتے ہوئے کہ غنچہ نہ چٹکنے پائے
کیا کروں کیا نہ کروں ہائے ضدیں ہیں کیسی
جام لبریز ہے کیسے نہ چھلکنے پائے

وفورِ شوق نہ جوشِ امید رہ جائے
نہ شوقِ وصل نہ ارمانِ دید رہ جائے
وہ مل رہے ہیں گلے جانِ زار رخصت ہو
کہ تا بہ حشر مری عید عید رہ جائے

للچا کے پی گیا کبھی اٹھلا کے پی گیا
کل کائناتِ ہوش کو ٹھکرا کے پی گیا
زاہد سے تنگ دل کا جو آنے لگا خیال
یہ جام دوسرا بھی میں جھلا کے پی گیا

نہ دل پہ قابو جگر پہ نہ اختیار مجھے
بنائے دیتے ہیں مل جل کے بیقرار مجھے
چھپا چھپا کے خطائیں بچا بچا کے نظر
ترے کرم نے بنایا گناہگار مجھے

خیال سب کا ہے اپنی نظیر ہم بھی ہیں
ادب کی جانِ سخن کے امیر ہم بھی ہیں
جنوں زدوں نے بنائی ہے مل کے راہ عمل
اسی لکیر کے ہاں ہاں فقیر ہم بھی ہیں

شاعروں کی مطمئن دنیا میں شامل ہوگیا
ماہ نو ابھرا ابھر کر بدرِ کامل ہوگیا
ممتحن ہوں شاعران بے بدل کا میں حبیب
جنت الماویٰ کو سب پر فوق حاصل ہوگیا

یہ تو کہہ سکتا نہیں ہوں میں کہ ماہر ہوگیا
شعر کہہ لینے پہ لیکن اب تو قادر ہوگیا
میرا مولد بن گیا ہے مرکز علم وادب
بچہ بچہ جنت الماویٰ کا شاعر ہوگیا

غنچہ غنچہ جام برکف ہر کلی مے نوش ہے
لکہّ لکہ ابر کا اک میکدہ بردوش ہے
تربیت میں میری شامل خود دو عالم ہے حبیب
جنت الماویٰ ہے جھولا اور فلک آغوش ہے

الفت نہ کی سامانِ اجل مول لیا
یہ زہر مئے ہستی میں خود گھول لیا
سمجھو مجھے اِک مردہ بدستِ زندہ
احباب کی خاطر سے جو ہنس بول لیا

نظروں کو خدا کے سب کمالات ملے
سو بار تیقن کے خیالات ملے
مشکوک نہ اک پل کو بھی ہو فکر بشر
اٹھا جو یقیں ہبلِ .ملے لات ملے

آئے ہوئے لب پہ فقط تولے گا
موتی نہ کبھی مثل خذف رولے گا
لازم ہے کہ دل میں ہو آئینے کی مثل
آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا

شمشیر سے امید نوازش کیسی
بدبخت سے توفیق سفارش کیسی
شاعر ہے تو کر .ژرف نگاہی پیدا
جب ابر نہیں ہوگا تو بارش کیسی

شاعر ہے تو دل کر لے نگینوں کی طرح
بازارِ وفا میں رہ تو ہیروں کی طرح
دل میں ہو اگر حبِ الٰہی کا جمال
اشعار نکلتے ہیں حدیثوں کی طرح

دلداری انساں کا بڑا ماہر ہے
ہر چوٹ بھلا دینے پہ تو قادر ہے
ایسا ہو تری راہ میں رفتار کا ڈھنگ
جو دور سے دیکھے تو کہے شاعر ہے

مغموم طبیعت کو روانی دے دو
پیری جو طلب کرے جوانی دے دو
جب کھیت کی آغوش ہو سبزے سے تہی
قبضے میں نہیں ہوا تو پانی دے دو

لفظ بے ترتیب بد روئی پہ شرمائے ہوئے
حسن موزوں دیکھتے رہتے ہیں للچائے ہوئے
بحر سے باہر کبھی مصرع نہ لے انگڑائیاں
بزم میں دیکھا کسی کو پاؤں پھیلائے ہوئے

یادوں کا ہر اک نقش سجا کر دیکھو
آئینہ ایام اٹھا کر دیکھو
ہوجائے گی انساں کی حقیقت معلوم
بچپن کو بڑھاپے سے ملا کر دیکھو

دل والا خاموش نہیں رہ سکتا ہے
صبر نہیں تو رنج نہیں سہہ سکتا ہے
آنکھیں تو کرتی ہیں اس کی عیب تلاش
حاسد اچھا شعر نہیں کہہ سکتا ہے

درد کی ٹیسوں نے دل کو کر لیا آماجگاہ
دل تو ٹوٹا تھا مرا پہلے ہی والد کے بغیر
حسرتِ نظارگی کچھ مضمحل سی ہوگئی
اٹھ گیا لطف سخن گوئی بھی عابدؔ کے بغیر

حبیبؔ اب نہ رہا کوئی رہبری کے لئے
نہیں ہیں نجمؔ تو کیا لطف ہے سلام کا اب
بھٹک رہا ہوں اندھیرے میں روشنی کے لئے
نہ جوشؔ ہیں نہ رضاؔ کیا مزا کلام کا اب

نہ گل باقی نہ بلبل ہے نہ سوز و ساقی باقی ہے
فضاؤں میں مگر ڈوبی ہوئی آواز باقی ہے
قفس کی تیلیوں پر خون کی چھینٹیں بتاتی ہیں
شکستہ بازوؤں میں ہمتِ پرواز باقی ہے

لہو سے سارے زمانے کو لالہ زار کریں
حسینؑ آئیں تو اسلام استوار کریں
تھپیڑے کھائے گی کشتی تو کون روکے گا
نبیؐ سے کہہ دو نواسے کا انتظار کریں

اول کے محمدؐ کو نبوت دے دی
اوسط کے محمدؑ کو امامت دے دی
آخر کے محمدؑ کو خدا کیا دیتا
کچھ دن کو سہی اپنی ہی غیبت دے دی

خود کوئی نہ گل، اور نہ کلی بنتا ہے
اللہ بنائے تو ولی بنتا ہے
طاعت ہو شجاعت ہو یقیں ہو دل ہو
یہ وصف ہوں یکجا تو علیؑ بنتا ہے

مذہبِ عشق

(کلیاتِ صابر ظفر)

(ابتدائی دس مجموعہ ہائے غزل)

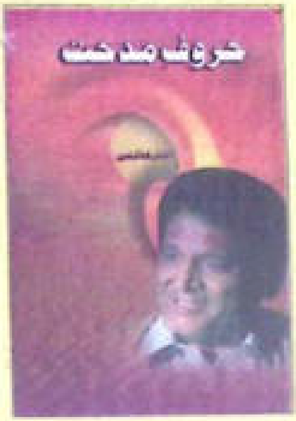
۱۔	ابتداء		۱۹۷۴ء
۲۔	دُھواں اور پھول		۱۹۸۵ء
۳۔	دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے		۱۹۹۰ء
۴۔	دکھوں کی چادر	فروری	۱۹۹۴ء
۵۔	پاتال	جنوری	۱۹۹۶ء
۶۔	بارہ دری میں شام	جون	۱۹۹۶ء
۷۔	اک تری یاد رہ گئی باقی	جنوری	۱۹۹۸ء
۸۔	عشق میں روگ ہزار	اگست	۱۹۹۸ء
۹۔	بے آہٹ چلی آتی ہے موت		۱۹۹۹ء
۱۰۔	چین اک پل نہیں	جولائی	۲۰۰۰ء

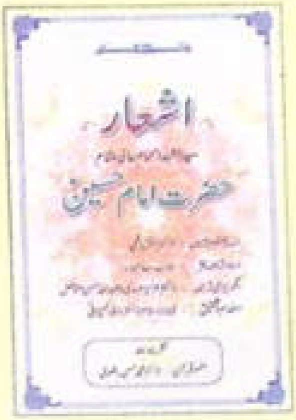
صفحات : 800 قیمت : =/800 روپے

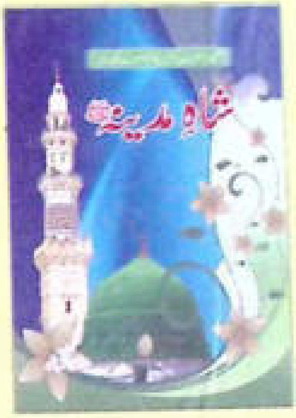
رنگِ ادب

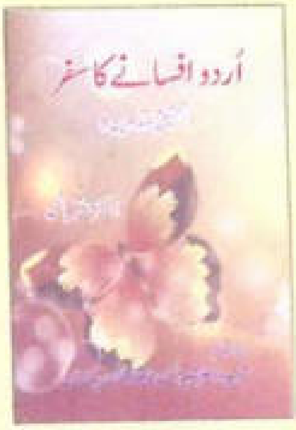
رابطہ...... 0345-2610434

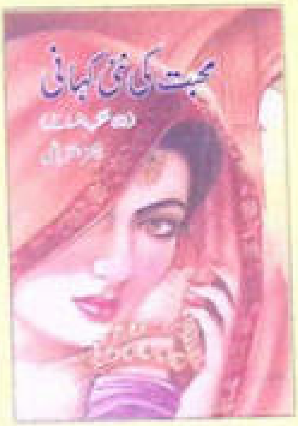
5-کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

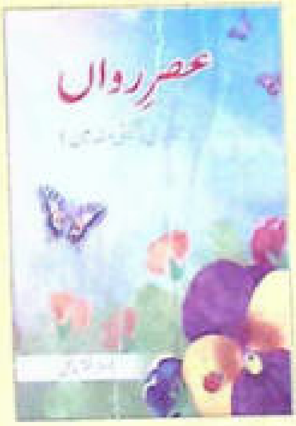

حروفِ مدحت


اشعار
حضرت امام حسین

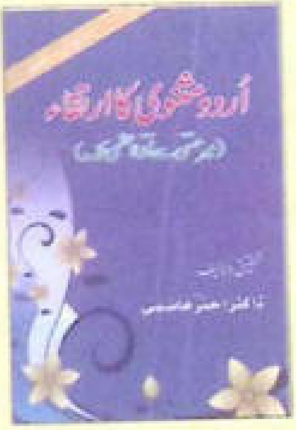

شاہِ مدینہ

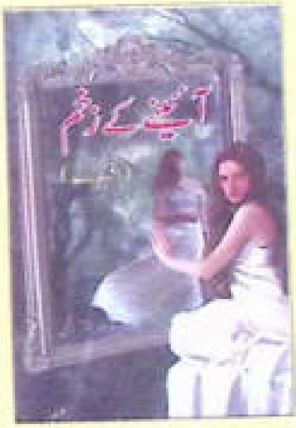

اردو افسانے کا سفر

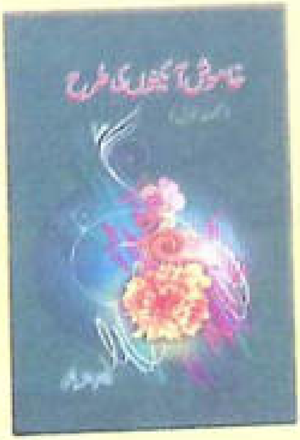

محبت کی نئی کہانی


عصرِ رواں


پراسرار دنیا


اردو شعری کا ارتقاء


آئینے کے زخم


خاموش آنکھوں کی طرح

